سالنامہ ۱۹۴۹ء
ادب لطیف

اردو کا معیاری ادب

مکتبۂ اردو کی مطبوعات اردو ادب کے ہر دور میں ارتقا کے نئے نئے تجربے پیش کرتی ہیں اور عوام کی ذہنی تربیت کیلئے ایک متوازن لائحۂ عمل کے تحت نئے نئے رجحانات کی پرخلوص ترجمانی کرتی رہی ہیں۔

مکتبۂ اردو ملک کا واحد اشاعتی ادارہ ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی ترقی پسند خیالات کی نشر و اشاعت کیلئے وقف کر رکھی ہے۔ اور اسے ملک کے سلجھے ہوئے فنکاروں کا پورا پورا تعاون حاصل ہے۔

——— یہ دھندلا سا خاکہ ہمارے اشاعتی ارتقا کی ایک واضح دلیل ہے ———

تاریخ

کتاب	مصنف	قیمت
عربوں کی قومی تحریک	مسعود علی	-/۸/-
انقلاب فرانس	غلام باری	-/۸/-
تاریخ کیا ہے	"	-/۸/-
تاریخ کا مطالعہ	"	زیر طبع
تاریخ یونان	(جے - بی - بیوری)	-/۸/-
توزک بابری	(ظہیرالدین بابر)	-/۸/-
انقلاب کی تاریخ	(گوپال متل)	-/۸/-
اسلامی تاریخ کا مطالعہ	(ڈاکٹر عنایت اللہ)	زیر طبع
سلطنت روما	(جے - بی بیوری)	-/۸/-

سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
گورکی کی ڈائری	(حسن عباس)	-/۸/-
کال مارکس	(غلام باری)	۱/۴/-
استالین	(وارشلوف)	-/۸/-
عصمت انونو	(ثوریا اندریمان)	/-۸/-
محمد عربی	(غلام باری)	-/۸/-
رضا شاہ پہلوی	(اشرف عطا)	-/۸/-
ترا تسکی	(نریندر ناتھ سینگھ)	-/۸/-
ہمارا اینن	(مائل ملیح آبادی)	/-۸-/
لینن بحثیت ایک انسان	(کلارا زٹکن)	-/۸/-
سیرت امام ابن تیمیہ	(غلام جیلانی برق)	۲/۴/-
ہندوستان کے لیڈر	(یوسف مہر علی)	-/۸/-
سبھاش بوس	(گوپال متل)	-/۸/-
گاندھی	"	-/۸/-
جواہر لال نہرو	"	-/۸/-
ابوالکلام آزاد	(عبداللہ بٹ)	-/۸/-
تانیا	(پی، ایڈوف)	-/۸/-
ٹالسٹائی	(جیرلڈ ابرھیم)	-/۸/-
نپولین	(ایچ - اے - ایل فشر)	-/۰/-

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
منٹو کے افسانے	(سعادت حسن منٹو)	۴/-/-
رنگ و بو	(فیاض محمود)	
باسی پھول	(علی عباس حسینی)	۲/۷/-
رفیق تنہائی	"	۳/-/-
میلہ گھومنی	"	۳/-/-

کتاب	مصنف	قیمت
طلسم خیال	(کرشن چندر)	۱/۱۲/-
ٹوٹے ہوئے تارے	"	۱/۱۲/-
زندگی کے موڑ پر	"	۲/-/-
ان داتا	"	۲/۸/-
گرہن	(راجندر سنگھ بیدی)	۱/۸/-
دانہ و دام	"	۲/-/-
کونپل	(اپندر ناتھ اشک)	۱/۱۲/-
چٹان	"	۱/۱۲/-
صحرا نورد کے خطوط	(میرزا ادیب)	۴/-/-
صحرا نورد کے رومان	"	۳/-/-
عورتوں کے افسانے	(کوثر چاند پوری)	۲/۸/-
دنیا کی حور	"	۱/۱۲/-
لق لق کے افسانے	(حاجی لق لق)	۱/۸/-
پرواز لقلق	" "	۱//۸-
سرکش روحیں	(خلیل جبران)	۱/۴/-
پھول اور کانٹے	(گوپال متل)	-/۸/-
کلیاں اور کانٹے	(اختر اورینوی)	۱/۱۲/-
منظر و پس منظر	"	۲/۱۲/-
بگولے	(احمد ندیم قاسمی)	۳/-/-
طلوع و غروب	"	۱/۱۲/-
تین پیسے کی چھوکری	(عبدالغفار)	۱/۸/-
شبستان الم	(زبیدہ سلطانہ)	۲/۸/-
الاؤ	(سہیل عظیم آبادی)	۱/۸/-
ایک لڑکی	(خواجہ احمد عباس)	۱/۸/-
زندہ چین	(تمدائی)	۲/-/-
[illegible]	(اختر انصاری)	۱/۱۲/-
کرنیں	(شفیق الرحمن)	۲/-/-
ان کہی	(ممتاز مفتی)	۲/۸/-
گھما گھمی	"	
چپ	"	
نیا رفیق	(ہنسراج رہبر)	۲/۱۲/-
بردۂ سیاہ	(ڈاکٹر نصیرالدین)	۳/-/-
چاند کا گناہ	(مہدی علی خان)	۲/-/-
جگا	(بلونت سنگھ)	۲/۱۲/-
بھنور	(شیر محمد اختر)	۱/۴/-

گیت

افسانے

ڈرامے

انشائیہ

اشتہارات

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام چودھری برکت علی پرنٹر و پبلشر چھپ کر مکتبہ اردو سے شائع ہوا۔

ادارہ

حرفِ اوّل

لیجئے ادبِ لطیف کا سالنامہ حاضرِ خدمت ہے! یہ اپریل اور مئی کی مشترکہ اشاعت ہے اور حسبِ دستور مئی میں آپ کے سامنے آ رہا ہے! ہم جانتے ہیں آپ اس اشاعتِ خاص کا بڑی بیقراری سے انتظار کرتے رہے ہیں اور آپ نے اس کے بارے میں بڑی خوشگوار امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سالنامے کی ترتیب و تدوین اور اس کا ادبی معیار آپ کی توقعات سے ضرور ہم آہنگ ہوگا!

ادبِ لطیف نے ہمیشہ عوامی تحریکات کے ساتھ ساتھ قدم اٹھایا ہے۔ اور اپنے ہر دور میں ترقی پسندانہ رجحانات کو سینے سے لگائے رکھا ہے۔ صداقت شعاری اور ترقی پسندانہ اندازِ نکر — ادبِ لطیف کے لئے عزیز ترین سرمایۂ حیات ہے۔ اور ادبِ لطیف کو موجودہ اشاعت کا دامن بھی اس سرمائے سے محروم نہیں ہے!

ادبِ لطیف ایک آئینہ ہے جس میں عوام کے صحت مند افکار منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ اور ادارہ ادبِ لطیف کو یقینِ کامل ہے کہ وہ جس راہ پر گامزن ہے کبھی اس سے الگ نہیں ہوگا۔

موجودہ سالنامہ ایک تاریخی دور میں شایع ہو رہا ہے — ایک ایسے تاریخی دور میں، جس میں ایک طرف تو فرسودہ نظام اپنے داخلی تضاد کی پنجہ آزمائیوں سے شکست کھا کر وقت کے بازوؤں میں دم توڑ رہا ہے اور دوسری طرف ایک صحت مند اور تابناک نظام انسان دوست قوتوں کا کارواں جلو میں لیئے شاہراہِ حیات پر قدم رکھ رہا ہے!

اس سے بڑھ کر اور تاریخی دور کیا ہوگا۔

آج ہم بڑی مسرت کے ساتھ نئے نظام کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں مگر ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جب ایک نظام تاریخی طاقتوں کے پے در پے حملوں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے تو ایک دم رخصت نہیں ہو جاتا بلکہ رخصت ہوتے ہوتے کافی جد و جہد کرتا ہے۔ اور اس جد و جہد میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اپنے عہدِ آخر میں یہ نظام ہر اس طاقت کا سہارا ڈھونڈتا ہے جو اس کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوتی ہے یا وابستہ ہو سکتی ہے اور اپنی بقا کے لئے ہر اس طاقت کے قلعے میں جا گھستا ہے جو بنیادی طور پر اس سے مختلف نہیں ہوتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور عوامی دور نہیں ہے مگر اس حقیقت سے بھی کس کی بصیرت انکار کر سکتی ہے کہ عوامی دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور مشرق و مغرب میں عوامی طاقتیں طوفانی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ آج کل کا انقلابی شعور تاریخ کے دھارے میں بہ کر کرۂ ارضی کے تمام معمورات میں پھیل چکا ہے۔ اور سامراج اپنی تمام بکھری ہوئی قوتوں کو ایک مرکز پر لا کر انتہائی تیزی اور تندی کے عالم میں اس عوامی طاقت کا مقابلہ کر رہا ہے!

ظاہر ہے سامراج اجتماعی طور پر شکست کھا چکا ہے۔ اور آج نہیں تو کل اس بوڑھے نظام کو نئے نظام کے لئے جگہ خالی کرنا ہی پڑے گی مگر اس وقت زندہ رہنے کے لئے اس سے جو کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے کر رہا ہے! "معاہدہ اوقیانوس" نئے نظام کے خلاف پرانے نظام کی آخری اور ہمہ گیر جد و جہد ہے شہنشاہیت کئی ماہ سے پسِ پردہ ایک گہری سازش میں مصروف تھی۔ فروری کے اواخر میں اس سازش کا انکشاف ہوا اور اپریل کے پہلے ہفتے میں یورپ کے مختلف سامراجی عناصر نے اس عظیم الشان سازش پر مہرِ توثیق ثبت کر دی۔

ہٹلر، میسولینی اور جنرل ٹوجو نے بھی فسطائی طاقتوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے آپس میں معاہدہ کر لیا تھا اور اس کا نام تھا "اینٹی کمنٹرن پیکٹ" ANTI COMMINTERN PACT ہر وہ شخص جس کی انگلیاں سیاسیات کی نبض شناس ہیں۔ بہ بانگِ دہل اس امر کا اعلان کر سکتا ہے کہ جو محرکات اینٹی کمنٹرن پیکٹ کے پس پردہ کار فرما تھے وہی محرکات اس معاہدے کی تہ میں بھی سرگرم کار ہیں۔

فسطائیت اور جنگ جویانہ ذہنیت ہر زمانے میں نئے نئے روپ بدل کر دنیا کو آگ اور خون کی طرف دھکیلتی رہی ہے۔ اور یہ معاہدہ بھی اس قابلِ نفرت ذہنیت کا پرتو ہے۔!

یہ پرانے شہنشاہی، سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کی آخری مگر سخت خوفناک جدوجہد ہے ۔۔۔ شہنشاہیت طہران، بوڈاپسٹ، ٹرسٹم اور دکرمیا میں جس صلح جو پالیسی کا اظہار کرتی رہی ہے۔ یہ جدوجہد اس پالیسی پر خطِ تنسیخ کھینچ رہی ہے۔ یہ جدوجہد انجمنِ اقوام متحدہ کی تگ و دو کے خلاف بھی اعلانِ جنگ ہے۔ شہنشاہیت کو اپنے معاہدوں کا پاس نہیں ہے۔ صلح پسند اداروں کے تعمیری پروگرام کا لحاظ نہیں ہے۔ اس کے سامنے تو صرف اپنا مفاد ہے ۔۔۔ اپنے سرمایہ داروں کا مفاد ہے ۔۔۔ اور اپنی مصنوعات کا مفاد ہے!

یہ خوفناک جدوجہد پرانے نظام کی آخری مگر بہت خوفناک جدوجہد ہے۔ اور آج ہر وہ شخص جس کی نگاہوں میں انسانی قدروں کا احترام موجود ہے پوری شدومد کے ساتھ "معاہدۂ اوقیانوس" کے خلاف احتجاج کر رہا ہے۔ امریکہ، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے اسمبلی ہالوں میں اس معاہدے کے عملی امکانات پر غور کیا جا رہا ہے اور امریکہ، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے بازاروں میں عوام گروہ در گروہ جنگ کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں!

"ہم جنگ نہیں چاہتے ۔۔۔ ہم امن کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔ ہمیں کسی سے دشمنی نہیں ہے"

یہ دنیا کے تمام عوام کا مطالبہ ہے۔ دنیا کے سب عوام کو آپس میں محبت ہے۔ آخر ایک ملک کے عوام دوسرے ملک کے دشمن کیوں ہوں۔ دشمنی کا زہر وہ لوگ پھیلاتے ہیں جن کے کارخانے رات دن اسلحۂ جنگ تیار کرتے رہتے ہیں۔ جو دوسرے ملکوں کے بازاروں میں اپنی مصنوعات بیچنا چاہتے ہیں اور جن کی ہوسِ زرپرستی ہر لمحہ، ہر گھڑی بڑھتی رہتی ہے۔

تو یہ ہے پرانے نظام کی تگ و دو اور نئے نظام کے علمبردار ادیبوں نے ۲۸ اگست ۱۹۴۸ء کو پولینڈ کے شہر "روکلا" میں امن و تہذیب کے تحفظ کی خاطر جو کانفرنس کی تھی وہ عوامی مطالبے کی صدائے بازگشت ہے۔

ادیب انسانیت کا سچا علمبردار ہوتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سامراجی ارادوں کو بھانپتا اور خاموش رہتا۔ چنانچہ پولینڈ کے شہر روکلا میں دنیا کے پنتالیس ملکوں کے پانچسو فنکار جمع ہو گئے اور انہوں نے ساری دنیا کو خطرے سے خبردار کر دیا ہے جو تیسری جنگ کی صورت میں آ رہا ہے اور جو "معاہدہ اوقیانوس" کی تہ میں چھپا ہوا ہے۔

امن پسند ادیبوں نے جو تاریخی اعلان شائع کیا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں!

"ہم تہذیب و تمدن، سائنس اور فنونِ لطیفہ کے معمار جو پنتالیس ملکوں سے آ کر پولینڈ شہر "روکلا" میں جمع ہوئے ہیں ساری دنیا کے عالموں اور دانشوروں سے مخاطب ہیں۔ ہم آپ کو وہ ملک خطرہ یاد دلانا چاہتے ہیں جس نے ساری انسانیت اور اسکی تہذیب کو گھیر لیا تھا۔ ہم نے فاشسٹ بربریت، تاریخی اور تہذیبی قدروں کی پامالی، اہلِ فکر کی مصیبت اور ہلاکت اور روحانی قدروں کی وہ بے حرمتی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ جس سے ضمیر، شعور، اور ترقی کے سارے مفہوم کی تباہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

"لیکن آج ساری دنیا کے عوام کی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے خلاف چند خود غرض اور مطلب پرست عناصر دنیا کی تمام قوموں کی روحانی دولت کو لوٹنے کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نسلی برتری اور رجعت پرستی کے نظریے فاشیت سے ورثے میں پائے ہیں۔

انھوں نے فاشسٹوں کا یہ رجحان اپنا لیا ہے۔ کہ ہر مسئلے کا حل ہتھیاروں کے بل پر کرنا چاہئیں

"ہم ساری دنیا کے مفکروں، عالموں اور دانشوروں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ پر اپنی قوم، انسانیت اور تاریخ کی طرف سے بڑی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہم اپنی آواز بلند کر رہے ہیں تاکہ دنیا میں امن قائم ہو۔ ہر قوم کو آزادی کے ساتھ تہذیبی ترقی کا موقعہ ملے۔ ہر قوم مکمل طور پر آزاد ہو، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرے۔ ہم ہر ملک کے ذہنی محنت کشوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان تجویزوں پر غور کریں

. . . . . ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہر ملک میں امن کی حفاظت کے لئے قومی کمیٹیاں بنائی جائیں اور ہم اپیل کرتے ہیں کہ تحفظِ امن کے لئے ہر ملک کے اہلِ علم دانش دوسرے ملکوں کے ادیبوں اور دانشوروں سے تعاون کریں اور اسطرح ایک بین الاقوامی رشتہ قائم کریں۔"

شہنشاہیت کی سازش کے اندھیرے میں یہ اعلان ایک روشنی ہے۔ اور اسے دنیا کے ہر امن پسند شہری کی تائید حاصل ہے!

پنجاب ایڈوائزری بورڈ پنجاب ایڈوائزری بورڈ کے نام سے حکومتِ پنجاب کی طرف سے ایک تعلیمی ادارہ قائم ہے جس کا مقصد علم وادب کی قدر افزائی ہے۔ یہ ادارہ بزعمِ خویش ہر سال اردو کی اُن کتابوں کو انعام سے نوازتا ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد ہوں اور جن کا علمی و ادبی پایہ بہت بلند ہو۔ اگر ہم ان کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالیں جو التزام سے فیض یاب ہو چکی ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے اور ہم بورڈ کی غلط بخشیوں پر حیران رہ جاتے ہیں۔

بورڈ کا دامن اجارہ داری اور جانب داری کے داغ سے سخت بدنما ہے اور اس کی ایک ——— اور غالباً سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ قیامِ پاکستان سے پیشتر اس ادارے پر اُن ذہنیتوں کا قبضہ تھا جن کے پیشِ نظر صرف ذاتی تعلقات ہوتے تھے۔ اب غلامی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے پنجاب ایڈوائزری بورڈ کا فرض ہے کہ وہ اُن کتابوں کو اچھالنے کی کوشش کرے جن کی اشاعت نے اُردو ادب پر واقعی خوشگوار اثر ڈالا ہو۔

اگر ادارہ بدلے ہوئے حالات میں اپنی ذہنیت نہ بدل سکا تو ہم یہی بات سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ اُردو ادب کی ترقی وفروغ کے سلسلے میں اس ادارے سے کسی قسم کی توقع قائم رکھنی فضول ہے!

سروجنی نائیڈو:- مارچ کے پہلے ہفتے میں دنیائے ادب کو ایک ایسے المیے سے دوچار ہونا پڑا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا صبر آزما ہے۔ مسز سروجنی دیوی کی وفات ایک لیڈر اور ایک گورنر ہی کی موت نہیں بلکہ ایک عظیم فنکار، ایک جلیل القدر شاعرہ اور انسانیت کی ایک نہایت مخلص دوست کی وفات بھی ہے۔

سروجنی دیوی کی گوناگوں خصوصیات پر نظر ڈالی جائے تو ہمارے دلوں میں یہ المناک احساس پیدا ہوتا ہے کہ ادب، اور انسانیت دوستی کی صفوں میں جو خلا ان کے انتقال پر پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو گا۔

وہ بہت بڑی شاعرہ تھیں، بہت بڑی ادیبہ تھیں، بہت بڑی راہنما تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ہندو مسلم اتحاد کا چلتا پھرتا پرچم تھیں" آج یہ پرچم موت کے اندھیرے میں غائب ہو گیا ہے ——— مگر نہیں یہ پرچم کل تک ہندوستان کے ایک خاص صوبے میں لہرا رہا تھا ——— عوام کی نگاہوں کے سامنے لہرا رہا تھا مگر آج یہ پرچم عوام کے دلوں میں لہرا رہا ہے اور ہمیشہ لہراتا رہے گا!

اُردو اکیڈیمی:- اس وقت کہ ہم برطانوی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اُتار چکے ہیں اور نئی تمناؤں اور ولولوں کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے ہیں ہمارا فرض ہے کہ اپنے ادب کی طرف توجہ کریں اور اُس کی ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں انہیں جلد سے جلد دُور کر دیں۔ ہر قوم کا ادب، اُس قوم کے ولولوں اور اُمنگوں کی جولانگاہ ہوتا ہے۔ اور ہر ترقی یافتہ ملک کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ثقافت، تہذیب اور عمرانی تجربات کو اپنے ادب کے دامن میں محفوظ کر لے۔ اگر کسی ملک کا ادب کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہے تو اس کا صاف مطلب

یہ ہے کہ اُس قوم کو اپنی تہذیب اور ثقافت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے حالانکہ زندہ قوم کا تقاضائے حیات ہے۔ ہمارے ملک میں لکھنے والوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اتنی شرمناک حالت شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کسمپرسی کی ذمے دار اجنبی حکومت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجنبی تسلّط مفتوح قوم کے کلچر کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ مگر یہ دور اب ختم ہو چکا ہے۔ اب تو ہمارے آزاد ملک کے اربابِ بست و کشاد کا فرض ہے کہ وہ کلچر کے تحفظ میں ہر امکانی کوشش سے کام لیں اور ہر اُس چیز کی طرف متوجہ ہوں جو کلچر کے ساتھ وابستہ ہے! دنیا کے ہر آزاد ملک میں (خاص طور پر اشتمالی روس میں) وہاں کی حکومت ادیبوں کی اعانت اپنا فریضۂ حیات سمجھتی ہے چنانچہ یورپ میں بے شمار ایسے کلب موجود ہیں جہاں مصنفوں کو حکومتیں امکانی مراعات سے نوازتی رہتی ہیں۔

ہمارے یہاں اس قسم کی اکیڈیمی کا کوئی واضح اور غیر مبہم تصوّر موجود نہیں تھا۔ اب ملک کے مشہور نقّاد اور اُردو کے جلیل القدر انشا پرداز مولانا صلاح الدین احمد نے حکومتِ مغربی پنجاب کے سامنے ایک سٹیٹ اکیڈیمی کی ایک مکمّل سکیم پیش کر دی ہے!

یہ اکیڈیمی "مصنّفوں کی بستی" ہو گی۔ اور اس کے مختلف شعبے یہ ہوں گے!

۱۔ اکیڈیمی کا مرکز! اس میں ڈائرکٹر کے دفاتر، کتب خانہ، کمیٹی کے لئے کمرے ہوں گے

۲۔ مصنّفوں کا کلب اور مہمان خانہ

۳۔ مجلس عاملہ اور مصنّفوں کے رہائشی مکانات

۴۔ مطبع اور مکتبہ

۵۔ گودام اور ریسٹورنٹ

۶۔ بچوں کا اسکول

۷۔ کلرکوں اور سٹاف کے لئے رہائش گاہیں

۸۔ تالاب اور میدان

۹۔ پانی اور بجلی مہیا کرنے کے مرکز

۱۰۔ ڈاکخانہ اور دوائی خانہ

اس اکیڈیمی کے چند ایک فرائض!

درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف، لسانی اور ادبی سرمائے کی جانچ پڑتال اور اُس کی اشاعت، ملّی دائرۃ المعارف کی تکمیل، نوبل انعام کی قسم کے کسی انعام کا تعیّن، اور بیرونی ممالک سے تعلقات بڑھانے کے لئے قومی سرگرمیوں کی نشر و اشاعت۔

فی الحال اکیڈیمی کے قیام کے لئے ایک لاکھ اسّی ہزار روپے کی ضرورت ہے! ہمیں کامل امید ہے حکومت مغربی پنجاب یا مرکزی حکومت اِس مفید سکیم کو ضرور عملی صورت میں لانے کی پُر خلوص کوشش کرے گی۔ اگر حکومت اپنے فرض سے پہلو تہی کرے تو مولانا کو بددل نہ ہونا چاہیئے۔ وہ خود اس کام کو شروع کریں ملک کے تمام ادب دوست ان کی حتی الامکان مدد کریں گے! +

مکتبۂ اُردو کا اشاعتی پروگرام:۔ . . . . "معاشیات کا مطالعہ" مصنّفہ باری چھپ چکی ہے ۔ ۱۹۴۸ء کا بہترین ادب زیرِ طبع ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" طبع ثانی ابھی شائع ہو رہی ہے۔ چند دن تک مکمّل ہو جائے گی "نئے زاویے" جلد اوّل مارکیٹ میں آ چکی ہے۔

کونٹ لیو ٹالسٹائی کی تصنیف "جنگ اور امن" دنیا کے اُن ناولوں میں شمار ہوتی ہے جن کی شہرت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے "محمود جالندھری" نے اِس شہرۂ آفاق اور زندہ جاوید ناول کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور آج کل یہ کتاب کتابت کی منزل سے گزر رہی ہے۔

اختر الایمان کی نظموں کا مجموعہ "تاریک سیّارہ" بھی زیرِ طبع ہے۔

دُنیا کے پانچ سو دانشوروں کا خطاب

(۲۸ اگست سنہ ۱۹۴۸ء کو پولینڈ کے ایک شہر روکلا میں ۔ ۔ ۔ ۔ امن اور تہذیب کے تحفظ کے لئے ساری دُنیا کے ادیبوں اور دانشوروں نے ایک اعلان شائع کیا۔ جسے ہم اُردو کے ادیبوں کے مطالعہ اور غور و فکر کے لئے ذیل میں پیش کر رہے ہیں)

ہم تہذیب و تمدن، سائنس اور فنونِ لطیفہ کے معمار جو ۴۵ ملکوں سے آ کر پولینڈ کے شہر روکلا میں جمع ہوئے ہیں۔ ساری دُنیا کے عالموں اور دانشوروں سے مخاطب ہیں۔ ہم آپ کو وہ مہلک خطرہ یاد دلانا چاہتے ہیں جس نے ساری انسانیت اور اسکی تہذیب کو گھیر لیا تھا ہم نے فاشستہ بربریت، تاریخی اور تہذیبی قدروں کی پامالی اہلِ فکر کی مصیبت اور ہلاکت اور روحانی قدروں کی وہ بیحرمتی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس سے ضمیر، شعور اور ترقی کے سارے مفہوم کی تباہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

عدیم المثال قربانیوں، مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد دُنیا کی جمہوری طاقتوں نے سوویٹ روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے عوام نے اور فاشستوں کے مقبوضہ ممالک کی عوامی مدافعت اور بغاوت نے اپنی انتھک جد و جہد سے انسانی تہذیب کی حفاظت کی۔

لیکن آج ساری دُنیا کے عوام کی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کے برعکس چند خود غرض اور مطلب پرست عناصر دنیا کی تمام قوموں کی روحانی دولت کو لُوٹنے کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نسلی برتری اور رجعت پسندی کے نظریے فاشزم سے ورثے میں پائے ہیں اُنہوں نے فاشستوں کا یہ رجحان بھی اپنا لیا ہے کہ ہر مسئلے کا حل ہتھیاروں کے بل پر کرنا چاہیئے۔

انسانیت کے خزانے کو مالا مال کرنے والی یورپی تہذیب آج پامال اور مسخ ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہے اسپین، یونان اور جنوبی امریکہ کی طرح کئی ملکوں میں رجعت پسند قوتیں نہ صرف فاشزم کو برقرار رکھنے میں مدد دے رہی ہیں بلکہ اس لعنت کے لئے نئی زمین بھی ہموار کر رہی ہیں۔

آج عقل اور ضمیر کے تمام اصولوں کے خلاف انسانوں پر ظلم توڑے جا رہے ہیں خصوصاً ان قوموں پر مظالم کا اضافہ ہو رہا ہے جنہیں سفاک حکمران سیاہ فام کہتے ہیں۔ جن لوگوں نے فاشزم کے طور طریقے اختیار کئے ہیں وہ اپنے ملکوں میں نسلی امتیازات برت رہے ہیں اور سائنس اور فنونِ لطیفہ کے ترقی پسند معماروں کو ایذائیں پہنچا رہے ہیں۔ سائنس کے وہ انکشافات جو انسانیت کی بہبود کیلئے استعمال کئے جا سکتے ہیں آج موت اور ہلاکت کے آلات کی صناعی کیلئے وقف ہیں اور اس طرح سائنس کے اعلیٰ مقاصد کو بدنام کیا جا رہا ہے۔

ان لوگوں کی حکومت میں انسانی مہارت کو زبان اور فن کی تعلیم دینے اور عوامی اتحاد پیدا کرنے کے لئے نہیں استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ اسے انسان کو انسان سے نفرت دلانے اور جنگ اور خونریزی کے گھناؤنے مقصد کیلئے صرف کیا جا رہا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہر قوم کو آزادانہ ترقی کرنے اور ترقی پذیر تہذیب سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملنا چاہیئے انسانیت کا مستقبل اسی سے وابستہ ہے اس لئے ہم اس آزادی پہ پابندیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور عالمگیر انسانی تمدن کے مفاد کے پیشِ نظر ہم اس پر زور دیتے ہیں کہ مختلف تہذیبوں اور قوموں کو ایک دوسرے کی حقیقت سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کا احترام کرنا چاہیئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ جدید سائنس نے جو زبردست قوتیں انسان کو بخشی ہیں وہ یا تو انسانیت کی بہبود کے لئے استعمال کی جا سکتی ہیں یا اسکی تباہی کیلئے اور اسی لئے سائنس کو تباہی اور بربادی کیلئے استعمال کرنیکی ہر کوشش کیخلاف یہ کانگرس احتجاج کرتی ہے اور عوام سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ علم و دانش کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کیلئے انتھک کوشش کریں اور سائنس کی قوت کو اس مقصد کیلئے استعمال کیا جائے کہ انسان جلد از جلد افلاس، جہالت، امراض اور احتیاج سے نجات پائے ان لوگوں کو نقل و حرکت کی پوری آزادی ملے جو امن اور ترقی کے بلند مقاصد کی اشاعت کیلئے کوشاں ہیں سائنسی تحقیقات اور تہذیبی کارناموں کو عام کرنے والی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ دُنیا کی قومیں جنگ کی خواہشمند نہیں ہیں اور ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنے امن و تہذیب کو نئی فاشستی قوتوں کی ریشہ دوانیوں سے بچا سکیں

ہم ساری دُنیا کے مفکروں، عالموں اور دانشوروں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ پر اپنی قوم انسانیت اور تاریخ کی طرف سے بڑی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ہم اپنی آواز بلند کر رہے ہیں تاکہ دُنیا میں امن قائم ہو ہر قوم کو آزادی کیساتھ تہذیبی ترقی کا موقع ملے ہر قوم مکمل طور سے آزاد ہو اور ایک دوسرے کیساتھ تعاون کرے ہم ہر ملک کے ذہنی محنت کشوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان تجویزوں پر غور کریں ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہر ملک میں امن کے تحفظ کیلئے وہاں کے ادیب اور دانشور کانفرنسیں منعقد کریں ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہر ملک میں امن کی حفاظت کیلئے قومی کمیٹیاں بنائی جائیں اور ہم اپیل کرتے ہیں کہ تحفظِ امن کیلئے ہر ملک کے اہلِ علم و دانش دوسرے ملکوں کے ادیبوں اور دانشوروں سے تعاون کریں اور اسطرح ایک بین الاقوامی رشتہ قائم کریں۔

باغ جناح کی ایک شام!

● ادارہ ادب لطیف کی دعوت پر باغ جناح کی ایک حسین شام کو مغربی پنجاب کے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کا ایک نمائیندہ اجتماع ہوا جس میں اردو کے بزرگ انشا پرداز بھی شامل ہوئے اور نوجوان فنکار بھی — یہ فوٹو گروپ اُسی اجتماع کی یادگار ہے۔

اگلی صف میں دائیں سے بائیں عبدالمجید سالک' مولانا چراغ حسن حسرت' مولانا صلاح الدین احمد' قیوم نظر' عبدالمجید بھٹی' احمد ندیم قاسمی' چوھدری برکت علی' اے حمید' حمید اختر قریشی' ابراھیم جلیس اور پچھلی صف میں دائیں سے بائیں تنویر نقوی' یوسف ظفر' احمد راھی' ایوب سرور' طفیل احمد خان' قتیل شفائی' اکرم افگار' حسن طاھر' جمیل ملک' میرزا ادیب اور شریف کنجاھی نظر آرھے ھیں۔

کچھ نئے کچھ پرانے !

پچھلی صف میں دائیں سے بائیں :— حسن طاہر، ابراہیم جلیس، قتیل شفائی
جمیل ملک، اکرم افگار
اگلی صف میں دائیں سے بائیں :— راہی، ندیم قاسمی، مولانا حسرت، بھٹی
صلاح الدین احمد، اے حمید
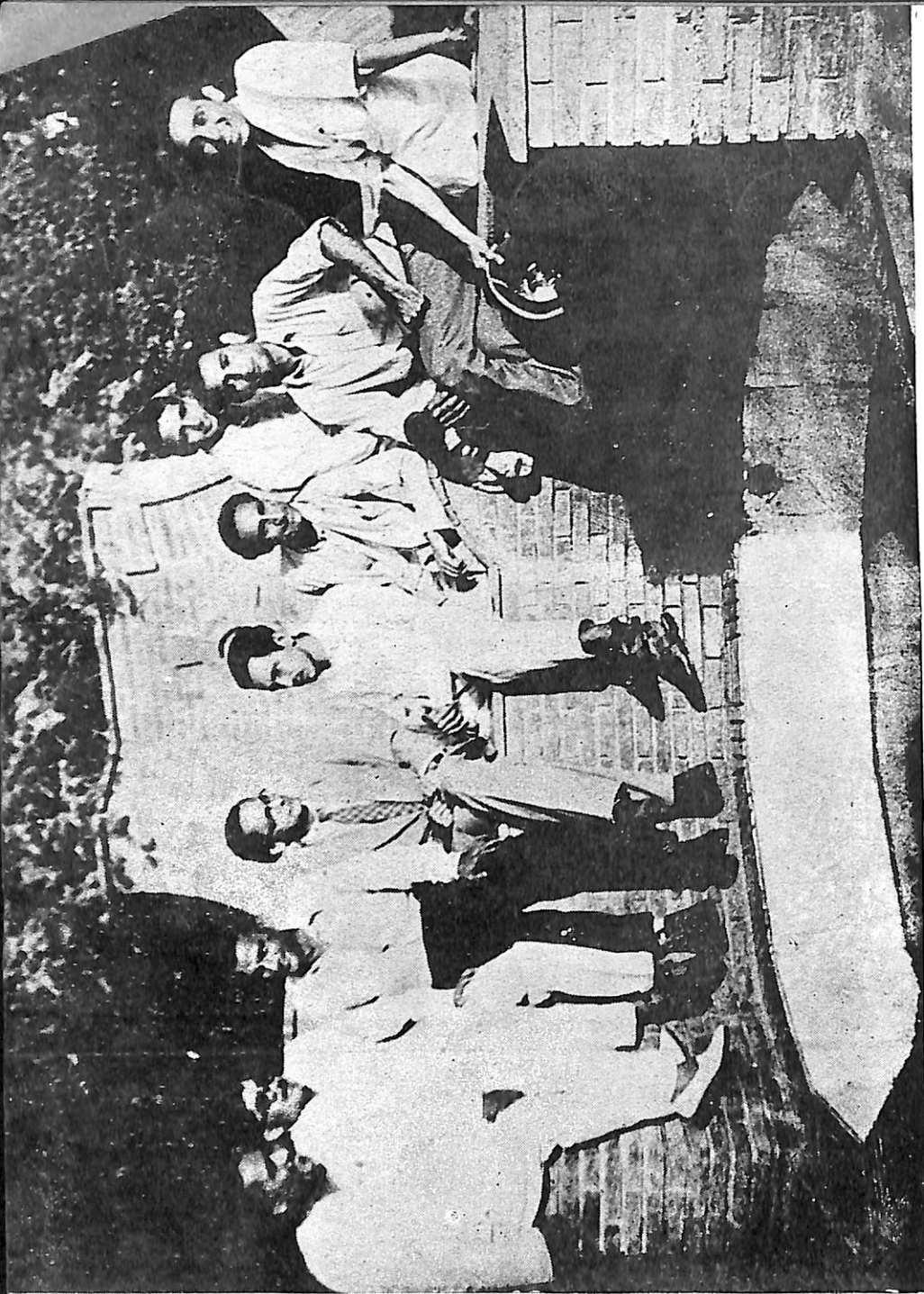
صحت مند ادب، حسین زندگی !

دائیں سے بائیں: — عبداللہ ملک، حمید اختر، شریف کنجاہی، میرزا ادیب، ایوب سرور، طفیل احمد خان، قیوم نظر، یوسف ظفر اور تنویر نقوی

● مغربی پنجاب کا ترقی پسند گروپ

پچھلی صف دائیں سے بائیں - حسن طاہر، شریف کنجاہی، عبداللہ ملک، حمید اختر، اکرم افگار، جمیل ملک

درمیانی صف دائیں سے بائیں - طفیل احمد خان، عبدالمجید بھٹی، احمد ندیم قاسمی

اگلی صف دائیں سے بائیں - اے حمید، احمد راهی، قتیل شفائی

مقالات

چراغ حسن حسرت
صلاح الدین احمد
طفیل احمدؐ
صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
باری
فکر تونسوی
کنہیالال کپور

ہمارے ساتھی

چراغ حسن حسرت: مشہور ترقی پسند روزنامہ "امروز" کے چیف ایڈیٹر، مشتاق صحافی اور قادر الکلام شاعر، اپنے تخلص کے برعکس ہنستے ہنسانیوالی باتیں لکھتے رہے ہیں، اور لکھ رہے ہیں، حسرت کا لفظ ان کے نام کا جزو ہے شخصیت کا جزو نہیں۔ اُنکی شخصیت کا جزوِ اعظم مزاح نگاری ہے۔ اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا روزنامہ ہوگا جسکے صفحات پر آپ ادب دانش کے پھول نہ بکھیر چکے ہوں اور تو اور مولانا ابو الکلام آزاد کے اخبار "الہلال" کے ادارے میں بھی منسلک رہ چکے ہیں۔ اُردو کے ادبِ عالیہ کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کر چکے ہیں۔ بہت زیادہ لکھتے ہیں۔ اور بہت زیادہ سگریٹ پیتے ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی طے نہیں ہو سکا کہ آپ لکھتے زیادہ ہیں یا سگریٹ زیادہ پیتے ہیں۔ شاید اس معاملے میں اُن کے سوانح نگار کو کافی پیچیدگی کا سامنا کرنا پڑیگا۔

صلاح الدین احمد: مشہور نقاد اور انشاپرداز۔ ادب میں "سہل سازی" کے سخت مخالف "اُردو بولو" کی نہایت مفید تحریک کے علمبردار۔ پرانے انشاپردازوں پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ تو بڑی جرأت سے کام لیتے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مگر جب جدید ادیبوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ تو کبھی کبھی جذباتی رو میں بھی بہ جاتے ہیں! آپ اُن سے گفتگو کریں۔ تو دو چیزوں سے ضرور متاثر ہوں گے۔ ایک چیز تو ہے ان کی موپساں کی مونچھوں جیسی گھنی مونچھیں اور دوسری چیز ہے اُن کے بلند بانگ قہقہے۔ بڑے زندہ دل ادیب ہیں۔ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے رہیے۔ "ذرہ بھر بوریت" محسوس نہیں کرینگے۔ ابھی ابھی آپ نے حکومتِ پنجاب کی خدمت میں ادب اور ادیبوں کی حالت سدھارنے کے لئے ایک نہایت قیمتی سکیم پیش کی ہے۔ دیکھئے اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

طفیل احمد خاں: جتنی تیزی سے باتیں کرتے ہیں قریب قریب اُتنی ہی تیزی سے لکھتے بھی ہیں۔ آپ ان سے جس موضوع پر چاہیں لکھوا سکتے ہیں۔ تاریخ کی مادی تعبیر کے نظریے سے لیکر مغربی پنجاب میں مرغیاں پالنے تک ہر موضوع کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنا سکتے ہیں۔ معاشیات خاص طور پر موضوعِ فکر ہے۔ جرأت پسند اور اصول پرست طفیل کو ابھی تک جم کر کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بے اندازہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ آجکل فری لانسر صحافی ہیں۔

غلام باری: کبھی اشتراکی ادیب باری علیگ کے نام سے مشہور تھے۔ ریڈیو کی فضاؤں میں غلام باری کہلاتے ہیں۔ اور ادب میں صرف باری۔ کمپنی کی حکومت لکھ کر برطانیہ کی سامراجی ریشہ دوانیوں کا جائزہ لے چکے ہیں۔ تاریخ اور معاشیات خاص موضوع ہیں۔ اندازِ نگارش خطیبانہ اور پر عظمت ہوتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ معاشی نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ اور معاشیات کا تاریخی نقطہ نگاہ سے۔ آپ اُن سے ملیں تو شروع شروع میں چند منٹ تک آپ کو اپنے موٹے موٹے سیاہ گاگلوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں سے گھورتے رہیں گے۔ آپ محسوس کرینگے جیسے باری صاحب بہت مغرور ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب بولنا شروع کرینگے۔ تو پھر آپ کو بولنے کی تکلیف نہیں کرنا پڑیگی۔ آجکل آپ برطانوی نشر و اشاعت کے دفتر میں کام کر رہے ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے اس دفتر کی خنک آلود اور اطمینان بخش فضا اُس باغیانہ شعلے کو نہیں بجھا سکتی جو باری کے دل کی گہرائیوں میں روشن ہے۔

فکر تونسوی: سیدھا سادہ مسکین صورت، خاموش طبع اور دبلا پتلا مرنجان مرنج نوجوان کسی محفل میں بیٹھا ہوا دیکھیں تو سب سے پہلے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص کو ادب و دب سے کیا واسطہ کسی دیہاتی سکول میں مدرس ہوگا یا کسی کاروباری ادارے کا معمولی کلرک مگر فکر تونسوی اُردو کے ان ادیبوں میں سے ہے جسکے تذکرے کے بغیر ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔ جب قلم کے نشتر سے کسی شخصیت کا اپریشن کرتا ہے تو کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑتا جو اُس کے نشتر سے محفوظ رہ سکے شخصیت کا جائزہ جس بیباکانہ انداز سے لیتا ہے۔ وہ صرف اُسی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا ہے مبہم اشارات میں ڈوبی ہوئی مگر نشتر کا ایک ایک فقرہ نہایت چٹپٹا اور دلکش۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر بالکل گمنام تھا۔ ایک گوشے میں پڑا ہوا حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر کسی کا سہارا لئے بغیر ادب کے نہایت بلند مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اور ابھی اس کی پرواز رُکی نہیں۔

کنہیا لال کپور: تقسیم سے پہلے ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر اب موگہ کے ڈی۔ اے۔ وی کالج میں وائس پرنسپل مگر قد کو دیکھئے تو مسخرا لگتا ہے۔ اور در اصل ہے بھی مسخرا لیکن نہایت خوفناک قسم کا۔ زندگی کی تلخ سے تلخ حقیقت کا بھی مسخر اُڑا دیتا ہے۔ تیز تیز چبھتے ہوئے فقروں میں ایسی بات کہہ جاتا ہے۔ کہ ہونٹوں پر تو مسکراہٹ مگر دل پر ایک چوٹ سی لگ جاتی ہے۔ بہت اچھا طنز نگار ہے۔ لوگ اس سے ڈرتے کم ہیں اور پیار زیادہ کرتے ہیں۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم: بیک وقت بہت کچھ ہیں، پروفیسر، صوفی، مؤرخ، شاعر اور ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ۔ ادبی حلقوں میں صوفی تبسم کے نام سے مشہور ہیں۔ چہرے پر عام طور پر تبسم نظر نہیں آتا۔ مگر شاعری کے خد و خال کی سلوٹوں میں تبسم کی تہیں جمی ہوتی ہیں۔ حال ہی میں پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے جھولنے کی تصنیف پر پانچسو کی رقم بطور انعام دی ہے۔

چراغ حسن حسرت

دلّی اور لکھنؤ کی زبان

اگرچہ اُردو کی نشوونما میں ہندوستان کے کئی شہروں کا حصّہ ہے۔ تاہم اس زبان کے بڑے بڑے مرکز دو ہی مانے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا دہلی ہے۔ اور دوسرا لکھنؤ۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جب کہ زبان اور محاورے کی پابندیاں آہستہ آہستہ مٹتی جا رہی ہیں۔ اور ملک کے ہر گوشے سے مستند ہے میرا فرمایا ہُوا کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ جب کبھی کسی لفظ کی صحت مطلوب ہوتی ہے تو نگاہیں بے اختیار دلّی یا لکھنؤ کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

دِلّی کو تو خیر مدّتوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد درجۂ اسناد نصیب ہُوا۔ ہاں لکھنؤ نے جس قدر جلد اردو پر حقِ شفع حاصل کر لیا وہ حیرت انگیز ہے۔ آصف الدولہ کے عہد سے غازی الدین حیدر کے زمانے تک پچیس تیس سال کی مدّت ہے۔ لیکن اس پچیس تیس سال کی مدّت میں زمانے نے یہ تماشا بھی دیکھا۔ کہ لکھنؤ یا تو شاہ جہان آباد کی شاگردی کا دم بھر رہا تھا۔ یا شاگردی اور استادی کی ساری منزلیں طے کر کے دِلّی کے حریف اور مدِّ مقابل کی حیثیت سے میدان میں کھڑا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل تک اودھ کا صدر مقام اجودھیا کا پرانا شہر تھا۔ اور لکھنؤ کی حیثیت محض ایک چھوٹے سے قصبے کی تھی۔ محمد شاہی عہد میں جب نواب سعادت خاں برہان الملک اودھ کے صوبیدار مقرر ہُوئے۔ تو انہوں نے اجودھیا سے ذرا ہٹ کے دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک نئی بستی کی بنیاد ڈالی۔ جو پہلے بنگلہ پھر فیض آباد کے نام سے مشہور ہوئی برہان الملک کے جانشین صفدر جنگ کے زمانے میں بھی یہی شہر اودھ کا صدر مقام رہا۔ البتہ صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ نے چند برس لکھنؤ میں قیام کیا۔ لیکن بکسر کی لڑائی کے بعد وہ بھی فیض آباد اُٹھ آئے۔ اور تا دمِ آخر وہیں رہے۔ اُن کے جانشین آصف الدولہ تھے۔ جنہوں نے مستقل طور پر لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ لکھنؤ کا عروج اٹھارویں صدی کے اواخر یعنی آصف الدولہ کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے۔

یہ زمانہ دِلّی کے لئے بڑا پرآشوب تھا پہلے خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔ پھر بادشاہ گر سیّدوں نے فساد مچایا۔ اُن کا زور ٹوٹا تو نادر کے ہاتھوں دِلّی پر سخت مصیبت آئی۔ پھر افغانوں۔ جاٹوں اور مرہٹوں نے سر اٹھایا۔ اور سالہا سال تک دِلّی اِن لوگوں کی باہمی زور آزمائیوں کا اکھاڑہ بنی رہی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ اردو کی نشوونما بھی اسی پر حوادث زمانے میں ہوئی۔ ایک طرف لشکر آرائیوں اور میدان داریوں کے ہنگامے گرم تھے تو دوسری جانب شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ تھیں۔ فوجوں کی یلغاروں اور صف آرائیوں میں تھوڑا سا امن کا وقت مِل جاتا تھا تو اکھڑی ہُوئی صحبتیں پھر جمتیں اور طبیعت کا سوز و گداز غزل کا قالب اختیار کر لیتا۔ لیکن جب شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار بن کے قلعے میں جا بیٹھا۔ تو یہ میلہ ایسا بچھڑا۔ کہ پھر نہ جما۔

دِلّی کے بعض اہلِ کمال تو پہلے ہی وطن کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ کچھ ابھی تک وضعداری نباہتے چلے جاتے تھے۔ لیکن اخیر اخیر میں تو یہ حال ہُوا۔ کہ خواجہ میر درد اور ایک دو اور بزرگوں کے سوا اور کوئی نامور شاعر دِلّی میں نہ رہا۔ اِن خانماں بربادوں کے لئے دو دو تین ہی ٹھکانے تھے۔ مرشد آباد۔ حیدر آباد دکن یا فیض آباد اور لکھنؤ۔ اُس زمانے میں سفر کی یہ سہولتیں نہیں تھیں۔ اس لئے کثر

لوگ تو اودھ تک پہنچ کے رُک گئے۔ چند ہمت والے آگے بڑھے۔ اور بنگالہ یا دکن جا پہنچے۔ اشرف علی خان فغان پہلے شجاع الدّولہ کے دربار میں پہنچے۔ وہاں سے جی اُکتایا۔ تو عظیم آباد کا قصد کیا۔ سودا کو شجاع الدّولہ نے بلا بھیجا۔ لیکن اُنہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب دہلی میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ تو فرخ آباد چلے گئے۔ اور وہاں سے لکھنؤ کا قصد کیا۔ میر سوز ان سے پہلے لکھنؤ میں موجود تھے۔ میر تقی اگرچہ بڑے قناعت پسند اور توکل پیشہ بزرگ تھے۔ لیکن اُنہیں بھی مجبوراً بڑھاپے میں دلّی چھوڑنی پڑی۔ ان لوگوں کے علاوہ جو شاعر دلّی چھوڑ کے لکھنؤ آئے۔ اُن میں ہمیں میر حسن۔ سیّد انشا۔ مصحفی۔ قائم۔ منّت۔ ممنون۔ خواجہ حسن مودودی۔ بقا۔ حیران۔ فاخر۔ مکین۔ قتیل۔ سکندر۔ جرأت۔ رنگین۔ ضیا۔ احسن۔ ہوس وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اِن میں کچھ بلانے پر آئے تھے۔ کچھ بن بلائے۔ بعض دلّی کے رہنے والے تھے۔ بعض کو شاہ جہان آباد سے صرف اتنا تعلق تھا۔ کہ اُن کی شاعری کی نشو ونما اس شہر میں ہوئی تھی۔ اور یہ صرف شاعروں ہی پر موقوف نہیں۔ نوابانِ اودھ کی قدردانی کی بدولت جن لوگوں نے دلّی کو چھوڑ کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ اُن میں طبیب خطّاط۔ معمار۔ مہندس۔ پہلوان۔ گویّے۔ پتنگ باز۔ داستان گو۔ رکابدار غرض ہر فن کے اُستاد موجود تھے۔

اُن دنوں اگرچہ اطرافِ ملک میں کئی جگہ شاعری کا چرچا تھا۔ لیکن زبان صرف شاہ جہان آباد کی مستند سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے جب تک کوئی شاعر دلّی میں کچھ عرصہ رہ کے مشقِ سخن نہ کر لیتا تھا۔ اُس کی زبان اور شاعری کو چنداں لائقِ التفات تصوّر نہیں کیا جاتا تھا۔ فدوی اور سکندر پنجابی تھے۔ لیکن زبان سیکھنے کے شوق میں برسوں شاہ جہان آباد کی خاک چھانتے رہے۔ مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن گیارہ برس دلّی میں رہے۔ اور میر سودا، درد، قائم وغیرہ کے فیضِ صحبت سے استادی کا رتبہ حاصل کر لیا۔ قائم چاندپور کے تھے۔ لیکن اُنہیں بھی زبان کی سند حاصل کرنے کے لئے دلّی آنا پڑا۔ اُس زمانے میں اکبر آباد اگرچہ زبان کی شستگی کے لحاظ سے دلّی سے دوسرے درجے پر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بزرگانِ دہلی کبھی کبھی اہلِ اکبر آباد کی زبان پر بھی ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسے لوگ لکھنؤ اور فیض آباد کی اردو آمیز پوربی کو کب خاطر میں لاتے۔ مولانا عبد الحلیم شرر نے ایک جگہ لکھنؤ والوں کی قدردانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"دلّی کا ہر خانماں برباد یہاں آتے ہی پاؤں توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں باقی رہی۔"

لیکن مولانا کا یہ خیال غلط ہے۔ میر تقی لکھنؤ میں بڑی عزت سے بُلائے گئے تھے۔ آصف الدّولہ اُن کا بڑا احترام کرتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ دلّی کو یاد کرتے رہے۔ میر نے ۲۲ شعر کی ایک مسلسل غزل لکھی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار　　کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار

اس پوری غزل میں میر نے اپنی بے وطنی کا رونا رویا ہے۔ اور دلّی کی صحبتوں کو بڑی حسرت سے یاد کیا ہے۔ مطلع میں شہر سے دلّی مراد ہے۔ گویا میر کے نزدیک لکھنؤ کے کوچہ و بازار صحرا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا　　وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ؎

آباد اجڑا لکھنؤ چند دن سے اب ہوا　　مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

میر حسن اگرچہ بڑے متین مزاج گوار تھے۔ لیکن اُنہوں نے فیض آباد کی ہجو کہہ کے جی کی بھڑاس نکالی ہے۔ یہ لوگ تو خیر دلّی والے تھے مصحفی جیسے لوگ بھی جنہیں دلّی میں دس بارہ برس رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مرتے دم تک یہاں کی صحبتوں کو نہ بھول سکے۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلّی سے نکل کر　　کیا کہئے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں

یہ ذکر چھڑا ہے۔ تو ان کی ایک رباعی بھی سن لیجئے ؎

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تونے — ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے

میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت — اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

مصحفی نے شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے ہیں۔ ان میں بھی جگہ جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے اودھ اور اودھ کے لوگوں کے متعلق اُن کے خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً میر حسن کے تذکرے میں لکھتے ہیں "قضا او را بطرف پورب افگندہ" میر ضیا کے متعلق کہتے ہیں "بطرف پورب آوارہ شدہ" غرض دلی کے اِن باکمالوں کو محض معاش کی خاطر لکھنؤ کی سکونت اختیار کرنی پڑی تھی۔ ورنہ اُن کے لئے لکھنؤ میں کوئی دلکشی نہیں تھی ان کے نزدیک لکھنؤ والوں کی زبان اردو نہیں پوربی یا یُوں کہہ لیجئے کہ اردو آمیز پوربی تھی۔ پھر نہ اُن کا لہجہ درست نہ تلفظ صحیح۔ نہ وہ انہیں تہذیب و شائستگی میں اپنا مدِمقابل سمجھتے تھے۔

اُس زمانے میں دلی کے لوگ جہاں جاتے تھے۔ لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ اس لئے لکھنؤ میں بھی اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ کچھ لوگ جو زیادہ نامور تھے۔ نواب کے دربار میں جا پہنچے جنہیں دربار میں رسائی نہ ہو سکی۔ انہیں بھی سر چھپانے کا کوئی نہ کوئی ٹھکانا مل گیا۔ اِن خانماں بربادوں کے لئے ایک بڑا ٹھکانا تو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار تھی۔ جو اگرچہ دلی کے شاہزادے تھے لیکن وطن چھوڑ کے لکھنؤ جا بسے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے موٹے ٹھکانے تھے۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی۔ کہ لکھنؤ کے ادنٰے و اعلےٰ دلی والوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اُن کی رفتار و گفتار کی نقل کرنے اور اُن کی زبان سے جو کچھ نکل جاتا تھا۔ اُسے اپنے لئے سند جانتے تھے۔ سید انشا نے دریائے لطافت میں لکھنؤ والوں کے اس ذوق و شوق کی داد دی ہے۔ اور سعادت علی خاں کی پاسِ خاطر نے لی اور لکھنؤ کا موازنہ اس طرح کیا ہے کہ لکھنؤ کی بات بھی رہ جائے اور دلی پر بھی حرف آنے نہ پائے۔ انشا درباداری کے ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے لکھنؤ کی زبان کو بہت سراہا ہے۔ لیکن لے دے کے اُن کے پاس بھی یہی دلیل ہے۔ کہ شاہ جہان آباد کے سارے فصحا تو لکھنؤ میں موجود ہیں۔ پھر لکھنؤ زبان کے معاملے میں دلی کی برابری کیوں نہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے اس بات کی صراحت کر دی ہے۔ کہ وہ اُن لوگوں کی زبان کو فصیح سمجھتے ہیں جو دلی سے آکے لکھنؤ میں بس گئے ہیں۔

"غرض از باشندگانِ لکھنؤ باشندگانِ شاہ جہان آباد اند کہ بعد از خرابیٔ دارالخلافہ در لکھنؤ مسکن اختیار کردہ اند واز باشندگانِ دہلی کہ اظہار اکثر از لکھنؤ می دہیم باشندگانِ لاہور و کاکوری — و میرٹھ مستند دریں صورت ترجیح ساکنانِ لکھنؤ بر ساکنانِ دہلی ثابت نہ شد۔ بلکہ ترجیح بعضے شاہ جہان آبادیاں بر بعضے شاہ جہان آبادیاں"

آگے چل کے کہتے ہیں۔ کہ مرزا بدیع الزمان جو دلی سے آکے الہ آباد میں بس گئے ہیں۔ یقیناً جھنڈا سنگھ چوپڑہ سے جو عین پورب سے آیا ہے زیادہ اچھی اُردو جانتے ہیں۔ لیکن سید انشا پُورب کے انہیں باشندوں کو اِس لائق سمجھتے ہیں۔ جو دلی سے آکے پُورب میں آباد ہو گئے ہیں۔ ورنہ جو لوگ پشتہا پشت سے پُورب میں آباد ہیں۔ انہیں سید موصوف زبان کے معاملے میں جھنڈا سنگھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک پنجابی ہوں پوربئے لکھنوی اور الہ آبادی یا لاہوری اور امرتسری اردو کے معاملے میں سب کی حیثیت یکساں ہے۔ اور یہ بات صرف سید انشا پر موقوف نہیں۔ اُس زمانے میں سب دلی والوں کی رائے یہی تھی۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ سعادت علی خان کے زمانے میں لکھنؤ والوں نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ اور اُن میں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ ہم نے دلی والوں سے زبان سیکھی ہے۔ اس لئے ہمیں زبان دانی کا دعوٰے زیب دیتا ہے۔ ورنہ سید انشا جو زمانے کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ مفت سے یہ بحث ہی نہ چھیڑتے اس خیال کی تائید اور ذریعوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً مصحفی کہتے ہیں ؎

بھنوں کا گماں ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں دلّی نہیں دیکھی ہے زباندان یہ کہاں ہیں

لیکن اس زمانے تک اودھ کے حکمران نواب وزیر اودھ کہلاتے تھے۔ دولت و ثروت اور قوت و اختیار میں وہ دلّی کے مجبور و بے بس بادشاہ سے بڑھ چڑھ گئے ہی لیکن ابھی تیموری زمانہ داؤں کی ظاہری آن بان میں فرق نہیں آنے پایا تھا سلطنت کے ادب و آداب قائم تھے۔ اور بڑے بڑے گردن کشوں کے سر شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کے سامنے جھک جاتے تھے۔ دلّی کا بادشاہ ہزار بے اختیار سہی۔ وہ تیمور و بابر کی یادگار تھا۔ اس لئے گردنیں اُس کے سامنے نہیں بلکہ تیمور و بابر اور اکبر و عالمگیر کی عظمت کے سامنے خم ہوتی تھیں۔ لیکن سعادت علی خان کے بیٹے غازی الدین حیدر کے عہد میں آلِ تیمور کی یہ برائے نام سی برتری بھی مٹ گئی۔ یعنی کمپنی بہادر کی سرکار سے نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب مل گیا اور غازی الدین حیدر نوابی کی مسند سے اُٹھ کے بادشاہت کے تخت پر جا بیٹھا۔ اب دلّی کے دربار کے مقابلے میں ایک اور شاہی دربار قائم ہو گیا۔ اور لکھنؤ والے ہر بات میں دلّی والوں کی برابری کرنے لگے۔ ابھی تک انہیں یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ کہ لکھنؤ کی زبان دلّی کی اُردو سے بہتر ہے۔ یہ کمی مرزا رجب علی بیگ سرور نے پوری کر دی۔ جو اصل کے لحاظ سے اکبر آبادی تھے۔ لیکن لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور کے تذکرے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ حکیم نور الدین قادیانی مدت تک تعلیم کے سلسلے میں لکھنؤ اور کانپور رہے تھے۔ اتفاقاً اس زمانے میں مرزا رجب علی بیگ سرور سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔ سرور کے فسانہ عجائب کو اُن دنوں بڑی شہرت حاصل تھی۔ حکیم صاحب نے سوچا کہ لاؤ ان سے تبرکاً فسانہ عجائب ہی پڑھ لیں۔ پہلے ہی دن جب پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے۔

مولوی مبین دورِ بیں سراج انجمن۔ مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ ایسے فقیہ محقق کہاں ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نادر زماں ہوتے ہیں۔ اُدھر رکن دین بلا کہ سید محمد مجتہد مستند

تو حکیم صاحب نے پوچھا مرزا صاحب آپ سُنی کب سے ہیں۔ مرزا پہلے تو کچھ گھبرا سے گئے۔ پھر کہنے لگے۔ آپ کو یہ بات کیونکر معلوم ہوئی۔ حکیم صاحب نے کہا آپ نے شیعی علما کا ذکر کرتے ہوئے "اُدھر" کہا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ آپ کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مرزا کہنے لگے بھائی میں ہوں تو سُنی لیکن زمانے کا رنگ دیکھ کے مجھے مجبوراً اپنا مذہب چھپانا پڑا۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ جب انسان لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اپنے مذہبی خیالات چھپا سکتا ہے۔ تو ادب اور زبان کے بارے میں بھی وہ یہی انداز اختیار کر سکتا ہے۔ اس سے بحث نہیں۔ کہ دلّی اور اکبر آباد کی زبان کے بارے میں مرزا رجب علی بیگ سرور کے خیالات کیا تھے۔ بہرحال وہ لکھنؤ والوں میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس معاملے میں دلّی پر لکھنؤ کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

سرور نے فسانہ عجائب غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع کیا۔ اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں اُس کی تصنیف سے فارغ ہوئے۔ کتاب کے آغاز میں دیباچے کے طور پر انہوں نے لکھنؤ کی تعریف میں طبیعت کا زور دکھایا ہے۔ اور اس ضمن میں جگہ جگہ دلّی پر چوٹیں بھی کی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں۔ جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے کسی نے سُنی ہو سُنائے۔ دیکھی ہو دکھائے۔ عہد دولت بابر شاہ سے تا سلطنت اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے۔ نہ چولھے میں آگ نہ گھڑے میں پانی۔ دلّی کی آبادی ویران تھی۔ سب بادشاہوں کے عصر کے روزمرہ لہجے اُردوئے معلّٰے کی فصاحت تصنیف شعرا سے معلوم ہوئی یہ لطافت اور فصاحت و بلاغت نہ کبھی وہاں تھی نہ اب تک وہاں ہے۔

آگے چل کے میر امّن پر برس پڑتے ہیں۔

"میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے۔ کہ ہم لوگوں کے۔ ذہن حصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منہ توڑتے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں انسان بدنام ہوتا ہے۔"

جیسا کہ سرور نے خود کہا ہے۔ فسانہ عجائب چار درویش کے توڑ پر لکھا گیا ہے اگرچہ دونوں کتابوں کی تصنیف میں پچاس ساٹھ برس کا فرق ہے۔ لیکن جس شخص کو یہ معلوم نہ ہو۔ کہ دونوں کتابوں میں پہلے کون سی لکھی گئی ہے۔ اُسے شاید سرور کی زبان زیادہ پرانی معلوم ہو۔ کیونکہ میرامن نے سیدھی سادی بے تکلف زبان لکھی ہے۔ اور سرور نے فارسی نثر نگاروں کے انداز میں الفاظ کا طلسم باندھا ہے۔ اور اردو میں نیا بازار شبنم شاداب اور پنج رقعہ وغیرہ کی مسجع و مقفٰے زبان کا چربا اتار کے رکھ دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانے کا انداز یہی تھا۔ اور چہار درویش یا عُود ہندی اور اردو معلّٰے کے سوا سیدھی سادی نثر کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اُن دنوں اگرچہ دلّی اور لکھنؤ دونوں جگہ دفتری زبان فارسی تھی۔ لیکن لکھنؤ پر فارسیت کا غلبہ تھا۔ کیونکہ نوابانِ اودھ اصل کے لحاظ سے ایرانی اور مذہب کے اعتبار سے شیعی تھے۔ صلہ اور انعام کے لالچ میں ایران اور عراق کے سادات علما رقیقہ خواں وغیرہ کھچے چلے آتے تھے۔ اِن لوگوں کے اثر سے لکھنؤ کی زبان فارسی ترکیبوں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔

لیکن اِس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے۔ جو میرے نزدیک ان دونوں وجہوں سے زیادہ قوی ہے۔ لکھنؤ والوں کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ ٹھیٹھ اردو میں وہ دلّی والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میر و مرزا اور انشاء و مصحفی کی زبان کی پیروی کریں گے۔ تو دلّی والوں سے کور دبتی رہے گی۔ جہاں ذرا محاورے سے اِدھر اُدھر ہوئے اُنھوں نے فوراً ٹوک دیا۔ کہ دلّی میں یُوں نہیں۔ یوں بولتے ہیں۔ اب دلّی کا روزمرہ سیکھنے کے لئے کون شاہ جہان آباد جائے۔ ان لوگوں کے ناز اٹھائے۔ فارسی عربی کے معاملے میں ہم دونوں کی حیثیت یکساں ہے، بلکہ شاید ہمارا ہی پلہ بھاری ہو۔ پھر بڑی آسانی یہ ہے۔ کہ فارسی اور عربی لغت کی کتابیں موجود ہیں۔ جہاں شبہ ہوا۔ کتاب اٹھا کے دیکھ لی نہ اساتذہ کے کلام کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ باتیں سوچ کے اُنھوں نے ایسی زبان اختیار کی۔ کہ دلّی کی پیروی سے بہت حد تک بے نیاز ہو گئے۔

غرض سچ پوچھئے۔ تو لکھنؤ والوں نے جس چیز کو اپنے فضل و کمال کی دستاویز کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ اُن کے عجزِ کلام کی دلیل تھی۔ اس زمانے میں پنجاب اور دکن کے لوگوں کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی عربی فارسی کا سہارا لئے بغیر دو قدم نہیں چلتے اور جہاں تک بن پڑتا ہے۔ ٹھیٹھ زبان سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو محاورہ بڑے بکھیڑے کی چیز ہے کیونکہ اُس میں یہ ناممکن ہے۔ کہ آپ ایک لفظ کو ہٹا کے اُس کی جگہ اُس کا ہم معنی کوئی دُوسرا لفظ رکھ دیں۔

لکھنؤ کی زبان پر فارسیت کا غلبہ غازی الدین حیدر کے زمانے یا فسانہ عجائب کی تصنیف سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ سید انشا نے دریائے لطافت میں لکھنؤ اور دلّی کی زبان کے جو نمونے پیش کئے ہیں۔ اُن میں جا بجا یہ بات نمایاں نظر آتی ہے۔ انشا لکھنؤ والوں میں سعادت علی خاں کے بعد نواب عماد الملک کو فصیح ترین شخص سمجھتے ہیں۔ اِن نواب صاحب کی زبان کا نمونہ یہ ہے:۔

اجی لالہ بھاڑامل تمہارے احوال پر باللہ کہ ہم سخت متاسف ہوتے ہیں۔ حق تعالےٰ نے اپنی عنایات سے تمہیں حیاتِ اُلوف کا مالک کیا۔ اور اوقات تمہاری یہ کہ اور من الناس جس مسلمان کو قرض کھینچے۔ اُس کے برابر ذائقہ صاحب کا لذت آشنا نہیں۔

اِس کے مقابلے میں میر غفر منشی اور بی نورن کی صاف اور شستہ تقریریں ہیں جنہیں پڑھ کے زبان اور دل دونوں مزے لیتے ہیں انشا نے اسی کتاب میں ایک اور موقع پر ایک ہی خیال کو ایک پوربی اردو دان اور ایک شاہ جہان آبادی کی زبانی ادا کرایا ہے جس میں صرف اتنا فرق ہے کہ دلّی والے نے جہاں اردو کے عام الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہاں پوربی نے فارسی کے لفظ رکھ دیئے ہیں۔

ابتدا ابتدا میں تو دلّی والوں نے لکھنؤ کی زبان کو اپنی زبان سمجھا۔ کیونکہ لکھنؤ میں جتنے نامور شعرا تھے سب دلّی کے تھے۔ دلّی میں جو شاعر

رہ گئے تھے۔ اُن کی نظریں بھی لکھنؤ کی طرف لگی رہتی تھیں۔

لکھنؤ سے جرأت۔ انشا۔ مصحفی وغیرہ کی غزلیں آتی تھیں۔ اور دِلّی کے شعرا اُن پر غزلیں لکھتے تھے۔ لیکن جب یہ دَور ختم ہُوا۔ اور آتش و ناسخ۔ رند۔ وزیر۔ صبا۔ برق۔ گویا۔ قلق۔ نسیم۔ شوق۔ رشک۔ بحر۔ امانت وغیرہ کا زمانہ آیا۔ تو دِلّی اور لکھنؤ میں چشمکیں شروع ہُوئیں ان لکھنوی شعرا میں ایک آدھ کے سوا سب ایسے تھے۔ جو لکھنؤ میں پیدا ہُوئے تھے۔ اور وہیں اُن کی شاعری چمکی تھی۔ ان لوگوں نے دِلّی کے خلاف علانیہ علم اجتہاد بلند کر دیا۔ اور پوربی بھاشا کے بہت سے لفظوں کو جنہیں ابھی تک اردو میں بار نہیں ملا تھا۔ اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کرنے لگے۔ اس کے علاوہ انہوں نے لفظوں کی تذکیر و تانیث کے معاملے میں بھی اجتہاد سے کام لیا۔ تذکیر و تانیث کے پُرانے قاعدوں میں ترمیمیں کیں۔ متروکات کی ایک فہرست مرتب کی۔ اور جو بعض ایسے لفظوں کو جو دِلّی اور لکھنؤ دونوں جگہ بولے جاتے تھے ٹکسال باہر قرار دیا۔ بزرگانِ دہلی ان لوگوں کی اس خودسری پر چیں بجبیں تو ضرور ہُوئے۔ لیکن لکھنؤ کی زبان اور شاعری کا دامن شاہان اودھ کے دامن دولت سے بندھا ہُوا تھا۔ اس لئے کھُلم کھُلا کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے۔ کہ دِلّی والوں نے اہل لکھنؤ کے تصرفات کو مان لیا۔ اور لکھنؤ کی مرکزی حیثیت تسلیم کر لی۔ وہ ابھی تک دِلّی ہی کو زبان کا مرکز سمجھتے تھے۔ اور برملا کہتے تھے کہ اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے۔ میر انیس کی عمر اگرچہ لکھنؤ میں گزری۔ لیکن وہ دِلّی کی زبان کے پیرو تھے۔ اور مرثیہ پڑھتے جس وقت کوئی دِلّی کا خاص محاورہ آجاتا تھا۔ تو کہہ دیتے تھے۔ کہ صاحبان لکھنؤ میں یوں نہیں بولتے۔ یا اہلِ لکھنؤ کی یہ زبان نہیں۔

دِلّی والوں میں سب سے پہلے مرزا اصغر علی نسیم نے لکھنؤ کے تصرفات کو قبول کیا۔ نسیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ واجد علی شاہ کے معزول ہونے سے کچھ عرصہ پہلے لکھنؤ پہنچے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کی شان میں کئی قصیدے ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ معلوم نہیں۔ انہیں دربار میں رسائی ہوئی یا نہیں۔ لیکن ان کی زبان پر لکھنؤ کا بڑا اثر ہے۔ یہی عالم تھا۔ کہ واجد علی شاہ معزول ہو کے کلکتے پہنچے۔ سال بھر کے بعد غدر ہو گیا۔ دِلّی اور لکھنؤ کے اہلِ علم منتشر ہوگئے اور مدت تک کسی کو زبان کے جھگڑوں کی طرف توجہ کرنے کا خیال نہ آیا۔ جب رام پور میں یہ اکھٹری ہوئی محفلیں پھر جمیں تو دِلّی اور لکھنؤ کی بحث پھر چھڑی۔ اخباروں اور رسالوں میں لفظوں کی تذکیر و تانیث اور محاوروں کی اصل پر مضامین لکھے جانے لگے۔ یُوں اس طرح ملک دو حصّوں میں منقسم ہو کے رہ گیا۔ لاہور سے بریلی تک دِلّی کی زبان مستند سمجھی گئی۔ اور بریلی سے کلکتہ تک سارا علاقہ لکھنؤ کے حصّے میں آیا۔

لکھنؤ اور دِلّی کی بحث میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ بڑا اہم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ کہہ دینا بڑا مشکل ہے۔ کہ فلاں لفظ لکھنؤ والوں کے نزدیک مذکر ہے اور دِلّی والوں کی رائے میں مونث۔ اکثر الفاظ ہیں جن میں خود لکھنؤ والوں کے درمیان اختلاف ہے۔ اسی طرح دِلّی کے بعض اساتذہ نے ایک لفظ کو بالتذکیر باندھا ہے۔ اور بعض نے بالتانیث۔ مثلاً جان بالاتفاق مونث ہے۔ لیکن میر سوز وغیرہ نے اسے مذکر بھی لکھا ہے۔ سانس کے بارے میں عام خیال یہ ہے۔ کہ لکھنؤ میں مونث اور دِلّی میں مذکر ہے۔ لیکن ذوق کہتے ہیں:

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رُو کی خواہش کا ۔۔۔ تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم

اور ذوق کے شاگردوں داغ اور آزاد نے اسے مونث لکھا ہے۔ اسی طرح ناسخ لفظ کی تذکیر کے قائل ہیں۔ لیکن اُن کے شاگرد میر اوسط علی رشک کہتے ہیں۔ کہ:

وصل کی رات بنا نامۂ شوق گیسو! ۔۔۔ شام غفلت میں سپیدی ہے سحر کاغذ کی

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ بعض الفاظ مثلاً قلم۔ التماس۔ نشاط۔ متاع۔ فکر۔ سانس۔ نقاب۔ آغوش۔ جوڑ۔ مالا۔ لفظ وغیرہ کی تذکیر و تانیث لکھنؤ اور دہلی کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر کو

اکثر اوقات تو ضرورتِ شعری کسی لفظ کو بالتذکیر یا بالتانیث باندھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور ایسے موقع پر دہ یہ بھول جاتا ہے۔ کہ وہ دہلی کی زبان کا پیرو ہے۔ یا لکھنؤ کا متبع۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے۔ کہ اکثر اوقات گرد و پیش کے الفاظ کو کسی لفظ کی تذکیر و تانیث متعین کرنے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔

اس معاملے میں جلال لکھنوی کی بھی یہی رائے ہے۔ عرصہ ہوا اودھ اخبار کے ایک مضمون کے متعلق رائے دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ موقع او محل کی مناسبت سے تذکیر و تانیث کے معاملے میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے

متاخرین لکھنؤ کا ایک بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے عربی۔ فارسی کے اکثر دخیل الفاظ کو اُن کی اصلی صُورت میں استعمال کرنے پر زور دیا۔ اور بعض لکھنوی شعرا اس معاملے میں بہت غلو کرنے لگے۔ چنانچہ رشک نے ایک موقع پر تمیز کی جگہ تمِیز باندھا ہے ؎

خوفِ صیاد اُسے کیا نہ ہو تمِیز جسے　　مرغِ تصویر کبھی لائقِ فتراک نہیں

حَرَکَت اور بَرَکَت عربی کے الفاظ ہیں۔ ایرانیوں نے بھی انہیں بسکونِ را حرکت اور برکت باندھا ہے۔ مثلاً قدسی کہتا ہے ؎

کہ در خرمنِ عُمر برکت نماند۔ مُلّا قوتی لکھتا ہے۔ کہ ؎ زبس خوش حرکت و شیریں ادا بود

لیکن متاخرین لکھنؤ میں سے اکثر نے حَرَکَت اور بَرَکَت باندھا ہے۔ مثلاً ؎

دِل ہی دِل میں بخدا یادِ بُتاں رہتی ہے　　حرکت سے جو زباں اپنی یہاں رہتی ہے

اسی طرح عربی فارسی کے جو الفاظ ہمارے ہاں غلط معنوں میں رواج پا گئے ہیں۔ اُنہیں اُن کے اصل معنوں میں استعمال کیا۔ مثلاً اردو میں مشکور کے معنی شکر گذار کے ہیں۔ لیکن لکھنؤ والے ایسے موقع پر ممنون کہیں گے۔ سر سیّد کی تحریر میں ایک جگہ مشکور بمعنی شکر گذار دیکھ کے مولانا عبد الحلیم شرر نے اعتراض کیا تھا۔ جس کے جواب میں سر سیّد نے فرمایا۔ کہ مولوی شرر صاحب کو میرے لکھے سے سند پکڑنی چاہیئے۔

لیکن دخیل الفاظ کے بارے میں اس قسم کا غلو صحیح نہیں جب کوئی شخص اپنا وطن چھوڑ کے کسی دوسرے مُلک میں آباد ہوتا ہے۔ تو اپنا قانون ساتھ نہیں لاتا۔ بلکہ اُس مُلک کے قانُون کی پیروی کرتا ہے۔ چاہے وہ مشہد مقدّس سے آئے یا مدینہ منوّرہ سے۔ عربی فارسی کے جو لفظ اردو میں آ گئے ہیں۔ وہ اردو قواعد کے تابع ہیں۔ ان پر عربی فارسی گرامر کے قاعدے جاری کرنا غلط ہے

بعض الفاظ کے تلفّظ میں بھی لکھنؤ اور دہلی کے درمیان اختلاف ہے۔ مثلاً دِلّی میں پینگ یائے معروف کے ساتھ کہتے ہیں۔ لکھنؤ میں پینگ اور اِسے کرتُوت کی طرح حالتِ جمع میں استعمال کرتے ہیں۔ دِلّی میں پہنانا اور پنہانا دونوں ہیں۔ لکھنؤ والے پہنانا کہتے ہیں۔ دِلّی میں تنُّور بھی ہے۔ اور تندُور بھی۔ لیکن لکھنؤ والے صرف تنُّور کہیں گے۔ دہلی میں دھکیلنا ہے۔ لکھنؤ میں ڈھکیلنا۔ دِلّی میں کُشتی ہے۔ لکھنؤ میں کَشتی۔ دِلّی میں سِر فصیح ہے۔ لکھنؤ میں سَر کو زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔ دِلّی میں مروڑ۔ لکھنؤ میں مرڈوڑ۔ دِلّی میں ٹھہرنا بھی مستعمل ہے اور ٹھیرنا بھی۔ لیکن لکھنؤ والوں کے نزدیک ٹھہرنا صحیح ہے۔ ان کے علاوہ بعض الفاظ جو پوربی بھاشا سے آئے ہیں لکھنؤ سے مخصوص ہیں۔ مثلاً دِلّی میں کنجڑا اور کنجڑن کہتے ہیں لکھنؤ والے اِن معنوں میں کبڑیا اور کبڑن کو روا رکھتے ہیں۔ دِلّی میں تھم بمعنی ستون بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن لکھنؤ والے صرف کھم کہتے ہیں۔ اس موقع پر تھم استعمال نہیں کرتے۔ لکھنؤ میں اندھیارا اور اندھیرا دونوں ہیں۔ دِلّی میں صرف اندھیرا کہتے ہیں۔

دونوں شہروں کے محاوروں میں بھی اختلاف ہے۔ اُن میں بعض محاورے جو ایسے ہیں۔ تو دِلّی سے لکھنؤ گئے۔ اور زبانوں پہ چڑھ کے کچھ کے کچھ ہو گئے۔ مثلاً دِلّی کا محاورہ ہے۔ آلے بالے بتانا لکھنؤ والے اس موقع پر ٹالے بالے بتانا کہتے ہیں۔ لکھنؤ والوں کا ذہن غالباً محاورے کے معنی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور انہوں نے آلے کی جگہ ٹالے کہنا شروع کر دیا۔ بعض محاورے لکھنؤ سے مخصوص ہیں۔ مثلاً دِلّی

میں رکھائی برتنا مستعمل ہے۔ لکھنؤ والے رکھائی کی لینا بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ ایسے محاورے کثرت سے ہیں جو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں بولے جاتے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر پتنگ بازوں۔ کبوتربازوں۔ بٹیربازوں یا ایسے پیشوں سے ہے جنہیں لکھنؤ میں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

لیکن میرے خیال میں لکھنؤ والوں کے تصرفات میں سب سے زیادہ اہم بعض قاعدوں کو حاصل ہے جن کی پابندی پر متاخرینِ لکھنؤ نے بڑا زور دیا ہے مثلاً انہوں نے ایک اصول یہ قرار دیا کہ مصدر کی علامت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ داغ کا مشہور شعر ہے ؎

بات تک کرنی نہ آتی تھی تمہیں	یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

لکھنؤ والوں کے نزدیک پہلے مصرع میں کرنی کی جگہ کرنا ہونا چاہیئے۔ مثلاً امیر مینائی کہتے ہیں ؎

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی	بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے

یہ صحیح ہے کہ خود لکھنؤ والوں نے بھی اس قاعدے کو توڑا ہے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ دیا شنکر نسیم لکھتے ہیں ؎

سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی	ہے سانپ کے منہ میں انگلی دینی

رشک کہتے ہیں ؎	لکھنی ہے مجھ کو تہنیتِ ابتدائے خط

امیر مینائی نے بھی ایک جگہ اس اصول سے انحراف کیا ہے ؎

مشکل پڑی حضور کو گھر رات کاٹنی	دیکھے ہمارے نالۂ شب گیر کے خواص

اس کے علاوہ ان لوگوں نے یہ اصول قرار دیا۔ کہ عربی کے جو الفاظ حالتِ وحدت میں مونث ہیں۔ جب عربی قاعدے سے ان کی جمع بنائی جائے۔ تو انہیں بالتذکیر لکھا جائے۔ چنانچہ کرامات۔ آیات۔ عنایات۔ آفات وغیرہ اہلِ لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اساتذۂ لکھنؤ نے اپنے زمانے کے مسلمہ اصولوں سے کیوں انحراف کیا؟ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بزرگوار اردو زبان کو سارے ملک میں پھیلانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے زبان کو سہل بنانے کے خیال سے یہ قاعدے وضع کر لئے۔ لیکن اس زمانے کے خیالات پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ زبان کی ترویج کا شوق کسی کو نہیں تھا۔ بلکہ یہ بزرگوار تو زبان کو پھیلانے کے بجائے الٹے اپنے تک محدود کر دینا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ لکھنؤ والوں نے تذکیر و تانیث کے جھگڑے سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا۔ اور میری رائے میں یہ وجہ زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں لکھنؤ کی شاعری عروج پر تھی۔ اساتذۂ لکھنؤ کو زباندانی کے بڑے بڑے دعوے تھے۔ پھر بھی اہلِ دہلی نے ان کی زبان کو کبھی مستند نہ مانا۔ دیکھئے مرزا غالب نے اگرچہ لکھنؤ کے بعض شاعروں کی تعریف بھی کی ہے۔ لیکن رتھ کی تذکیر و تانیث کے متعلق کسی نے سوال کیا۔ تو ان کے قلم سے یہ چبھتا ہوا فقرہ نکل گیا۔ کہ پورب میں تو ہتھنی آیا بھی کہتے ہیں۔ غرض اہلِ لکھنؤ نے یہ اصول قرار دے کے ایک حد تک تذکیر و تانیث کے جھنجھٹ سے نجات حاصل کر لی۔

اساتذۂ لکھنؤ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بعض لفظوں کو جو اس وقت عام طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ متروک قرار دیا۔ اول تو کسی شخص کا خواہ وہ کتنا بڑا استاد کیوں نہ ہو۔ بعض خاص لفظوں کو ٹکسال باہر قرار دینا بڑی دھاندلی ہے۔ کیونکہ جو لفظ کسی زبان میں کھپ نہیں سکتے۔ وہ خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ دوسرے متروکات کی اس فہرست میں ایسے الفاظ بھی شامل ہیں جن کا مفہوم کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اس فہرست میں ہمیں "سو" بھی نظر آتا ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ "سو" کا مفہوم کوئی دوسرا لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ بیچ۔ یہ۔ چ معنی۔ لیکن۔ تلک۔ یاں۔ واں۔ نیچے۔ مت۔ آئے ہے جائے ہے۔ ہووے۔ لیک۔ بارے وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی ترک کر دیا گیا۔ لیکن ان میں بہت کم متروکات کو اہلِ ذوق نے قبول کیا۔ ہمارے ہاں آئے ہے جائے ہے اور تلک خود لکھنوی شعراء کے ہاں موجود ہیں۔ حسرت موہانی نے نسیم دہلوی کا یہ مصرع "رحم آتا ہے دشمن کی گرفتاری پر" نقل کر کے اسے صحیح کیا ہے کہ اگر وہ اس جگہ "رحم آ

جلائے ہے" لکھتے تو بہتر ہوتا۔

لکھنؤ والوں کی طرف سے دلی کی زبان پر جو اعتراض ہوئے ہیں۔ اُن میں ایک بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ دلی کی زبان پر پنجابی کا بڑا اثر ہے۔ میرے خیال میں یہ کوئی ایسا جرم نہیں۔ کہ بالکل ہی معاف نہ کیا جا سکے۔ میر اور سودا بلکہ اُن کے بعد کے شاعروں کے کلام میں پنجابی زبان کے ایسے الفاظ ملتے ہیں۔ جو بعد میں ترک کر دیئے گئے۔ مثلاً دِسنا دیکھنے کے معنی میں۔ جد۔ تد۔ کہ۔ جب۔ تب۔ کب کی جگہ نیں بجائے تیں نون جھنجھا کے معنوں میں۔ نونہ ناخن کی جگہ۔ دھی بیٹی کی بجائے وغیرہ۔ اور اِن لوگوں پر کیا موقوف ہے۔ خود لکھنؤ کی زبان میں بہت سے پنجابی کے الفاظ اور محاورے موجود ہیں۔ مثلاً اوکھیاں سنانا پنجابی کا محاورہ ہے۔ شوق کہتے ہیں ؎ موا اوکھیاں مجھ پہ چھوڑا کیا۔

کچھ گیہوں گیلے اور کچھ جندرے ڈھیلے بھی پنجابی سے آیا ہے۔ جندرا اور جندرے اردو لغت میں کہیں موجود نہیں۔ یہ محاورے تو ایسے ہیں۔ جو دلی اور لکھنؤ دونوں میں مشترک ہیں۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں۔ جو صرف پنجاب اور لکھنؤ میں بولے جاتے ہیں۔ مثلاً دلی میں گھٹنا نیکر سے ملتی جلتی ایک پوشش کا نام ہے۔ اور اب تو نیکر کو بھی گھٹنا کہتے ہیں۔ لیکن لکھنؤ اور پنجاب میں تنگ مُہری کے پاجامے کو گھٹنا کہتے ہیں۔

ایک اعتراض یہ ہے۔ کہ دلی والے پنجاب کے اثر سے "نے" کے استعمال میں غلطی کرتے ہیں پنجاب میں "نے" کا استعمال دو موقعوں پر غلط کیا جاتا ہے۔ لیکن وہاں کے شاعروں اور انشاپردازوں کے ہاں "نے" کے غلط استعمال کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ صرف ایک مشہور شاعر نے اپنے ایک مصرع میں "نے" کا غلط استعمال کیا ہے اور وہ بھی عمداً۔ مصرع یہ ہے ؎

تُونے اُلفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

گرامر کے لحاظ سے یہ مصرع صحیح ہے۔ کیونکہ "نے" علامتِ فاعل ہے۔ اور قاعدے کے لحاظ سے یہاں "تونے" ہی ہونا چاہیئے لیکن اسے کیا کیا جائے۔ کہ محاورہ جس کی عدالت گرامر سے بھی اونچی ہے۔ اس مصرع کو صحیح قرار نہیں دیتا۔ اس کے فتوے کے مطابق اُسے یوں ہونا چاہیئے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے" یہ غلطی پنجاب سے مخصوص ہے۔ دلی کے کسی شاعر کے ہاں اسکی مثال نہیں ملتی "نے" کے استعمال میں پنجاب کے لوگ ایک اور غلطی بھی کرتے ہیں۔ یعنی "میں نے دلی دیکھی ہوئی ہے" کی قسم کے جملے لکھ جاتے ہیں۔ یہ غلطی زیادہ قبیح ہے۔ کیونکہ گرامر اور محاورہ دونوں کا فیصلہ اسکے خلاف ہے۔ گرامر کے لحاظ یہ جملہ فعلیہ خبریہ نہیں۔ بلکہ اسمیہ ہے کیونکہ اس میں فعل سرے سے نہیں۔ دیکھی ہوئی اسم مفعول ہے۔ اور "ہے" حرف ربط۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جس جملے میں فعل نہیں اس میں فاعل کہاں سے آگیا۔ اس لئے "میں نے دلی دیکھی ہوئی ہے" کے بجائے "دلی میری دیکھی ہوئی ہے" کہنا چاہیئے۔ لیکن یہ غلطی شعرائے دہلی کے ہاں بھی موجود ہے۔ اور بہادر شاہ ظفر کے ہاں تو اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں مثلاً ؎

تم نے گر ہوتا اُسے اے مہرباں دیکھا ہُوا

یا پھر ؎ ہم نے ہے خُوب اُس کی طرزِ ناز پہچانی ہوئی — چال پہچانی ہُوئی آواز پہچانی ہوئی

لیکن اگر لال قلعے میں یُوں بولا جاتا تھا۔ تو مجھے گرامر کا فتوےٰ قبول کرنے میں ہزار بار تامل ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہُوں۔ کہ محاورہ کا پنجاب سے متاثر ہونا کوئی ایسا گناہ نہیں جسے معاف ہی نہ کیا جا سکے۔ دیکھئے "آج لگ گئے" صرف پنجابیوں کی زبان پر ہے اور جب پنجاب کا کوئی شاعر یا انشاپرداز "لگ گئے" لکھ جاتا ہے۔ تو اُس پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ لیکن میر تقی بھی اس جرم میں پنجابیوں کے شریک ہیں۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بے مزہ رونے لگ گئے ہم بھی اگر کبھی — تو دیکھیو یہ بادیہ سارا بہا پھرا

لکھنؤ نے تیس چالیس سال کے اندر اردو میں سینکڑوں تصرفات کئے - زبان کے بہت سے قاعدوں ہی کو بدل ڈالا پنجاب نے دو تین محاوروں میں تصرف کیا - تو کیا ہو گیا - یہ سمجھ لیجئے - کہ ؎ ہم سے بھی ایک لغزش مستانہ ہو گئی
اور اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے - اردو کو - یو - پی سے بالکل دیس نکالا مل چکا ہے - دِلّی کا بھی قریب قریب یہی حال ہے - یعنی وہاں بھی کھڑی بولی جو کل تک کسی شمار و قطار میں نہیں تھی - اردو کو ہٹا کے اس کی جگہ لے رہی ہے - اور دِلّی کے خانماں برباد جنہوں نے ایک زمانے میں فیض آباد اور لکھنؤ کو بسایا تھا - لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے شہروں میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں - کوئی عجب نہیں - کہ آگے چل کے کسی اور شہر کو وہی حیثیت حاصل ہو جائے - جو ایک زمانے تک لکھنؤ کو حاصل رہی ہے ؎

مری نگاہ نہیں سوئے بصرہ و بغداد ۔۔۔ کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

انسانی شعور اور تحتِ شعور میں بہت کچھ ہے جسے لفظوں میں صراحت کے ساتھ ظاہر نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس کے کوئی خارجی معیّن خطوط نہیں ہوتے - بلکہ ایک مبہم سا احساس ہوتا ہے اس قسم کے شعوری یا تحتِ شعوری تاثرات و احساسات کو صرف رمز و ایما ہی کے ذریعے سے عیاں کیا جا سکتا ہے - چنانچہ غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنی سے تعلق نہیں رکھتا - اس سے جو مسرّت یا تاثر حاصل ہوتا ہے - اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو موسیقی سے حاصل ہوتی ہے غزل موسیقی سے بہت قریب ہے اور اس میں اس کی پائداری اور قوت کا راز مخفی ہے لیکن شعر اور موسیقی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شعر الفاظ کا جامہ زیب تن کرتا ہے جن کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور وہ عمرانی حیثیت رکھتے ہیں - ان کے ذریعے سے صرف اُن تصوّرات کا اظہار ممکن ہے جن میں دوسرے شرکت کر سکیں - ہر لفظ حقیقت میں ایک شعور ہے جو اپنے اندر مخصوص تاریخی اور تمدّنی لوازمات پوشیدہ رکھتا ہے لیکن موسیقی لفظوں سے بے نیاز ہو کر رمز و علامت سے جمالیاتی اثر آفرینی کرتی ہے -

(ڈاکٹر یوسف)

صلاح الدین احمد

نذیر احمد کی ہیروئن

ذیل کا مقالہ جناب صلاح الدین احمد کی اُن توسیعی تقریروں میں سے ایک تقریر ہے جو انھوں نے پچھلے دنوں اُردو ایم۔ اے طلبا کے سامنے کیں۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے میں اُردو کے پہلے ناول نگار کی ہیروئن کے خاص اوصاف پر روشنی ڈالی ہے۔

—— ادارہ ادبِ لطیف صلاح الدین احمد صاحب کے اس قابل قدر اور فاضلانہ مقالے کا خاص طور پر شکر گزار ہے

آج سے کم و بیش اسّی برس پیشتر جب اُردو کا پہلا ناول مرأۃ العرُوس منظرِ عام پر آیا۔ تو کسے معلوم تھا کہ یہ ہمارے ادب کے سب سے بڑے عنصر یعنی فکشن کے بابِ زرّیں کی کلید ثابت ہوگا۔ اور اُس افسانے کو جنم دے گا جس نے ایک نہایت مختصر مدّت میں اپنی بے نظیر صلاحیتوں کی بنا پر چشمِ عالم میں وہ اعتبار و امتیاز حاصل کیا جو آج بہت سی دیگر زبانوں کے افسانوی ادب کو اپنی طویل عمر اور قدیم روایات کے باوجود میسّر نہیں ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جدید اُردو افسانہ نگاری کا بانی یعنی نذیر احمد خود بنیادی اور شعوری طور پر افسانہ نگار نہیں تھا۔ بلکہ محض ایک قلم کار تھا جس نے اپنے دیگر مشاغل و مساعی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی مقتضیات اور اپنے طبقے کے مصالح اور ضروریات کو سامنے رکھ کر افسانے کو اپنے نظریات کے اظہار و اشاعت کا ذریعہ بنایا اور اپنے ماحول کی سازگاری اور اپنے مخاطبین بلکہ مخاطبات کی موزونیت اور اثر پذیری کی بدولت اپنے مشن میں بے نظیر کامیابی حاصل کی۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ تجدّد کی ایک غیر معمولی صلاحیت لے کر آیا تھا۔ اور اس نے ایک ہی جست میں ہمیں بوستانِ خیال اور فسانۂ عجائب کی طلسمی دُنیا سے نکال کر مغربی طرز کے افسانوی ماحول میں پہنچا دیا۔ اور ہمارے قصّہ نما افسانے کو اپنے قلم کی ایک ہی جنبش سے ناول کے سانچے میں ڈھال دیا۔ یہ اس کا فنّی اجتہاد تھا۔ اور ہم اس کے لئے اُس کی عظمت کے جتنے بھی معترف ہوں، کم ہے۔ یہ نکتہ، البتّہ، قابلِ غور ہے۔ کہ وہ طبعاً ایک افسانہ نگار تھا یا ایک ریفارمر یا محض ایک عمرانی رہبر جو زمانے کی ہوا کا رُخ پہچان کر اپنے طبقے کے لئے ایک مفید راہِ عمل تجویز کر رہا تھا۔ میری ناچیز رائے میں اُس کی آخر الذکر حیثیت حقیقت سے قریب ترین ہے۔ اور اس حیثیت میں اُس نے اپنے پیشِ نظر سماج کے امراض کو دُور کرنے کا جو کڑوا کسیلا نسخہ مرتّب کیا۔ اسے اس نے مریض کو پلانے سے پہلے کہانی کے شہد میں سمو دیا تا کہ وعظ کی تلخی افسانے کی شیرینی سے مل کر بیمار کے حلق سے فی الفور اُتر جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے اپنے فن کی تکنیکی تکمیل کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور وہ کردار نگاری کے وہ مراحل طے نہیں کر سکا جو فن کے اعلےٰ تقاضوں سے نسبت رکھتے ہیں جسنِ اتفاق سے اُسے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے فضا بہت سازگار میسّر آئی جس نے اُس کے کام کو آسان کر دیا۔ لیکن اسی لئے اس کے فنی پہلو کو اُبھرنے اور بلند قدروں تک پہنچنے کا موقع نہیں ملا۔ فضا کی سازگاری میں دو عناصر کار فرما تھے۔ ایک تو حکومتِ وقت کی حوصلہ افزائی اور دوسرے طبقۂ متوسط کے اُس گروہ کی اعانت جو ماضی سے اپنا رشتہ توڑ کر اسے مستقبل کی افادی قدروں سے جوڑ رہا تھا۔ نذیر احمد کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لئے اُس کے پس منظر پر ایک نگاہ ڈالنا از بس ضروری ہے۔ اس نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا۔ وہ ہماری سیاسی اور سماجی تاریخ کا ایک نہایت اہم دَور ہے

یہ وہ زمانہ ہے جب ستاون کے ہنگامۂ آزادی اور اس کی ناکامی کے بعد شمالی ہندوستان کے مسلمان دو فریقوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک فریق اپنے شاندار ماضی کے غم اور ایک خواب ناک مستقبل کے تصوّر میں کھویا ہوا تھا۔ اس میں امراء بھی شامل تھے۔ اور عوام بھی۔ امراء اپنی عظمتِ رفتہ کی لاش سے اور عوام خود فراموشی اور سہل روی کے اُس اندازِ زندگی سے چمٹے ہوئے تھے۔ جسے ایک شخصی نظامِ حکومت اور سیاسی بدنظمی نے تعمیر کیا تھا۔ ان کے خلاف دوسرا فریق طبقۂ متوسط کے اُس گروہ پر مشتمل تھا جو نئے حاکموں سے رشتۂ موالات استوار کر کے اور اجتماعی زندگی کی نئی اقدار قبول کر کے اپنی انفرادی زندگیوں میں آسائش ہمواری اور توازن پیدا کرنا چاہتا تھا۔ نذیر احمد اس فریق کے مفکّر اور رہبر تھے۔ اور اگرچہ اُن کا نصب العین سرسیّد کے اجتماعی اور قومی پروگرام سے براہِ راست کوئی قدرِ مشترک نہیں رکھتا تھا مگر وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں اس کا ممد اور معاون ضرور تھا۔ مگر سرسیّد اور اُن کے رفقاء ایک وسیع سیاسی اور ملّی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے۔ وہ مسلمانوں کی قومی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہے تھے۔ اور اس میں حرکت اور عمل پیدا کرنے کے لئے مختلف مذہبی، تعلیمی اور نیم سیاسی ادارے قائم کرتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ اُن کی بیشتر توجہ سیاسی جوڑ توڑ اور انتظامی معاملات پر صرف ہوتی تھی۔ ان کے مقابلے میں نذیر احمد کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کی نکتہ رس اور دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ نئے دور کی اقدار اُسی صورت میں فروغ پا سکتی ہے جب کہ گھریلو زندگی کو از سرِ نو مرتّب کیا جائے۔ اس کی بنیادیں مستحکم کی جائیں اور ان تمام عناصر پر قابو پایا جائے جو ہمیں بدنظمی۔ بے راہ روی۔ غربت اور مادی تنزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے تھے۔ کہ مسلمانوں کو ایک بہت بڑی مہم درپیش ہے۔ ایک طرف اُنہیں اپنے ماضی سے دامن چھڑانا ہے جو اُن کی دُنیوی ترقّی اور خوشحالی کے راستے میں حائل ہے۔ اور دوسری جانب اسلاف کی مذہبی اور ایک حد تک معاشرتی روایات کو بھی برقرار رکھنا ہے کیونکہ یہی روایات اُن کی ملّی وحدانیت کی ضامن ہیں۔ اس لئے اُن کے نزدیک نئی پود کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنی انفرادی اور خانگی زندگی میں حد درجہ نظم و ضبط پیدا کرے۔ اور اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم کے بعد ملازمتوں اور تجارت پر قابو پانے میں صرف کر دے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک زنان خانے کی فضا میں سکون اور آسودگی میسّر نہ ہو۔ اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی معاشی تگ و دو میں کامیابی حاصل کر سکیں۔ گھر کی فضا کو پُرسکون اور سازگار بنانے کی ذمہداری عورت پر بھی ہے۔ اور مرد پر بھی۔ عورت پر شاید مرد سے بہت زیادہ۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنے تنظیمی منصوبے میں عورت کو مرد پر ترجیح دی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن کے عمرانی مقالوں یعنی اُن کے ناولوں میں عورت ہی پیش پیش نظر آتی ہے۔ اور جہاں کہیں انہوں نے اپنے کسی کردار کو اپنی خوشنودی سے نوازا ہے۔ وہاں وہ اتفاق سے عورت ہی نکلی ہے۔ اُن کے ہاں ہمیں ہیرو کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ البتہ ایک یا ڈیڑھ ہیروئن ضرور ہے۔ ایک تو زنانہ لباس میں وہ خود ہیں یعنی اصغری انہیں کی ہمزاد ہے۔ اور آدھی ایامیٰ والی آزادی بیگم ہیں جنہیں انہوں نے مصلحتاً منزلِ مقصود پر نہیں پہنچایا۔ بلکہ اُدھر ہی میں مار ڈالا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم مولوی صاحب کے ان کرداروں کا کوئی تفصیلی جائزہ لیں ہمیں ایک دو نکتے نگاہ کے سامنے رکھنے چاہئیں ایک تو یہ کہ مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ امراء تھے۔ اور نہ عوام۔ عوام کو تو وہ درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اور اُن کے مسائل کو وہ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہ سعادت بعد میں پریم چند کے حصّے میں آئی۔ مولوی صاحب خود درمیانے طبقے کے نچلے درجے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اسی طبقے کو وہ انگریز کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھانا چاہتے تھے۔ رہے امراء تو وہ ان کی طرف سے بدظن اور بیزار تھے۔ وہ انہیں نئے دور اور نئی اقدار کا دشمن سمجھتے تھے۔ اور چونکہ جو مادی فوائد وہ خود حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ضمناً امراء کے طبقے کو پہلے ہی سے حاصل تھے۔ اس لئے امراء نہ ان کے مخاطب تھے نہ ہو سکتے تھے۔ البتہ امراء کا رسوخ اور اُن کی وقعت وہ ضرور کم

کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان اقدار پر وار کریں جن پر اُن کا بھرم اور عزّت قائم تھی چنانچہ وہ ایک طرف فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری اور موسیقی کو کہ امراء ان کے سرپرست تھے۔ اپنے ناوک کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور دوسری جانب طبقۂ نسواں میں لباسِ فاخرہ زر و جواہر، شان و شوکت کو نظروں سے گراتے ہیں۔ کہ یہی ساز و سامان دوسروں کی نظروں میں امیر عورتوں کے امتیاز و عزّت کا ضامن تھا۔ وہ اپنے طبقے کے سامنے (Puritanism) ایک سادہ اور مستریٰ زندگی کا نصب العین اس دوہری مصلحت سے پیش کرتے ہیں۔ کہ ایک طرف تو اُنہیں اپنی سادگی اور کم سامانی پر اعتماد پیدا ہو اور شان و شکوہ کا دبدبہ اُن کے دلوں سے دُور ہو۔ اور دوسری جانب وہ روپیہ بچا کر اور کفایت شعاری سے کام لے کر اپنی بنیادیں مضبوط کریں۔ تاکہ اس سیاسی اور سماجی مقابلے میں جو امراء سے پیش آنے والا ہے۔ بقا انہی کے حصّے میں آئے۔ یہی مصلحت فنونِ لطیفہ کی مخالفت میں پیشِ نظر تھی، ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی فن کا اکتساب کسبِ زر سے مانع ہوتا ہے۔ اور ذہن کو مادی اقدار سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ مولوی صاحب کی نگاہ میں حالات کا تقاضا یہی تھا۔ کہ اُن کے طبقے کے زن و مرد دونوں کی توجّہ فنونِ لطیفہ یا امورِ نفیسہ کی بجائے کسبِ زر اور صرفِ زر کی باریکیوں کی طرف منعطف رہے اور وہ مادی اعتبار سے بہت جلد اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں۔ تاکہ وہ خلعتِ شرافت و عزّت جو امراء کے جسم پر ڈھیلا ہو کر کچھ سرک رہا تھا۔ اُن کے بڑھتے ہوئے تن و توش پر راست آ جائے چنانچہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جو مثالی کردار پیش کئے ہیں۔ وہ ان کے انہی نظریوں کے جسمانی مظاہر ہیں۔ پس ہمارے لئے ان کے مطالعے سے پیشتر اُن کے خالق کے مقاصد کا سمجھنا ضروری ٹھہرا۔

تعلیمِ نسواں کے معاملے میں وہ سرسیّد کی عام تعلیمی تحریک سے متاثر نہیں تھے۔ سرسیّد کے سامنے ایک بہت عریض و وسیع تعلیمی منصوبہ تھا۔ اور اگرچہ انہوں نے تعلیمِ نسواں کو براہِ راست اس میں کوئی خاص مقام نہیں دیا۔ لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ عورتوں کی مغربی انداز کی تعلیم اُن کے مردوں کی اسی انداز کی تعلیم کا ایک ضروری ضمیمہ اور نتیجہ ہو گی۔ اور وہ اس کے عین ساتھ لگی ہوئی ہمارے نظامِ معاشرت میں داخل ہو جائے گی چنانچہ شیخ عبداللہ کا زنانہ کالج علی گڑھ کالج ہی کے ایک ضمیمے کی حیثیت سے قائم ہوا۔ لیکن مولوی صاحب کی نگاہیں اپنے طبقے کے دائرے سے پار نہیں جاتی تھیں۔ اور شاید وہ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ اعلیٰ نسوانی تعلیم کے حلقے میں امراء اور اونچے درمیانے طبقے کا اثر غالب آ جائے گا اور اُن کے طبقے کو یہاں نیچا دیکھنا پڑے گا۔ نیز تعلیمِ نسواں سے ان کا فوری مقصود اسی قدر تھا کہ نچلے درمیانے طبقے کی عورتیں اپنا بیشتر وقت اور توجہ اپنی معاشرت کو منظم اور اپنے گھروں کو خوشحال اور آسودہ بنانے میں صرف کریں۔ وہ عورتوں کو غالب اور شیکسپیر سے متعارف کرانے کی بجائے یہ بہتر سمجھتے تھے کہ وہ اچھی خانہ داری کے اسرار و رموز پر حاوی ہو جائیں۔ اور اقلیدس کی اشکال حل کرنے کی بجائے اپنے بجٹ کو متوازن کرنے کی صورتیں نکالیں۔ تاکہ اُن کے مرد اطمینان سے اپنی دنیوی ترقّی کے اُمور میں منہمک رہیں اور بہت جلد ان منزلوں کو جا لیں جو انقلابِ حکومت کے طفیل ان کے سامنے آ گئی تھیں۔

کم و بیش کچھ ایسا ہی اندازِ نظر وہ مذہب کے متعلّق رکھتے تھے۔ عورتوں کے مذہبی فرائض کے متعلّق اُن کا معیار یہی تھا کہ وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند رہیں۔ اور اسی پابندی کے نتیجے میں وہ دنیوی امور میں بھی پابندیٔ اوقات اور پابندیٔ ضوابط پر قادر ہو جائیں۔ اُن کے ہاں ہمیں صبح خیزی کی برکات اور افطاری کی رونقوں کا چرچا جا بجا ملتا ہے۔ اور ثواب و عذاب کے نقشے قدم قدم پر سامنے آتے ہیں لیکن خیر برائے خیر کے تصوّر کا سراغ ڈھونڈھے سے نہیں ملتا۔ وہ مذہبی رسوم و ظواہر کی پابندی کو نجاتِ اُخروی اور فلاحِ دنیوی دونوں کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اپنے طبقے کی عورتوں کو اس سے آگے لے جا کر معصیت میں پریشان کرنا نہیں چاہتے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اُن کی "Scheme of things" نظامِ امور میں جذبات کو کوئی مقام حاصل نہیں۔ اور اگر ہے تو اسی حد تک ہے جس حد تک وہ انسان کی جسمانی اور دنیوی ضروریات کی تسکین سے متعلّق ہیں چنانچہ اپنے

مثالی کرداروں کو انہوں نے یا تو ان سے بالکل محروم کر دیا ہے۔ یا فقط اسی قدر حصّہ دیا ہے۔ کہ وہ اپنے جسمانی وطبعی مسائل کے جائزے میں ان سے بھی کچھ مدد لے سکیں۔ اس لئے اُن کے ایسے کردار دو اور دو چار بلکہ پانچ تو آسانی سے کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ فتوحات جو محض جذبات ہی سے ممکن ہیں۔ اور وہ منازل جو جذبات ہی کے سہارے طے ہوتی ہیں۔ ان کی نگاہِ تصوّر سے بھی مُعدوم رہتی ہیں۔ اصغری خانم اپنی جز رسی کی بدولت خانم کے بازار میں تمیز دار بہو کا وہ عالیشان محل تو کھڑا کر لیتی ہیں۔ جو بقول مولوی صاحب آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ لیکن اپنی پڑھنے والیوں کے دل میں کوئی ایسا گھروندا بھی نہیں پاتیں۔ جس میں ان کے سنہرے سپنے کبھی کبھی سر چھپا لیا کریں۔

اصغری کے کردار کی تعمیر میں مولوی صاحب نے بہت تعجیل سے کام لیا ہے۔ اور یہ تعجیل اس میں شروع سے لے کر آخر تک نمایاں ہے۔ ہم پہلی بار جب اصغری سے متعارف ہوتے ہیں۔ تو وہ گیارہ سال کی ایک بچّی ہے۔ جو اپنے بہنوئی محمد عاقل کی گود میں بیٹھ کر اُن کے اصرار سے ماں کی طرف بالارادہ دیکھ کر اُن سے عیدی کا روپیہ لے لیتی ہے۔ —————— لیکن دوسری صبح جب ابھی سب گھر والے سو رہے ہوتے ہیں۔ جن میں اس کی ماں اور لخندا بہن بھی شامل ہیں۔ تو وہ گھر بھر میں جھاڑو دے کر اور بہنوئی کے وضو کے لئے پانی گرم کر کے فارغ ہو چکتی ہے۔ اور اس کے زکام کے پیش نظر اس کے لئے مسالے دار چائے بھی تیار کر لیتی ہے۔ اور گرم چائے کے ساتھ ساتھ اُسے زکام اور اس کے علاج اور احتیاط و اہتمام پر ایک لیکچر بھی پلا دیتی ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ وہ اسی اکبری کی چھوٹی بہن ہے۔ جو دس بجے سو کر اُٹھتی ہے۔ اور ذرا سی بات پر خفا ہو کر پلنگ پر رکھی ہوئی پٹاری کو لات مار کر بچھونے کو کتھے، چونے سے لت پت کر دیتی ہے۔ عید والے دن شوہر سے فرمائش کر کے جھڑبیری کے بیر منگاتی ہے۔ اور اس کے لوٹنے سے پہلے اپنی سہیلی زلفن کو ساتھ لے ڈولی کر لے۔ پر منگا اپنے میکے پہنچ جاتی ہے۔ پھر اسی سہیلی کی بدولت اپنے ہاں کے برتن اور کپڑے چوری کرا دیتی ہے۔ اور اس کے مہینہ بھر کے اندر اندر اپنا سارا زیور ایک چلتی پھرتی بی حجّن کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور گھر میں کھانا پکانے کی بجائے خود بازار کی چکھوتیوں پر ہیضے مدات کرتی ہے۔ اور شوہر کو ماں کے گھر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ دونوں بہنیں ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد، دونوں ایک ہی ماحول کی پروردہ اور کردار میں زمین آسمان کا فرق۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ کہ وہ ایک بڑی حد تک توریث کا اور تقریباً اتنا ہی تعلیم و تربیت کا اثر قبول کرتی ہے۔ اصغری اور اس کی بہن یہ دونوں عناصر مشترک ہیں۔ اور ان کی ماں جو تربیت کی سب سے بڑی کفیل ہوتی ہے۔ کردار کی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے متصف نہیں ہے چنانچہ وہ داماد کے سامنے اکبری کے بارے میں صاف جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اس کے باوجود اکبری اگر سراپا تقصیر ہے تو اصغری عقل و خیر مجسّم۔ اس معمے کا حل ہمیں اس کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا۔ کہ مولوی صاحب اپنے طبقے کی دنیوی ترقّی کی جو ممکنات اس کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تمثیل کے جوش میں انہوں نے نہ صرف کردار کی تعمیر کے ضروری اور منطقی عناصر کو نظر انداز کر دیا بلکہ خود فطرت کے عمل کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

اصغری کے بچپن اور اس کے شباب میں ہمیں کوئی امتیازی کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ بچپن میں بھی ویسی ہی بوڑھی بڑھیا تھی جیسی جوانی میں۔ چنانچہ جب چائے والے واقعے کے کوئی برس ڈیڑھ برس بعد اُس کی شادی ہوتی ہے۔ اور محمد عاقل اپنی ماں سے اس کے لئے یوں وکالت کرتے ہیں کہ "اماں میں سچ کہتا ہوں، اصغری ہزار لڑکیوں میں ایک ہے عمر بھر چراغ لے کر ڈھونڈو گی تو اصغری جیسی لڑکی نہ پاؤگی۔ صورت، سیرت دونوں میں خدا نے اس کو فائق اور لائق بنایا ہے۔ ہرگز اندیشہ مت کرو۔ بسم اللہ کر کے بیاہ کر ڈالو اور بڑی بہن پر جو خیال کرو تو آپ نے سنا ہوگا ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

اپنا اپنا مزاج ہے اور اپنی اپنی طبیعت ؎

گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہے کیا بہار　　سب کا ہے رنگ الگ الگ سب کی ہے بو الگ الگ

تمہاری بڑی بہو کو لاحول ولا قوۃ اصغری سے کیا نسبت ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ خدا راست لائے بیاہ کے بعد میری بات کا تم کو یقین ہوگا۔"تو ہمیں اگرچہ مصنّف کی طرف سے اصغری کے کردار کی اس کیفیت کا کوئی منطقی جواز ارزانی نہیں ہوتا۔ لیکن ہم صبر شکر کر کے اس صورتِ حالات کو وقتی طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ لُطف تو تب آتا ہے۔ جب عین بیاہ کے قریب اصغری یہ سن کر کہ اسے اپنے والد کے ازدیادِ مراتب و ذرائع کی بدولت اکبری کی بہ نسبت بہتر جہیز دیا جانے والا ہے۔ تو وہ اس کی مخالفت کرتی ہے۔ اور اگرچہ مخالفت کی ظاہری وجہ یہی ہے کہ وہ بڑی بہن سے ناانصافی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن آگے چل کر کھلتا ہے۔ کہ چونکہ اُسے اسی گھر میں جانا ہے۔ جہاں اکبری موجود ہے۔ اور بڑی بہن کے تیور وہ اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اس لئے دُور اندیشی کا تقاضا یہی ہے۔ کہ اسے کسی شرارت یا فساد کا موقع نہ دیا جائے۔ یہاں　یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اس وقت اصغری کی عمر تیرہ برس کی بھی نہیں اور اس سے پانچ برس پہلے سے یعنی آٹھ سال کی عمر سے باپ کے گھر کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے تھی ـــ وہ جو مثل ہے کہ پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ۔ یہاں وہ بھی بے کار ہو گئی ہے۔ اصغری کی پانچوں اُنگلیاں پانچ بلند مینار تھے۔ کہ جن کی ضو سے میکے سے لے کر سُسرال تک اُجالا ہی اُجالا ہو گیا اور چند ہی برس میں یہ اجالا دلی سے لاہور اور لاہور سے سیالکوٹ تک پھیل گیا۔

اس کے بعد اُس کی خانہ داری کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ جو اقتصادی جدّوجہد اور حصولِ مقاصد کی ایک طویل داستان ہے۔ محمد کامل اُس کا شوہر اُس کے ہاتھ میں مٹی کے ایک لوندے کی طرح ہے۔ جسے وہ جس طرح چاہتی ہے ڈھالتی چلی جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں عورت اور مرد کو بار بار گاڑی کے دو پہیوں سے مشابہ قرار دیا ہے۔ لیکن مراۃ العروس اور بنات النعش کی شاہراہ پر ہمیں ایک ہی پہیے والی گاڑی نظر آتی ہے۔ جو شاید مولوی صاحب کے بتائے ہوئے کسی وظیفے کی تائید سے چلتی ہے۔ چلتی کیا دوڑتی ہے اور ترقیوں کے فرسخ و میل آن کی آن میں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ بعض دفعہ مجھے ایسا بھی محسوس ہوا ہے کہ اصغری کے اقتصادی منصوبے کی گاڑی ایک ٹرائیسکل کی مانند ہے۔ جس کا اگلا اور بڑا پہیہ وہ خود ہے۔ اور پچھلے دو پہیے اس کے شوہر اور اس کے خُسر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اصغری کی جارحانہ شخصیت مولوی صاحب کی اپنی شخصیت کا عین من و عن چربہ ہے۔ اور اس کے کردار کی فائدہ پرستانہ کیفیت بھی انہی کے مزاج اور نصب العین کا عکس۔ وہ پردے میں بیٹھ کر اس خصوص میں وہ وہ فتوحات کر لیتی ہے جو چنگے بھلے باہوش مردوں سے بھی ممکن نہیں۔ چنانچہ گنبے کے ساہوکار سے معاملہ کرنا اور اسے مات دینا۔ محمد کامل کی ملازمت اور ترقی کے سارے مدارج طے کرنا۔ اس کے دوستوں اور حاشیہ نشینوں کو نکال باہر کرنا۔ نوابوں کے خاندان سے اپنی نند محمودہ کا پیوند لگانا اور اپنے غیر معمولی اقتصادی سلیقے اور جوڑ توڑ سے ایک بڑی جائداد کا کھڑا کر لینا۔ انیسویں صدی کی ایک پردہ دار خاتون سے جو ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ اگر جس کے شوہر کی تنخواہ دس روپے سے اور ملازمت روزنامچہ نویسی سے شروع ہوئی ہو۔ کیونکر ممکن ہے۔ میرے پاس اس کا جواب یہی ہے۔ کہ یہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح خود مولوی صاحب کچہری کی اہل کاری سے بڑھتے بڑھتے حیدر آباد کے بورڈ آف ریونیو کے ممبر بن گئے۔ اور پھر تجارت کی ریوڑی کے پھیر سے لاکھوں کے پھیر میں چلے گئے۔ مولوی صاحب نے اپنی ہیروئن میں فائدہ پرستانہ کردار کے محاسن اتنی بڑی تعداد میں اور اچھے کوٹ کوٹ

کر بھرے ہیں۔ اور اسے انسانی جذبات اور کمزوریوں سے اس حد تک محروم کر دیا ہے۔ کہ ایک عام ناظر کو اس سے کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ اور محاسن کا اژدھام اور کمزوریوں کا فقدان اُسے بے جان کر کے رکھ دیتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں اکبری اُس سے بہت زیادہ جاندار ہے۔ اور اُس کی برائیاں اور کمزوریاں، خواہ اُن میں کیسا ہی مبالغہ ہے۔ اُس کی شخصیت میں ایک جذب اور کشش ضرور پیدا کرتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہیروئن کو اس جنسِ گراں قدر سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اور اُسے محض اس مشکوک مدح وتحسین پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ جو اس کے خالق کے خیال کے مطابق اس کی اقتصادی اور تنظیمی معرکہ آرائیوں پر اُسے ملنی چاہیے۔ لیکن جس کا کوئی منطقی جواز اس نے پیش نہیں کیا۔ ہمیں تعجب ہے کہ راشد الخیری نے بھی جو نذیر احمد سے بدرجۂ غایت متاثر تھے اپنی ہیروئن کے کردار کی تعمیر میں جذباتی اندازِ نظر اختیار کیا اور اس میں بے حد کامیاب رہے شام زندگی کی ہیروئن نسیمہ کا کردار اگرچہ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہے لیکن وہ اس وصف سے بدرجۂ اولےٰ ممتاز ہے۔ جو کسی ہیروئن کا پہلا حق ہے۔ یعنی ناظر کی ہمدردی جو ہیروئن کو درحقیقت ہیروئن بناتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ مصنّف کی کوئی کاوش اور کسی قسم کی صنعت گری کسی کردار کو مصنوعی زندگی اور قبولیت عطا نہیں کرسکتی تاآنکہ اُسے اپنے ناظرین کا جوابی تعاون اور ہمدردانہ ردِ عمل حاصل نہ ہو۔ اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی تخلیق کو زندگی کے حقیقی سانچوں میں ڈھالے اور اس بات کا اہتمام کرے کہ اُس کے کردار کے دل کی ہر دھڑکن اُس کے ناظر کے دل کی ہر دھڑکن سے ہم آہنگ ہو جائے یہی فن کی معراج اور یہی اس کا فوزِ عظیم ہے۔ افسوس ہے کہ اردو کا پہلا ناول نگار اپنے سب سے نمایاں کردار کی تعمیر میں اس معیار کو نہ پہنچ سکا لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کے پیشِ نظر نہ کہانی لکھنا تھا اور نہ کسی فنّی احساس کی ترجمانی کرنا۔ وہ محض ایک نظریہ ساز تھا۔ اور اسے افسانے سے اپنے نظریات اور مقاصد کی تبلیغ کا کام لینا تھا۔ از بسکہ وہ زبان کا ماہر اور مکالمے کا بادشاہ تھا اور اس نے اپنی تبلیغ کے لئے عورتوں کا حلقہ انتخاب کر لیا تھا۔ اور عورتوں کو مزیدار باتیں کہنا اور مزیدار باتیں سُننا دونوں مرغوب ہیں۔ چاہے ان میں حقیقت اسی قدر ہو جتنی اُن کی ہنڈیا میں نمک، اس لئے جب وہ خود ان کی کہانی انہی کی زبان میں بیان کرنے لگا۔ درآں حالیکہ اس سے پہلے انہوں نے جنات اور پریوں اور بادشاہوں اور شہزادیوں کی کہانیوں کے سوا اور کوئی کہانی نہیں سنی تھی۔ تو انہوں نے اُسے کمال توجہ سے سُنا اور اس کی تخلیقات کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کلیجوں سے لگایا۔ اُن میں سے ایسی تو شاید ہی کوئی نکلی ہو جسے سچ مچ اصغری بننے کی توفیق ارزانی ہوئی ہو۔ ہاں انہوں نے اپنی بہت سی بچیّوں کا نام اصغری رکھ دیا۔ اور اگر کسی بچّی کا نام اکبری تھا تو اسے جھٹ سے بدل دیا۔

لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ مولوی صاحب نے خانگی زندگی کا جو سانچہ پیش کیا تھا۔ اُس میں ہمارے پچھلے وسیلے طبقے کی آسودگی اور خوشحالی خوب ڈھلی۔ اور اُنیسویں صدی کے آخر سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک ڈھلتی ہی چلی گئی۔ تاآنکہ موجودہ دور کے عوامل نے زندگی کی قدروں میں ایک بنیادی انقلاب برپا کر دیا۔ اور آج ہماری گزشتہ قدریں مستقبل کی قدروں سے لرزہ براندام ہیں۔ اور ہمارے عمرانی نظام کی باگ ڈور درمیانے طبقے کے ہاتھوں سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ آج اصغری کی اپیل بے کار ہو چکی ہے۔ منفعت بازی اور سرمایہ اندوزی کا دَور گزر چکا ہے۔ اور آج کی عورت اپنی زندگی کے دور دراز افق پر ایک ایسا چھوٹا سا نشان دیکھ رہی ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جو شاید اُس کے لئے آزادی، مساوات اور معاشی فراغت کا ایک پیامِ تازہ لے کر آ رہا ہے۔

طفیل احمد خاں

جدید تاریخ نویسی

پاکستان کے مرکزی کابینہ کے وزیر جناب فضل الرحمن صاحب نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں (بمقام پشاور) نئی تاریخ نویسی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور پاکستان کی نئی تعلیمی ضرورت سے اس کا تعلق واضح کیا ہے۔ اب مرکزی محکمہ تعلیم و صنعت کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ تاریخ کے موجودہ نصاب کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے اور تاریخ کی نئی کتابیں لکھوانے کا انتظام کرنے کے لئے ایک مجلس ادارہ قائم کر دی گئی ہے۔

جہاں تک تاریخ کی نئی کتابیں لکھنے کا تعلق ہے اس کی ضرورت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں جس طرح اس ضرورت کا پس منظر بیان کیا ہے اور نئی تاریخ نویسی کے جو بنیادی اصول بتائے ہیں۔ وہ مشتبہ اور مشکوک سے ہیں۔ ان سے اس امر کا بالکل یقین نہیں ہوتا کہ یہ نئی تاریخ نویسی پرانی تاریخ نویسی سے بنیادی طور پر کوئی مختلف چیز ہوگی۔ میری رائے میں وزیر موصوف نے جس قسم کی تاریخ نویسی تجویز کی ہے۔ وہ پرانی ہی تاریخ نویسی کی ایک بگڑی ہوئی اور بھدی سی شکل ہوگی۔ نئی تاریخ نویسی کے جو خد و خال واضح کئے گئے ہیں ان کا عہد جدید کی سائنسی تاریخ نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے پرانی تاریخ نویسی سے وزیر موصوف کو یہ شکایت ہے کہ اس میں انگریزوں اور ہندوؤں کے تعصبات کار فرما ہیں۔ اس میں انگریزوں کی سامراجی اور ہندوؤں کی فرقہ وارانہ عظمت کو اچھالا گیا ہے۔ اور ہندوستان کے تہذیب و تمدن کے ارتقا میں مسلمانوں نے جو شاندار حصہ لیا ہے اس کو دیانتداری کے ساتھ نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر موصوف نے نئی تاریخ نویسی کی ساری بنیاد اس چیز پر رکھی ہے کہ اب تاریخ کی جو نئی کتابیں لکھی جائیں۔ اس میں انگریزوں اور ہندوؤں کی بجائے مسلمانوں کی عظمت کو نمایاں کیا جائے۔ ان کے ذہن میں پرانی اور نئی تاریخ نویسی کے درمیان صرف اتنا فرق ہونا چاہیئے۔ اور بس ان کو اس کے علاوہ پرانی تاریخ نویسی میں اور کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ اول تو مجھے اس امر سے انکار ہے کہ انگریز اور ہندو مصنفین نے ہندوستان کی جتنی تاریخیں لکھی ہیں وہ سب کی سب قومی اور فرقہ وارانہ تعصبات سے لبریز ہیں۔ اور ان میں سے کسی میں بھی مسلمانوں کے تہذیبی اور تمدنی حصے کو دیانت داری کے ساتھ نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ بہر حال مجھ کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی بہت سی تصانیف میں قومی اور فرقہ وارانہ رنگ ضرور موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ مسلمانوں نے جو تاریخیں لکھی ہیں۔ ان میں بھی قومی عصبیت کار فرما ہے۔ تو وزیر موصوف کی نئی تاریخ نویسی جس کا اس قدر شاندار اور پرشکوہ اصطلاحوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ کل بس اتنی ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں مسلمانوں کے تعصبات انگریزوں اور ہندوؤں کے تعصبات کی جگہ حاصل کر لیں۔ میں اسے کوئی نئی تاریخ نویسی قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بلکہ اسے سائنسی دیانت داری کے منافی قرار دیتا ہوں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے طلبا کے ذہنی ارتقا میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ بلکہ ان کے معصوم ذہنوں کو اس قماش کی تاریخ نویسی سے سراسر نقصان پہنچے گا۔

جس طرح ہم معاشی عمل کے میدان میں بین الاقوامی رجحانات سے خود کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح علم و ادب کے میدان میں بھی آج عالم گیر حیثیت سے تاریخ نویسی اپنے ارتقا کی جس منزل پہ پہنچ چکی ہے۔ اس سے اگر ہم اپنے فن تاریخ نویسی کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے تو ہمارے طلبا پر بہت بڑا ظلم ہوگا۔ لیکن وزیر موصوف کی تقریر سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ وہ نہ تو پرانی تاریخ نویسی کی خامیوں اور خرابیوں سے واقف ہیں اور نہ نئی تاریخ نویسی کے مسائل سے اگر ہم اپنی تاریخ نویسی کو سائنٹیفک بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کو ہر قسم کے قومی اور فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک کرنا ضروری ہے۔ جدید تاریخ نویسی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے جو اسے پرانی تاریخ نویسی سے ممیز کرتی ہے کہ اس میں سے ہر قسم

کی داخلیت کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ قومی تعصبات، مصنفین کی داخلیت پسندی ہی کے ذریعے تاریخ کی کتابوں میں داخل ہوتے ہیں۔ مورخین کے لئے معروضی نقطۂ نظر پیدا کرنا ضروری ہے۔ داخلیت ہی کے اخراج کے بعد سے تاریخ نویسی غالباً تخلیقی ادب کا حصہ نہیں رہی بلکہ سائنسی [illegible] اور کارلائل نے جس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی تھی اس کا دور ختم ہو چکا۔ تاریخ نویسی آرٹ نہیں بلکہ سائنس ہے جسے عام سوشل سائنس کا ایک اہم شاخ قرار دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی سائنس ہے جو دوسرے سوشل سائنسوں کا محتاج ہے مثلاً عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ

جدید تاریخ نویسی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ واقعات و حالات کو نہ صرف بیان کر دیا جائے۔ بلکہ اُن کے بنیادی سماجی اسباب و علل بھی واضح کئے جائیں۔ یہاں پر اشتراکی فلسفۂ تاریخ کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔ مارکسیت کے عروج نے سائنس اور فلسفہ کے غیر فطری فرق کو مٹا دیا ہے۔ اور فلسفہ کو سائنس کا درجہ بخش دیا ہے۔ چنانچہ اب جو بہت سے متضاد اور متصادم تاریخی فلسفوں کی گنجائش نہیں رہی۔ دو متضاد اسباب ایک ہی واقعہ پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے دو متضاد فلسفۂ تاریخ بھی نہیں ہو سکتا۔

بیسویں صدی کے وسط میں جبکہ تاریخ نے ایک مستقل اور باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ طالب علموں کو فلسفۂ تاریخ کے پٹے ہوئے بے جان نظریے پلانا ان پر ظلم کے مرادف ہے۔ تاریخی واقعات کسی ان دیکھی آسمانی قوت کی خواہشات سے نہیں پیدا ہوتے بلکہ اجتماعی حیثیت کو قائم اور برقرار رکھنے کی انسانی کوششوں سے جن کی مخصوص شکل اب تک طبقاتی جدوجہد رہی ہے۔ فلسفۂ تاریخ میں مادی جدوجہد کے تصور نے ان دیکھی آسمانی قوت کے تصور کی جگہ لے لی ہے۔ اگر ہم تاریخ کی ایسی کتابیں نہ تیار کرا سکے جن میں تاریخی حالات و واقعات کے مادی اسباب و علل کی منظم اور سائنٹفک تشریح کی گئی ہو۔ تو ہم طالب علموں کے ذہن میں غیر عقلیت پھیلانے کے موجب ہوں گے۔ اور یہ دماغ اور علم دونوں کے ارتقا کے منافی ہے۔ اور ہم اپنی تاریخ نویسی کو دنیا کی ترقی یافتہ تاریخ نویسی سے ہمدوش نہیں کر سکیں گے

وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں تاریخ نویسی کو "اسلامی بنیادوں" پر ڈھالنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر "اسلامی تاریخ نویسی" سے وزیر موصوف کی یہ مراد ہے وہ تاریخ نویسی جو عہدِ متوسط کے بڑے بڑے عرب مورخین نے تخلیق کی تھی تو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ عرب تاریخ نویسی کے کس رجحان کی طرف اُن کا اشارہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عہدِ متوسط کے عرب مورخین نے عظیم الشان اور شاندار تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی ہے۔ تاریخ نویسی کے اس سائنس اور آرٹ کی جس کی ابتدا ہیروڈوٹس، تھوسی ڈی ڈیز اور سیسرو نے کی تھی۔ اسے ابن خلدون نے پروان چڑھایا اور میکاولی، وی کو، مونٹسکیو، گبن اور کارلائل نے عرب تاریخ نویسی سے استفادہ کیا تھا۔ لیکن کیا وزیر موصوف کو اس حقیقت کا علم ہے۔ کہ ابن خلدون نے جس فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس میں مادیت کا زبردست رجحان پایا جاتا ہے اور اس نے معاشی طاقتوں کو بڑی حد تک تاریخی اسباب و علل قرار دیا ہے۔ اس زمانے میں یورپ جاگیرداری اور اسکولاسٹسزم میں مبتلا تھا۔ ابن خلدون نے یہ کہا کہ قومی تفریق کا اساس پیشوں کے امتیاز پر مبنی ہے" (ہرد و لی جینا) لیکن ابن خلدون جس مادی توجیہہ تاریخ اور جس غیر دینی نقطۂ نظر کا قائل تھا اُسے یورپ نے پروان چڑھایا۔ مارکس کی تاریخی مادیت میں ہمیں اس کی تکمیلی اور سب سے زیادہ سائنسی شکل نظر آتی ہے۔ اگر اسلامی تاریخ نویسی سے وزیر موصوف کی مراد عرب تاریخ نویسی ہے اور عرب تاریخی نویسی کا وہ مادی رجحان جس نے یورپ میں عروج حاصل کیا۔ اور کارل مارکس نے اسے تکمیلی شکل عطا کی تو ان کا مشورہ سر آنکھوں پر۔ لیکن ہمیں اس کا یقین ہے کہ وزیر موصوف کی یہ مراد نہیں تھی۔ تاہم اس سے اس چیز کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ کہ ہمیں اپنی نئی تاریخ نویسی کی عمارت تاریخ کی مادی توجیہہ پر کھڑا کرنا چاہیئے۔ ورنہ پرانی اور فرسودہ تاریخ نویسی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نئی تاریخ نویسی کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ افراد اور اشخاص کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ بلکہ اجتماع کی زندگی کی نقل و حرکت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ فرد اور اجتماع کے درمیان خارجی طور پر تقابل کی کوئی صورت [illegible] نہیں ہے۔ اجتماع سے علیحدہ رہ کر فرد تاریخی واقعات و حالات کو جنم نہیں دے سکتا۔ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ انفرادی قوتیں اور بنیادی معاشی طاقتیں ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل

سے تاریخ کے تاروپود بنتے اور بکھرتے ہیں۔ بنیادی ڈھانچہ اُن معاشی طاقتوں سے تیار ہوتا ہے جس میں اگرچہ انسان نے پیدا کیا ہے لیکن ذاتی ملکیت والے سماج میں وہ طاقتیں فرد کے دستِ قدرت سے نکل بھاگی ہیں۔ اور وہ ان کے منطقی نتائج کی گرفت میں بے بس ہے۔ فرد اس ڈھانچے پر گوشت پوست مرتب کرتا ہے۔ اور اُن معاشی طاقتوں کو ان کے منطقی نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ انسان خود اپنے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی اندھی معاشی طاقتوں کی گرفت سے اگر آزاد ہوسکتا ہے۔ تو صرف غیر طبقہ وارانہ سماج میں۔ اس لئے تاریخ نویسی میں فرد سے زیادہ اجتماعی زندگی پر زور دینا ہے۔ اب تک ہمارے ذہن میں جس قسم کی تاریخ ٹھونسی گئی ہے۔ اس میں اجتماع کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ اور فیوڈل سوسائٹی کے بادشاہوں اور حکمرانوں سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ تو دراصل ایک اصطلاح ہے۔ فلسفہ سے لے کر تکنیک تک کی تاریخ ہوسکتی ہے اور ہے اب تک تاریخ سے صرف سیاسی تاریخ مراد لی گئی ہے۔ لیکن اب ہمیں تاریخ کو یہ مفہوم پہنانا ہے۔ کہ اجتماع کی پوری زندگی کی تاریخ جس میں آلاتِ پیدائش، معیشت، سیاست، سماج اور کلچر ان تمام چیزوں کی ابتدا اور عروج بتایا جائے۔ طالب علم کے سامنے اجتماع کی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کر دیا جائے۔

کیا ذیرِ موصوف کی نگاہوں میں تاریخ نویسی کے یہ تمام مسائل موجود ہیں؟ اگر ان اصولوں پر نئی تاریخیں لکھی جائیں۔ جب تو نئی تاریخ نویسی کہلائے گی۔ ورنہ وہ پرانی اور فرسودہ تاریخ نویسی کی ایک نئی شکل ہو گی۔ جس میں یہ کہنے کی بجائے کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو قتل کرایا یہ کہا جائے گا کہ شیواجی نے مسلمانوں کو قتل کیا۔

"تاریخ نہ تو کسی پہلے سے قسمت میں لکھی ہوئی میکانکی حرکت کا نام ہے اور نہ وہ رہٹ کی طرح ایک دائرے میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ ایسا رہٹ جو ایک دائمی مشقت کرنے والے تاریخی گدھے یعنی انسان کے ہاتھوں پانی بھرتا رہتا ہے۔ اور پانی انڈیلتا رہتا ہے۔ انسان مادی فطرت ہی کی پیداوار ہے۔ اور زندہ رہنے کے لئے اسے اس کے خلاف جنگ بھی کرنی پڑتی ہے۔ پہلے اسے غذا، پناہ گاہ، لباس وغیرہ کے لئے جنگ کرنی پڑی۔ یہی اس کا بنیادی عمل ہے۔ یہاں اس کی حالت کا تعین پیداوار کی قوتوں اور پیداوار کے ان اوزاروں سے ہوتا ہے۔ جنہیں وہ ترقی دیتا ہے۔ انسان سماجی انسان کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ اور اس کا سماجی ڈھانچہ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ اس کے تعلقات کا دار و مدار بنیادی طور پر پیداوار قوتوں پر ہوتا ہے"

(ایس اے ڈانگے)

صوفی غلام مصطفٰے تبسم

مرزا غازی بیگ ترخان

مرزا غازی بیگ ترخان ۔ مرزا جانی بیگ ترخان حاکمِ ٹھٹہ کا لڑکا تھا ۔ ان کے بزرگوں میں ایک بزرگ شنگل بیگ ترخان تھے جن کے والد کو تیمور صاحب قران کے عہد میں اُن کی جوانمردانہ خدمات کے صلے میں ترخان کا لقب عطا ہوا ۔

یہاں سے اُن کا سلسلۂ نسب چند پشتوں کے بعد ارغون خان بن اباقاخان بن ہولاکو خاں تک پہنچتا ہے ۔ مغل سلاطین کا دستور تھا کہ وہ اپنے سعادت مند اُمرا ۔ اور ملازمانِ دربار سے چند مخلص اور خیر خواہ خدمت گزار حضرات کو اُن کی خاص خدمات کے صلے میں ترخان کے ممتاز لقب سے نوازا کرتے تھے ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ چنگیز خاں نے اپنے دو افسروں قشلیق اور باتا کو اس بنا پر کہ انہوں نے اُسے دشمنوں کے بارے میں بروقت مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں یہ اعزاز بخشا تھا ۔ اُن کے خاندان میں ان بلند پایہ بخششوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا ۔ یہاں تک کہ تیمور کے عہد میں اس لقب کے امتیاز و اعزاز میں وسعت پیدا ہو گئی ۔ بالعموم اس اعزاز کا مفہوم یہ ہوتا تھا ۔ کہ ترخان کو جملہ ٹیکس معاف کر دیئے جاتے تھے ۔ اور وہ بے روک ٹوک جب چاہتے بادشاہ کے حضور میں جا سکتا تھا ۔ کسی دربان یا حاجب کی مجال نہ تھی کہ اُسے روک سکے ۔ رفتہ رفتہ یہ رعایات یہاں تک بڑھ گئیں کہ ترخان کے ہاتھوں اگر کوئی قتل ہو جاتا تھا تو اس سے مواخذہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسے خون نو تک معاف ہوتے تھے ۔

انہی ترخانوں میں بعض کو اختصاصی اعزاز بھی نصیب ہوتا تھا جس کی ظاہری صورتیں سات ہوتی تھیں ۔

طبل ۔ تومان توغ ۔ نقارہ ۔ چتر بردار و قور بردار ۔ شکارگاہ قرق ۔ بزرگی الوس جس کی تفصیل یہ ہے ۔

طبل اور نقارہ ۔ ایک ہزار سوار کی فوج چتر اور ترکش بردار کا ہمراہ ہونا کسی شکار گاہ میں داخل ہو کر وہاں آنے والوں سے خدمت لینے کا حق ۔ اور اپنے قبیلے کی سرداری ۔ بے شک یہ بہت بڑا اعزاز اور بہت بڑی رعائتیں تھیں ۔ انہی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے شیخ ابو الفضل ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

آنکہ تا نہ گناہ ہر گونہ کہ باشد پرسند ہما نا بشائستگی پیوندے ندارد" اگر بزرگان دو دمین نہ آزموں فرا گرفتہ باشند کہ از دن کو سیاہ کارے سر بر تمند لختے گنجائی دارد

یعنی اس طرح تو لغزشوں کا معاف کر دینا شائستگی کی دلیل نہیں ۔ ہاں البتہ اگر مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ کوئی نیک کام سرانجام نہ دیں ۔ تو الگ بات ہے ۔

مرزا غازی کے والدِ بزرگوار مرزا جانی بیگ کے جدِ چہارم میرزا عبد العلی دبن عبد الخالق) کو حکومت بخارا سپرد ہوئی تھی ۔ اور وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح قبیلے کے سردار بھی تھے ۔ اس اعتبار سے ترخان کا لقب ان کے خاندان میں مدت سے میراث میں چلا آتا تھا ۔ شیبانی خاں اوزبک اسی کا ملازم تھا لیکن جب وہ زور پکڑ گیا ۔ تو اس نے اپنے آقائے ولی نعمت اور اس کے پانچ بچوں کو قتل کرا دیا ۔ چھوٹا لڑکا میرزا عیسیٰ ترخان اس وقت صرف چھ مہینے کا تھا ۔

ہمایوں بادشاہ اپنی ناکامی کے دنوں میں جب بھکر کے پاس سے گزرے تو شاہ حسین ارغون بن شاہ بیگ ارغون ٹھٹہ کا حاکم تھا ۔ ہمایوں بادشاہ کے ساتھ باوجود دوستانہ مراسم کے بے التفاتی سے پیش آنا اور پھر ناصر مرزا (عمِ بادشاہ) سے ساز باز کرنے کا واقعہ مشہور ہے ۔ اس کے امراء نے اس سے تنگ آ کر میرزا عیسیٰ ترخان کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا ۔ اور اس واقعہ کے بعد اس خاندان کا اقتدار اس علاقے میں مستقل طور پر قائم ہو گیا ۔ یہاں تک میرزا کے

بعد اس کا میرزا محمد باقی اور اس کے بعد اس کا فرزند مرزا جانی بیگ تخت نشین ہوا۔ جو مرزا غازی بیگ کا والد تھا۔

اس خاندان میں بہادری، مردانگی اور جفاکشی کے ساتھ ساتھ بعض اور خصوصیات بھی وابستہ تھیں۔ ان کی طبائع اور عادات میں اعتدال نہ تھا وہ تقریباً سب کے سب شراب نوشی کے عادی تھے۔ اور بے طرح پیتے تھے جس سے اُن کے خاندان کے اکثر افراد مختلف امراض میں مبتلا ہوئے۔ اور انہی سے اُن کی موت واقع ہوئے۔

سنہ ۹۹۳ھ (مطابق سنہ ۱۵۸۵ء) میں مرزا محمد باقی نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کا بیٹا مرزا پائندہ محمد دیوانہ ہو گیا تھا۔

مرزا غازی بیگ اور اس کے والد مرزا جانی بیگ دونوں میں بہادری اور جواں مردی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی چنانچہ اکبر بادشاہ کے عہدِ سلطنت میں بالخصوص جب اکبر بادشاہ پنجاب میں آتے۔ تو وہ کبھی ملاقات کے لئے حاضر نہ ہوتا۔ تخت نشین ہونے پر مسلسل چھ سات سال تک وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرتا رہا۔ اکبر کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔ یہاں تک سنہ ۹۹۹ھ میں جب عبدالرحیم خاں خانان کو قندھار کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ تو حکم ہوا کہ میرزا جانی بیگ سے قاصدوں یا مراسلات کے ذریعے اس امر کی اطلاع کر دی جائے اور اگر وہ اس پر اطاعت قبول کرنے پر رضامند نہ ہو تو قندھار سے واپسی پر اس کی سرزنش کی جائے۔

خان خاناں اور مرزا جانی بیگ کی جنگی کارگزاریاں اکبری عہد کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے جس میں دونوں کے سیاسی تدبر، لطائف الحیل بہادری شجاعت اور دور بینی کا مقابلہ اور کشمکش کا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن اس کشمکش میں خان خاناں غالب آئے سنہ ۱۰۰۱ھ میں مرزا جانی بیگ نے اطاعت قبول کر لی۔ اور دوسرے سال ہی وہ لاہور میں بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ اکبر نے اس کے خاندانی وقار اور روایات اور اس کی ذاتی صفات کی بنا پر اس کی بے حد قدردانی کی اور سہ ہزار کا منصب عطا کیا۔ اور صوبہ ملتان کی جاگیر دے دی۔

ایک مرتبہ جب ارغونیہ افراد نے سر اٹھایا تو مرزا جانی کی خدمات کے صلہ میں اکبر بادشاہ نے سندھ کی حکومت اُسے واپس مل گئی اور منصب سہ ہزار سے سہ ہزار پانصدی ہو گیا۔

سنہ ۱۰۰۸ھ (سنہ ۱۵۹۹ء) میں جب مرزا جانی بیگ نے برہان پور کے مقام پر مرضِ سرسام کے باعث وفات پائی تو اس کے بیٹے مرزا غازی بیگ آبائی حکومت پر سرفراز کیا گیا۔

مرزا غازی بیگ تخت نشین ہوتے ہی بہت سی فوج جمع کر لی چونکہ شہزادہ بہت جواں عمر تھا۔ اس لئے سلطنت کے دیرینہ وزیر خسرو خاں چرکس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اور اس پر مرزا غازی بیگ اور خسرو خاں میں شدید اختلافِ رائے رونما ہوا۔ اور نزاع تک نوبت پہنچی۔ اکبر نے سعید خاں کو اس مملکت کے نزاع کو رفع کرنے کے لئے روانہ کیا۔ بادشاہ کو شبہ تھا کہ خسرو خاں اور مرزا غازی بیگ دونوں ایک ہی سازش میں شریک ہیں۔ مرزا نے دوراندیشی سے کام لے کر فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور بھکر میں آکر سعید خاں سے ملا۔ اور پھر اُسی کے ہمراہ شاہی حضور میں پہنچا۔ بادشاہ نے مراسم دیرینہ اور مرزا کے والد کے پہلے تعلقات کے پیشِ نظر خسروانہ الطاف و عنایات سے ٹھٹھ کی حکومت بحال رکھی۔

اس وقت مرزا کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔

سنہ ۱۰۱۴ھ (سنہ ۱۶۰۵ء) میں جب جہانگیر تخت نشین ہوا۔ تو مرزا غازی بیگ کی قسمت کا ستارہ اور بھی چمک اٹھا مرزا کی بہن کی شادی خانخاناں کے صاحب زادے ایرج مرزا سے ہو چکی تھی اور اسی طرح اسی خاندان کی بہت سی لڑکیاں شہزادوں کے عقد میں آچکی تھیں۔ کچھ ان رشتوں کی بنا پر اور کچھ ہم عمری کے اعتبار سے جہانگیر مرزا غازی کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ مرزا کی مسلمہ قابلیت اور ادب نوازیاں بادشاہ کو بہت مرغوب تھیں۔ اس لئے اس کے منصب و جاہ میں بہت جلد اضافے پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک آدھ سال کے اندر ملتان کا صوبہ اس کی ایالت میں شامل کر دیا گیا۔ ساتھ ہی فرزندی کا خطاب اور ہفت ہزاری کا بلند منصب بھی عطا ہوا۔

قندھار کا صوبہ اس زمانے میں خاص سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ ایران کے صفوی بادشاہوں اور مغلوں میں دیرینہ دوستانہ تعلقات قائم تھے جن کی ابتدا سلطان حسین مرزا بایقرہ حاکم خراسان جو بابر کا خالو تھا۔ ہو چکی تھی۔ اور جن کی بنا پر شاہ طہماسپ نے ہمایوں بادشاہ کا خیر مقدم کیا تھا۔ ان دوستانہ تعلقات کے علاوہ صفوی بادشاہ کو عثمانی بادشاہوں سے برسرِ پیکار رہنے کے باعث مشرقی حدودِ سلطنت سے بے فکر ہونا ضروری تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ بیک وقت انہیں دو زبردست حریفوں سے الجھنا پڑے۔ لیکن اس عہد میں کبھی قندھار کا صوبہ مرکزِ مخاصمت اور جنگ وجدل کی آماجگاہ بن جاتا تھا۔ گرد و نواح کے سردار اور چھوٹے چھوٹے صوبوں کے حاکم کبھی کبھی سر اٹھاتے اور قندھار پر حملہ کر دیتے تھے۔ چنانچہ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں جب حسین خاں شاملو کو شکست دی گئی۔ گرد و نواح کے تمام سرکش سرداروں اور اُن کے قبیلوں کو رام کر لیا۔ انہی سعادت مندیوں کی بنا پر جہانگیر نے اُسے قندھار کا والی بنا دیا۔ یہ مرزا کی زندگی میں اس کی ترقیوں اور سرفرازیوں کا معراج تھا۔

مرزا نے قندھار میں رہ کر صفوی بادشاہ عباس اعظم سے دوستانہ تعلقات کو اور بھی استوار کیا۔ اس میں کچھ اس کی ذاتی شخصیت کی کشش بھی شامل تھی انجمن آرائے عباسی میں اس کی قابلیت، جوہر شناسی اور مدبرانہ طرزِ حکومت اور سعادت مندی کی تعریف جگہ جگہ کی گئی ہے۔ عباس اعظم اور اس کے درمیان ذاتی مراسلات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سرکاری اعزاز کے طور پر شہنشاہ عباس نے دو مرتبہ اُسے خلعت عطا کیا۔

مرزا غازی کا باپ مرزا جانی بیگ شعر و ادب اور علم و فضل کا دلدادہ تھا اور اربابِ فضل و کمال کی حوصلہ افزائی اور تربیت اس کا عام شیوہ تھا۔ علماء اور شعراء کی تربیت میں وہ دولت صرف کرنے میں کوئی دریغ نہ کرتا تھا۔ اور اس بارے میں اس کی فیاضیاں تیموری خاندان کی شاہی فیاضیوں سے کم نہ تھیں۔ جب خان خاناں نے اس پر فتح پائی اور ملا شکیبی نے اس کی مدح میں مثنوی لکھ کر نذر گزاری تو خان خاناں نے ایک ہزار اشرفی کا نذرانہ شاعر کے حضور میں پیش کیا۔

شاعر نے اس غیر معمولی توجہ کا سبب پوچھا تو اس نے اس مثنوی میں سے ایک شعر پڑھ کر سنایا۔

ہمائے کہ بر اوج گردے خرام　　گرفتی و آزاد کردی ز دام

اور کہا کہ رحمت خدا مرا ہما گفتی اگر شغال میگفتی زبانت کہ می گرفت؟

یعنی اللہ کا شکر ہے۔ تو نے مجھے ہما کہا۔ اگر گیدڑ کہہ دیتے تو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

باپ کی طرح مرزا غازی بھی نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھا۔ بلکہ ادب نوازیوں میں اس سے کہیں آگے بڑھ گیا تھا۔ اس عہد میں جو شاعر یا ادیب ایران سے چل کر ہندوستان میں آنے لگتے تو سب سے پہلے اسی کا دربار اور اسی کی شہرت اس کی دامنگیر ہوتی تھی۔ اور پھر ایک بار جو اس کے دربار سے وابستہ ہو جاتا مشکل سے کسی اور جگہ جانے کا نام لیتا تھا۔ طالب آملی جو بعد میں اعتماد الدولہ اور جہانگیر کی سرکار میں پہنچا اور بادشاہ نے اُسے ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اور جب تک اُدھر اُدھر رہا اس کی طبیعت میں اطمینان نہ پیدا ہو سکا۔

مرزا کے دربار سے بہت سے شاعر وابستہ تھے جن میں سے ملا مرشد، طالب آملی، میر نعمت اللہ وصلی، ملا اسد قصہ خوان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں

طالب آملی نے کئی بلند پایہ قصیدے جہانگیر اور اعتماد الدولہ کے تعریف میں لکھے لیکن جو قصیدے مرزا غازی بیگ ترخان کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ وہ بات کہیں اور جگہ نظر نہیں آتی۔

مرزا غازی بیگ باپ کی طرح شاعر بھی تھا باپ کا تخلص حلیمی تھا اور اسی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص وقاری رکھا تھا۔ اور اس کی شاعری کا پایہ اتنا بلند سمجھا جاتا ہے کہ تذکرہ نگار اسے اپنے تذکروں میں درج کرتے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تھوڑی سی مدت میں کم و بیش پانچ ہزار شعر کہے تھے۔ جن میں ایک ساقی نامہ بھی تھا۔ جس کی بنا پر ملا [illegible] نے اُسے

اپنی کتاب میخانہ میں جگہ دی ہے۔

اس کے شعروں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

در عہدِ تو مارا ہمہ با غیر خطاب است — سر پنجۂ مژگان دگر بیان عتاب است

شاخ مژہ ام سبز شد و غنچۂ خون کرد! — این ہا ہمہ از تربیتِ چشم پُر آب است

با محرمانِ زلفِ توام سینہ صاف نیست — تا قتل ہم رہم چہ نسیم و چہ شانہ را

گریہ ام گر سببِ خندۂ او شد چہ عجب — ابر چوں گریہ نماید لبِ گلشن خندد

ساقی نامہ ایک خاص صنفِ شعر تھا جس میں مرزا کا طبع آزمائی کرنا اور پھر ملا عبدالنبی کا اُسے اپنی کتاب "میخانہ" کے لئے انتخاب کرنا ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس ساقی نامے کی چند شعر یہ ہیں:۔

بباغ از فتد عکس از روی یار — شود نوکِ ہر خار رشکِ بہار

دگر بر فلک چہرہ تاباں کند — خور از شرمِ اُو چہرہ پنہاں کند

دگر سوی آتش بتازد سمند — دگر شعلہ ز آتش نگردد بلند

رسد بوی اُو گر بباد بہار — ہمہ کوہ و صحرا شود مشک بار

بہ آب ار بشوید دو زلفِ سیاہ — بہ تاثیر سنبل شود ہر گیاہ

کشد حسنِ او گر سوی خاک خیل — زمین را نماند بآرام میل

دگر سوی میخانہ تازاں شود! — می از چادرِ شیشہ عریاں شود

از آں می کہ گر ریزی اش در ایاغ — ایاغت فروزاں شود چوں چراغ

از آں می کہ جاں عکسی از نور اوست — ادیبِ خرد پاک دستور اوست

می لعل چوں چہرۂ دلبراں — رسندہ تر از دستِ خنیاگراں!

مئی کو چوں در جام گرداں شود! — چراغِ دلِ می پرستاں شود

حرارت فزا می فسردہ دلاں! — کدورت زدای خرد ماندگاں!!

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوای جگر تشنگاں کیست؟ می — دوای دلِ عاشقاں چیست؟ نَی

می است آنکہ آباد سازد ترا — ز بندِ غم آزاد سازد ترا

طلسمِ غم بیکراں است می — تنِ بی رواں را رواں است می

چناں داں کہ می گوہر بی بہاست — کہ خورشید در جنب نورش سہاست

اگر تیغ ایں گوہرت آرزوست — اگر جاں دہی در بہایش نکوست

نہ می بلکہ عیش جوانی بود! ! کلیدِ درِ زندگانی بود!

مرزا کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ اور اس میں اس کی حیثیت ایک ماہرِ فن کی سمجھی جاتی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہان کی طرح وہ موسیقی کے تمام غوامض اور لطائف سے آگاہ تھا۔ بالخصوص طنبور نوازی میں یکتا تھا۔ ملا رشدا اس کی طنبورہ نوازی کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

گر نغمہ سازت بسکوں می آید رمزی است گوئیمت کہ چوں می آید
از بسکہ بگرد زخمات می گردد! پیچیدہ ز طنبور بروں می آید

بدقسمتی سے اتنا قابل جوہر اپنے باپ اور دوسرے خاندانی افراد کی طرح شراب کا رسیا تھا۔ اور اس بارے میں اتنا غلو کرتا تھا کہ دن رات پیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عیاش بھی پہلے درجے کا تھا۔ غالباً طالب آملی جو خود بھی اس مرض میں مبتلا تھا اسی وجہ سے اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اور دونوں کی جواں سالی بھی اس اشتراکِ مذاق میں اضافہ کرتی تھی۔

مرزا غازی بیگ کی عیاش طبیعت کا ذکر مصنف مآثر الامرا نے یوں کیا ہے۔

"دعتیاد بہ ازالۂ بکارت کردہ بود کہ ہر شبی یکی را از ہر جا بہم رسانیدہ می آوردند بازروی اُونمی دید۔ ازین بود کہ مدتہا کہ در شہر ٹھٹہ ہر زنی بدکار را بمیرزا منسوب می نمود"

مرزا نے ۲۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ واقعہ ۱۰۱۸ھ کا ہے۔ اور اس کی تاریخ غازی کے لفظ سے نکلتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کا سن ولادت ۹۹۳ ہجری ہونا چاہیے۔ جو اس کے والد کی تخت نشینی کا سال تھا۔ اور چونکہ اس کے والد کی وفات ۱۰۰۸ھ میں ہوتی ہے۔ اس لئے ٹھٹہ کی حکومت پانے پر اس کی عمر کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔

اگرچہ تذکروں اور تاریخوں میں اس بات کا تفصیل سے ذکر نہیں آتا تاہم سب کے سب اس صغیر سنی کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔

ملا عبدالنبی نے اس کی فیاضی، دریادلی اور فرخ حوصلگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک شخص ہندوستان سے چل کر قندھار پہنچا، کچھ دیر بعد دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر تنگ آکر اس نے ہندی زبان میں کچھ ہجو یہ اشعار کہے۔ اور قندھار سے بابا حسن ابدال چلا آیا۔ یہاں چند آشناؤں سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ انہیں یہ ہجو یہ اشعار سنا رہا تھا کہ مرزا غازی کے ایک مقرب شہباز خاں نے ان مزخرفات کو سن لیا اور اُسے اور دوسرے ہمراہیوں کو سخت سزا دی۔ اس واقعہ کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ ایک دن یہ مظلوم غریب الدیار مرزا غازی بیگ کی شکارگاہ پہنچا اور سامنے آکر فریاد کی اور کہا کہ مجھ پر آپ کے فلاں امیر نے بے جا ظلم کیا ہے۔ مرزا نے فی الفور شہباز خاں کو بلایا اور سخت باز پرس کی شہباز خاں نے جو اس واقعہ کو چھپانا چاہتا تھا۔ ناچار سب کچھ کہہ سنایا۔ مرزا نے سن کر کہا کہ تم نے اُسی وقت اس ناہنجار کی زبان کیوں نہ کاٹ دی کہ دوسروں کو عبرت ہوتی چنانچہ مجرم کو فوراً گرفتار کرکے لے آئے۔ دوسرے دن جب اُسے طلب کیا گیا اور عدل وانصاف کا بازار گرم ہوا۔ تو میدان میں لوگوں کا ہجوم سخت پریشان تھا۔ اور مجرم حواس باختہ کہ دیکھیں کیا سزا ملتی ہے۔ اتنے میں ایک ہاتھی نمودار ہوا۔ لوگ اور بھی گھبرائے۔ سمجھے اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندا جائے گا۔ مجرم بیچارے کا رنگ خوف کے مارے فق ہوا جاتا تھا۔ موت سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ وہ مجرم ہاتھی پر سوار ہے۔ اور کوئی شخص پیچھے کھڑا اسے چھپائے ایک ہزار روپے کی سنہری تھیلی اس کی جھولی میں ڈال کر کہہ رہا ہے یہ تھیلی اور ہاتھی تمہارا ہے جہاں چاہو لے جاؤ۔ اتنا کہہ کر چھلانگ لگادی یہ مرزا غازی بیگ ترخان تھا۔

شہباز خاں فوراً بھانپ گیا۔ ایسے لوگوں کی زبان یوں بھی کٹ سکتی ہے۔ ملا عبدالنبی مرزا کو مجمع الکمالات کے لقب سے خطاب کرتا ہے۔ اور اس کی بے وقت موت پر اظہارِ افسوس کرتا ہوا لکھتا ہے۔

برداشت زخاک عالمی را! درخاک نہاد روزگارش

باری

فلسفۂ معاشیات کی تاریخ

معاشیات کو اس وقت علمی حیثیت حاصل ہوئی۔ جب صنعتی سرمایہ داری کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ لیکن انسانی معاشرے کے اس دور سے صدیوں پہلے ایسے مفکر موجود تھے۔ جنہوں نے اپنے وقتوں کی معیشت کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار کیا۔ ان بزرگوں کے معاشی افکار کا ایک حصہ مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں بکھرا پڑا ہے۔ نہیں معلوم کہ ابھی ان افکار کا کتنا حصہ دھرتی کے اندر چھپا ہوا کسی اثریاتی کی کھدائی کا منتظر ہے، سرمایہ و محنت، آقائی و غلامی، درآمد و برآمد اور اس سے ملتے جلتے مسائل کا سامنا ہر اس معاشرے کو کرنا پڑا جو بربریت کے دروازے سے گزرتا ہوا ایوان تہذیب میں داخل ہوا۔ جب یونانی فلسفیوں نے معاشی امور پر غور شروع کیا۔ تو اس وقت یونانیوں کی شہری ریاستوں میں زمین کی شخصی ملکیت، تقسیم کار، تجارت اور زر کی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ یونانیوں کے قبائلی نظام کی جگہ طبقوں میں بٹا ہوا معاشرہ قائم ہو چکا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جس پر جاگیری اشرافیہ حکمران تھا۔ یونانیوں کی بعض شہری ریاستوں میں اگرچہ جمہوریت کے چرچے تو تھے۔ لیکن حکومت کی باگ ڈور بڑے بڑے زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ ان ریاستوں میں تجارتی طبقے کے فروغ کے ساتھ ساتھ جاگیری اور تجارتی مفادوں میں بھی تصادم ہونے لگا۔ اس تصادم نے ان آزاد کسانوں کو بھی غلاموں میں تبدیل کر دیا جو کل تک اپنی زمینوں کے مالک تھے۔ چھٹی صدی ق م میں سولن نے جو دستور مرتب کیا تھا۔ اُس میں اس تصادم کا پتہ چلتا ہے۔ افلاطون نے شہری ریاست کی ابتدا اور معاشرے کی تشکیل کے اصول پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسکے شاگرد ارسطو نے معاشی فلسفے کی بنیاد رکھی۔ افلاطون کے نزدیک انسان کی خلبی مسرت اسی میں ہے کہ فلسفی، بادشاہ بن جائیں یا بادشاہ فلسفی ہو جائیں۔ افلاطون کی کتاب "ریاست" میں اسکے معاشی افکار کا پتہ چلتا ہے۔ "ابتدائی شکل میں ریاست صرف ایک بستی ہوتی ہے۔ جس میں کاشتکار اور مختلف قسم کے دستکار آباد ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں محض آسودگی مدنظر ہوتی ہے..... رفتہ رفتہ حفاظت کی ضرورت سپاہیوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیتی ہے۔ جس میں جسمانی خواہشوں کے علاوہ اولوالعزمی اور جوش کا جذبہ بھی ہوتا ہے اور ترقی کرتے کرتے انہی سپاہیوں میں کچھ ایسے افراد بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ جن میں بقیہ لوگوں کے اوصاف کے ساتھ عقل اور غور کرنے کا مادہ بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگ آبادی کا بہترین عنصر ہیں۔ ان کی شخصیت سب سے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اور حکومت انہیں کا حق ہے۔ کاشتکار اور دستکار اپنے اپنے کام کے لئے فطرتاً موزوں ہیں۔ اور سپاہی میدان میں اپنی ہمت کے کرشمے دکھانے کے لئے۔ ان دونوں میں حکومت کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے انہیں اس میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ ان کا حق وہی ہے۔ جو وہ ادا کر سکیں اور جو ان کا مقتضائے طبیعت ہو۔ حکومت ان لوگوں کو کرنا چاہیئے۔ جن میں عقل، عاقبت اندیشی اور ہمت ہو، جن کی نظر اتنی وسیع اور دل اتنا پاک ہو کہ وہ اپنی زندگی دوسروں کی بہبودی کے لئے وقف کر سکیں اور خدمت کا کوئی صلہ نہ مانگیں۔ اس طرح سیاسی نظام کا پہلا اصول یہ ہے۔ کہ معاشرت میں تین طبقے ہوں اور ہر طبقے کے سپرد وہ کام کیا جائے۔ جسے وہ بہترین طریقے پر انجام دے سکے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے وہ تمام دشواریاں رفع ہو جائیں گی۔ جو طبیعت اور کام کی نامناسبت

سے پیدا ہوتی ہیں ۔۔۔۔ جب ہر شخص کی زندگی اس کی سرشت کے مطابق ہو گی تو اُسے وہ سکون اور آسودگی اور اطمینان بھی نصیب ہو جائے گا جس کی اُسے تلاش رہتی ہے ۔۔۔۔ اگر کاشتکار وغیرہ تعلیم سے محروم رکھے گئے ہیں تو سپاہی اور محافظ ان لذتوں سے نا آشنا رہنے پر مجبور ہیں جو کاشتکاروں کے حصّے میں آئی ہیں۔ ان دونوں کی نہ کوئی ذاتی ملکیت ہے نہ اپنا الگ خاندان، بلکہ ان کی زندگی کا طرز ایسا ہے۔ کہ وہ اپنے ذہن اور سیرت کی تمام خوبیوں کو درجۂ کمال تک پہنچا سکیں۔ ان کے کھانے اور کپڑے کا ذمہ تیسرے طبقے کے لوگوں پر ڈالا گیا ہے۔ جن کا فرض ہے کہ اناج اور کپڑے کی ایک مقررہ مقدار جو سال بھر کے واسطے کافی ہو۔ ان دونوں طبقوں کے استعمال کے لئے فراہم کریں۔ محافظوں کو صرف ملکیت رکھنے ہی کی ممانعت نہیں ہے۔ وہ اس گھر میں جہاں روپیہ ہو سو بھی نہیں سکتے۔ افلاطون کے خیال میں اس طرح وہ ریاست کے معاشی معاملات کا بہترین انتظام کر سکیں گے اور ان کی مفلسی دوسروں کی بدگمانی رفع کرنے کی سب سے کامیاب تدبیر ہو گی،،[1]

افلاطون کی اپنی کتاب (مکالمہ) "قوانین،، میں ملکیت کے متعلق ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتا ہے،، ملکیت کوئی ذاتی حق نہیں بلکہ ریاست کا عطیہ سمجھی جائے۔ شہریوں کو جو زمین دی جائے۔ اس کا ایک حصّہ شہر کے قریب ہونا چاہیئے اور دوسرا سرحد کے پاس تاکہ ریاست کی حفاظت کو ہر شخص یکساں اپنا فرض سمجھے۔ شہریوں کے لئے صرف زراعت ہی کسبِ معاش کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ دستکاری اور تجارت ریاست کی نگرانی میں غیر ملکیوں کے سپرد ہونا چاہیئے۔ ریاست کا یہ بھی فرض ہے۔ کہ لوگوں کو زیادہ دولت پیدا کرنے سے روکے۔ ریاست کو دولت کی خرابیوں سے بچانے کے لئے شہر کو سمندر سے دور ہونا چاہیئے،،[2]

افلاطون کا، جو اشرافی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایتھنز کی جمہوریت کی مخالفت کرنا آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اُسے ایتھنز کے اُبھرتے ہوئے تجارتی طبقے سے نفرت تھی۔ لیکن اس کی یہ نفرت رومانی انقلاب،، کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ فلسفۂ معاشیات میں افلاطون کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ تقسیم کار اور شہری ریاست کے آغاز پر قلم اٹھاتا ہے۔ لیکن وہ معاشرے کے سیاسی اداروں اور اس کی معاشی تشکیل کے تعلقات کو اجاگر نہیں کرتا اور نہ وہ تقسیم کار کے مجلسی اور معاشی پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ تقسیم کار کے نظریئے کو ایک رجعت پسندانہ مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اپنی اشرافی روایات کی تائید میں اور حمایت کے لئے وہ تقسیم کار کو ذات پات کا سسٹم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی عینی ریاست میں حکمرانوں کا ایک طبقہ بنانے کی جگہ ان کی ایک الگ جاتی بنا دیتا ہے جو اس کے خیال میں معاشی لوٹ کھسوٹ سے الگ تھلگ رہے گی۔ افلاطون کی ریاست کی اس شق کو غلطی سے "اشتمالیت،، سمجھ لیا گیا حکمران طبقے کے بارے میں یہ شاعرانہ تصور دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ کیونکہ وہ طبقاتی تقسیم کی معاشی اساس کو نظر انداز کرتا ہے افلاطون کی عینی ریاست میں صرف دو طبقے ہیں۔ حکمران اور محکوم،،[3]

افلاطون کی موت کے بعد اسکے معاشی افکار صدیوں تک رومانی مفکروں کے لئے تخلیقی تحریک کا ذریعہ بنے۔ افلاطون نے ساہوکاری تجارت کو جس حقارت کی نگاہ سے دیکھا وہ معاشیات کے رومانی اسکول میں ہمیشہ پائی گئی۔ ارسطو نے جن معاشی مسائل کو چھیڑا وہ بعد میں آنے والے ماہرینِ معاشیات کو بھی سوچ بچار کے لئے پکارتے رہے۔

ارسطو ۳۸۴ ق م میں مقدونیہ کے ایک شہر سٹے جیرا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسکندر کے دادا کا درباری طبیب تھا۔ اس امر کا امکان ہے کہ ارسطو نے بھی اپنے باپ سے طبّی تعلیم حاصل کی ہو گی۔ اس کی جوانی کے بارے میں طرح طرح کے قصّے مشہور ہیں۔ کہا

---

[1] تاریخ فلسفۂ سیاسیات :۔ محمد مجیب
[2] تاریخ فلسفۂ سیاسیات :۔ محمد مجیب
[3] تاریخ فلسفۂ معاشیات :۔ ایرک رول

جاتا ہے۔کہ وہ اپنے باپ دادا کی کمائی رنگ رلیوں میں لٹا دینے کے بعد محض روٹی کمانے کے لئے فوج میں بھرتی ہوگیا۔ سپاہی کی زندگی اُسے راس نہ آئی۔ وہ اپنے آبائی وطن جاکر طبیب کا کام کرنے لگا۔ تھوڑی مدت بعد وہ افلاطون کی اکادمی میں داخل ہوگیا۔ ایک طویل مدت تک استاد اور شاگرد "دبستانِ حکمت" میں ان بیشتر امور پر غور کرتے رہے۔ جو اس وقت انسانی ذہن میں آسکتے تھے۔ افلاطون کی موت کے بعد ارسطو کی علمی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے اسے اپنی راجدھانی پیلا میں بلا بھیجا۔ ارسطو اب فلپ کے بیٹے اسکندر کا اتالیق تھا۔ سیر و سیاحت کے اس دوسرے دور کے بعد ارسطو نے ایتھنز پہنچ کر اپنے آپ کو "مقدونی پارٹی" سے وابستہ کر لیا۔ بارہ برس تک وہ لی سے ام کی دانش گاہ میں درس دیتا رہا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں ارسطو نے جو کچھ لکھا اس کی اہمیت اب تک باقی ہے۔ آپ اس کے خیالات سے متفق ہیں یا نہیں لیکن جب بھی آپ علوم کی تاریخ مرتب کریں گے۔ تو ارسطو آپ کی اس تالیف کا "پیش لفظ" ہوگا۔ ارسطو کی علمی سرگرمیوں کے لئے اسکندر نے ایسی سہولتیں مہیا کر دی تھیں۔ جو اس زمانے میں کسی دوسرے فرد کو میسّر نہیں آسکتی تھیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ارسطو کے حکیمانہ اسباق نے مقدونی شہزادے پر کیا اثر چھوڑا ہوگا۔ لیکن استاد "اسکندریت" کا بہت بڑا حامی تھا۔ وہ شہری ریاستوں کی وطنیت پر یونانی اتحاد کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ چھوٹی چھوٹی حکمرانیوں اور معمولی جھگڑوں کے مٹائے جانے کے بعد ہی فلسفہ اور سائنس کو فروغ ہو سکتا ہے۔ اس نے اسکندر میں وہی کچھ دیکھا جو بعد میں گوئٹے نے نپولین میں دیکھا . . . ایتھنز کے لوگ جو آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ارسطو کو حقارت سے دیکھنے لگے۔ ان کا یہ جذبۂ حقارت اور تیز ہوگیا۔ جب اسکندر نے ایتھنز کے عین وسط میں ارسطو کا مجسمہ نصب کروا دیا۔ ارسطو کو موت کی سزا دینے یا اُسے جلاوطن کر دئے جانے کے مطالبے نے شہر میں ہنگامہ بپا کر دیا۔ عین اس وقت اسکندر کو موت نے آن دبوچا۔ ایتھنز میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مقدونی پارٹی کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ایتھنز نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ارسطو پر الزامات لگا دئے گئے۔ اس نے نہایت دانشمندی کے ساتھ شہر کو چھوڑ دیا۔ اس نے جلاوطنی اختیار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ ایتھنز کو موقعہ نہیں دینا چاہتا۔ کہ وہ فلسفہ کے خلاف دوبارہ گناہ کرے۔ چند ماہ بعد ارسطو نے زہر کے پیالے کو منہ لگا کر اپنی زندگی کو ختم کر دیا" لے

ارسطو نے فلسفۂ معاشیات کے لئے جو مواد پیش کیا ہے۔ وہ اس کے سیاسی اور مجلسی نظام کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے" ارسطو کے نزدیک ریاست ایک جماعت ہے۔ جو زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اور زندگی کو بہتر بنانے کے لئے قائم رکھی جاتی ہے۔ وہ بالکل انسان کی بنائی ہوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کا آغاز اور اسکے ارتقا کا سلسلہ فطری یا طبیعی ہوتا ہے۔ اور وہ ایکسر بالکل مظہر بھی نہیں ہے۔ کیونکہ انسان خیر و شر کا شعور رکھتا ہے۔ اور اپنے اخلاقی معیار کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے نظام میں بھی طبیعی اور انسانی عنصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ حکومت ایک فطری اصول ہے اور وہ لوگ جو حکومت کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں پر جن میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی حکمرانی کرتے ہیں۔ ریاست کے نظام کا انحصار اس قاعدے پر ہے۔ کہ اسکے بعض اراکین حاکم ہوں اور بعض محکوم۔ لیکن سیاسی حکومت بزرگ خاندان کے اقتدار یا آقا کے اختیارات سے بالکل جدا چیز ہے۔ بزرگ خاندان اور غلاموں کا آقا اپنے ماتحتوں سے برتر ہوتا ہے۔ اس کا اقتدار قدرتی اور اس کی حکومت کا مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ سیاسی حکومت ریاست کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن حاکم اور محکوم کی تفریق کے باوجود شہری مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کا مقصد عام مفاد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ارسطو دستور یعنی نظام حکومت کے اصولوں

لے۔ داستانِ فلسفہ :۔ ول ڈیوران

کو بہت اہم سمجھتا ہے۔ اس نے دستور کی خوبی کا معیار پائداری کو قرار دیا ہے،، (تاریخ فلسفۂ سیاسیات)

افلاطون اور ارسطو مثالی ریاست کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود ارسطو کی مثالی ریاست میں بھی صرف دو طبقے ہیں حکمران اور محکوم۔ وہ غلاموں کے وجود کے جواز میں کہتا ہے کہ "بعض لوگ پیدائش ہی سے غلامی کے لئے وقف ہو جاتے ہیں اور بعض کے لئے آقائی مخصوص ہو جاتی ہے ..... کمزوروں اور نچلے درجے کے لوگوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ کسی آقا کے ماتحت ہوں ..... غلام ایک جاندار آلہ ہے۔ اور آلہ ایک بے جان غلام ہے"[۱] بڑے سے بڑا یونانی مفکر غلاموں کے بغیر یونانیوں کی کسی شہری ریاست کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ ارسطو نے بھی یہی کیا۔ لیکن اس نے یہ محسوس کیا کہ اگر آلات انسان کے قابو میں آکر خود بخود کام کرنے لگیں۔ تو پھر آقاؤں کو غلاموں کی ضرورت نہیں رہے گی ـــ صنعتی انقلاب کی طرف ہلکا سا اشارہ۔

ارسطو کا اس امر کو بھول جانا طبعی تھا کہ اس کے زمانے کے غلام اس وقت جب کہ آلات انسان کے قابو میں آکر خود بخود کام کرنے لگیں گے۔ اجرتی غلاموں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ایرک رول کے الفاظ میں ارسطو نے معاشیات کے ذیل میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہیں تین عنوانوں کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) معاشیات کی تعریف اور اس کا احاطہ۔

(۲) مبادلے کا تجزیہ

(۳) نظریۂ زر۔

"ارسطو کے خیال میں معیشت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ معیشت خاص جس کا تعلق گھریلو انتظام سے ہے اور سپلائی کی سائنس جس کا تعلق دست یابی سے ہے۔ معیشت خاص کے بارے میں ارسطو اس ارتقا کو بیان کرتا ہے۔ جو گھریلو زندگی سے دیہات اور دیہات سے شہری ریاست کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ارسطو اپنے اس نظریے میں غلامی کی حمایت کرتا ہے۔ سپلائی کی سائنس پر بحث کرتے ہوئے ارسطو مبادلے کے طریقوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے گھریلو ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ وہ اس موقعہ پر طبعی اور غیر طبعی ذریعہ تبادلہ میں امتیاز پیدا کر کے قدر استعمال اور قدر مبادلہ میں تفاوت پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بارٹر (چیز کے بدلے چیز کا لین دین کرنا) کی زحمتوں نے کس طرح ایک بالواسطہ مبادلے کو ترقی دی اور کس طرح صرف زر جمع کرنے کو تاجروں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ وہ سود کو زر پیدا کرنے کی بدترین صورت قرار دیتا ہے۔ اسکی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زر کو قدر کا معیار سمجھتا تھا ..... وہ ان عوامل سے متعلق جو قدر مبادلہ کو متعین کرتے ہیں۔ کوئی واضح نظریہ مرتب نہیں کر سکا"

یونانی مفکروں کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد خود شناسی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت کے حصول کو فرد اور ریاست دونوں کے لئے غیر اہم قرار دیتے ہیں۔ "یونان کے معاشی فلسفے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاشیات کو اخلاقی اور سیاسی تقاضوں کے ماتحت رکھتے ہیں"[۲] انہی تقاضوں کے پیش نظر افلاطون غلاموں کے وجود کو من وعن تسلیم کرتا ہے، اور ارسطو غلامی کا جواز پیش کرتا ہے۔ یہی تقاضے افلاطون کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ذرائع پیداوار بڑھانے کی جگہ ان ضروریات پر قابو پانا بہتر ہے۔ وہ ایک معاشی مسئلے پر بحث کرتا ہوا گوشۂ رہبانیت میں پناہ لیتا ہے۔

معاشیات کا خاکہ:- رچرڈ ایلے

افلاطون اور ارسطو جہاں تقسیم کار کی اہمیت سے غافل نہیں۔ وہاں وہ دونوں صنعت اور تجارت سے ایک قسم کی نفرت کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ افلاطون اور ارسطو کے علاوہ تھیوسی ڈائیڈز اور زینوفون نے بھی معاشی زندگی کے گھریلو پہلو پر اظہارِ خیال کیا۔

اپنے دورِ عروج میں رومیوں نے معاشی معلومات میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں کیا۔ چند رومیوں نے کھیتی باڑی کے مسائل پر تھوڑا بہت لکھا۔ سائیرو نے تو سچے رومیوں "کو صنعت وحرفت سے دور رہنے کی تلقین کی۔ بعض رومیوں نے غلام کسانوں اور آزاد کسانوں کے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔ فلسفۂ معاشیات میں رومیوں کا کوئی حصہ نہیں۔ انہوں نے معیشت کے یونانی تصورات ہی کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا۔ رومی قانون، میں روم کے معاشی اداروں سے متعلق کافی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ رومی قانون شخصی ملکیت کے بارے میں ارسطو کے خیالات سے متفق نہیں۔ رومی سلطنت کی معاشی اساس غلامی پر تھی۔ جب روم میں غلاموں کی بغاوت اور عیسائیت نے غلاموں اور آقاؤں میں تصادم پیدا کیا۔ تو اس وقت روم کا وہ درمیانی طبقہ جس کے تموّل کا انحصار محض لوٹ کھسوٹ پر تھا۔ کسی قسم کا سیاسی انقلاب پیدا نہ کر سکا۔ عیسائیت کی انقلابی تعلیم نے رومی سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں کلیسا نے ایک جاگیری ادارے کی صورت اختیار کر لی۔ کلیسا کی اصل تعلیم کو پسِ پشت ڈال کر جاگیرانہ مقاصد کے حصول کے لئے ارسطو کے خیالات ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں فلسفۂ حیات کی بنیاد بن گئے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کی معاشرت طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ارسطو کے معاشی نظریوں کو اہلِ کلیسا نے مسیحی دینیات کی بنیادوں پر استوار کر رکھا ہے۔ صنعت اور تجارت کو معاشرے کے لئے مضر خیال کیا جاتا ہے۔ دولت اور تموّل کا رشتہ مجرموں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے "امیر آدمی مجرم ہے یا مجرم کا بیٹا" تجارت کو بھی اہلِ کلیسا ارسطو ہی کے خیالات کے زیرِ اثر دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب معاشی عوامل ان پابندیوں سے نہ رک سکے۔ تو پھر ازمنۂ وسطیٰ کے دینی رہنما صنعت اور تجارت کی مشروط اجازت دینے لگے۔ کل تک تو یہ کہا جاتا تھا کہ "کوئی عیسائی تاجر نہیں ہو سکتا" لیکن بدلے ہوئے حالات نے کلیسا ہی کے رہنماؤں سے تجارت کی اجازت دلوائی۔ ان رہنماؤں نے لین دین کے بارے میں "مناسب قیمت" کا نظریہ پیش کیا۔ نئے معاشی مطالبوں نے نہ صرف صنعت و تجارت کے نئے نئے راستے کھول دیئے۔ بلکہ سود کے جواز میں بھی سوچا جانے لگا۔ پندرھویں اور سولہویں صدی کی سمندری مہموں اور نئے تجارتی تعلقات نے زرکاری کے اتنے مواقع پیدا کر دیئے تھے۔ کہ کلیسا کے معاشی افکار پسِ پشت ڈال دیئے گئے۔ اسی زمانے میں "مناسب قیمت" اور سود سے متعلق نظریوں میں ترمیم کی گئی "تحریکِ اصلاح" کے بعد یورپ میں کلیسائی دینیات اور فلسفۂ معاشیات ایک دوسرے سے کوسوں دور ہونے لگے۔ تاجرانہ سرمایہ داری کی رفتار کو کلیسائی عقائد نہ روک سکے۔

انسانی معاشرے کی تاریخ میں تاجرانہ سرمایہ داری کا دور "تاجریت" کہلاتا ہے۔ اس دور میں معاشیات پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں اگرچہ "وکیلوں، سکالروں اور سرکاری افسروں کا بہت ہاتھ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں فلسفۂ معاشیات میں اضافہ کرنے والے معاشی سرگرمی کے علمبردار یعنی تاجر تھے" [۱]

"تاجریت" معاشیات کے ماہرین کے کسی خاص اسکول کا نظریہ نہیں بلکہ یہ نام اس زمانے کے مدبروں کی معاشی پالیسی سے منسوب ہے تاجریت کا یہ دور سولہویں صدی سے اٹھارھویں صدی کے اواخر تک پھیلا ہوا ہے۔ کولبرٹ (فرانس)، کرامویل (انگلستان)، اور فریڈرک اعظم (جرمنی)، تاجریت کے حامیوں میں سے ہیں۔ سیرا اور تھامس من اس سسٹم کے حامیوں میں سے ہیں۔ سر جیمز اسٹوارٹ کی کتاب [۲] "تاجریت

[۱] ایرک رول [۲] پولیٹیکل اکانومی کے اصول کی تفتیش، مطبوعہ ۱۷۶۷ء

کی حمایت کی آخری لیکن بہت بڑی کوشش ہے۔ "تاجریت" کے اہم خصائص یہ ہیں:-

(۱) اپنے ملک میں قیمتی دھاتوں کے ذخیرے میں اضافہ۔

(۲) تجارت میں موافقانہ توازن کا قیام

(۳) آبادی بڑھانا

(۴) کھیتی باڑی کی جگہ صنعت وحرفت کو فروغ دینا۔

اس دور کے مدبروں نے قانون کی حمایت سے "تاجریت" کے اصولوں کو اس حد تک اپنایا کہ تاجریت اور سرکاری مداخلت ہم معنی بن گئے۔ اٹھارہویں صدی میں انگلستان کی بہت سی صنعتوں کو تاجریت کی اس قانونی حمایت سے نقصان پہنچنے لگا۔ تاجریت کیخلاف آواز اٹھی۔ حکومت سے مطالبہ ہونے لگا کہ اُسے معاشی اور صنعتی امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ آزاد تجارت کا نعرہ بلند ہوا انگلستان کے علاوہ فرانس کے ماہرینِ معاشیات نے بھی آزاد تجارت کی تائید میں قلم اٹھایا۔

فرانس کے یہ ماہرین فی زی اوکرات (فیزیوکرات) کہلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ذاتی کاروبار میں مداخلت کرے۔ معاشی لحاظ سے وہ صنعت اور تجارت پر زراعت کو ترجیح دیتے۔ کوئیزنے، گورنے اور ترجو مشہور فیزیوکراتوں میں سے ہیں۔ ترجو اگرچہ اپنے آپ کو فیزیوکراتی اسکول سے منسوب نہیں کرتا۔ لیکن اسکے خیالات فیزیوکراسی ہی کی اشاعت کرتے ہیں۔ فیزیوکراتوں کے معاشی افکار ان کے سیاسی فلسفے پر بھی اثرانداز ہوئے۔ کوئیزنے کے خیال میں تمام دولت کا وسیلہ کھیتی باڑی ہے "صنعت محض اشیا کی ہیئت بدل دیتی ہے۔ اور تجارت ان اشیا کو تقسیم کرتی ہے" زراعت کو سب سے بڑی انڈسٹری ماننے والے فیزیوکرات زمین کی ملکیت اور جاگیری نظام کے بہت بڑے حامی تھے۔ فیزیوکراتوں نے معاشیات سے متعلق بعض پرانے نظریوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ ان کی کوششوں سے معاشیات اور دیگر مجلسی علوم میں امتیاز پیدا ہونے لگا۔ اُنھوں نے محاصل اور پونجی سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ فیزیوکراتوں کی تحریریں ایڈم سمتھ کے لئے راستہ صاف کرچکی تھیں۔

ایڈم سمتھ نے معاشیات کو ایک علمی صورت میں مرتب کر کے فلسفۂ معاشیات کے اس اسکول کی بنیاد رکھی۔ جو کلاسیکل کہلاتا ہے۔ وہ سنہ ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوا۔ گلاسگو اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے کے بعد وہ گلاسکو میں منطق اور بعد میں فلسفۂ اخلاق کا پروفیسر مقرر ہوا۔ تیرہ سال کے بعد وہ دو سال کے لئے فرانس چلا گیا۔ واپسی پر اس نے کسٹمز کے محکمے میں ایک عہدہ قبول کرلیا۔ اس نے سنہ ۱۷۹۰ء میں وفات پائی۔ ایڈم سمتھ فلسفے کی راہ سے معاشیات کے میدان میں داخل ہوا۔ اس نے سنہ ۱۷۵۹ء میں اپنی کتاب "اخلاقی احساسات کا نظریہ" پیش کی سترہ سال بعد اس کی مشہور کتاب "قوموں کی دولت" شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ہر نقاد اس بات کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ایڈم سمتھ نے معاشی غور و فکر کے طریقوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ ایڈم سمتھ اپنے پیشرو اور ہمعصر معاشیاتیوں سے بہت کچھ حاصل کرنے کے باوجود فلسفۂ معاشیات کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ "قوموں کی دولت" معاشیات کو معاشیات کی صورت میں پیش کرنے کی اگرچہ پہلی کوشش نہیں۔ لیکن وہ ایک کامیاب کوشش ضرور ہے۔ جس طرح فرانس کے فیزیوکرات اپنے دور کے معاشی اور سیاسی حالات کے زیرِ اثر تھے۔ اسی طرح ایڈم سمتھ بھی اپنے وقت کے معاشی اور سیاسی تقاضوں کی روشنی میں اپنے معاشی افکار کو مرتب کرتا ہے۔

"قوموں کی دولت" پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔ پہلی کتاب پیداوار، تقسیم اور تبادلہ پر بحث کرتی ہے۔ دوسری کتاب میں سرمایہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ تیسری کتاب مختلف وقتوں میں مختلف قوموں کی معاشی پالیسی بیان کرتی ہے۔ چوتھی کتاب میں پولیٹیکل اکانومی یعنی معاشیات کے گزشتہ سسٹم پیش کئے گئے ہیں۔ آخری کتاب مالیاتِ عامہ کے مختلف پہلو لئے ہوئے ہے۔ ایڈم سمتھ اپنی

کتاب میں "فلسفے کے اس مخصوص سسٹم کی وضاحت نہیں کرتا۔ جہاں سے وہ اپنے معاشی نظریئے حاصل کرتا ہے"[1]
ایڈم سمتھ اپنی کتاب "قوموں کی دولت" میں انگلستان کے اس طبقے کے فروغ کے لئے میدان تیار کرتا ہے۔ جس کی سرگرمیوں پر حکومت نے پابندیاں لگا رکھی تھیں وہ انگلستان کے کارخانہ داروں ہی کی زبان مستعار لے کر تجارتی پابندیوں کے رفع کئے جانے اور آزاد تجارت کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ وہ اپنے معاشی فلسفے سے انگلستان کے صنعتی سرمایہ داروں کو سیاسی اور معاشی لیڈر بنانا چاہتا ہے۔ انگلستان کے حالات اس امر کے لئے تیار ہو چکے تھے کہ صنعتی سرمایہ داری انگلستان کی سیاسی اور معاشی تاریخ میں اپنا پارٹ ادا کرے۔ چنانچہ ایڈم سمتھ کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ صنعتی سرمایہ داروں کی حمایت کرنا ترقی کی طرف بڑھنا تھا۔ لیکن ایڈم سمتھ کی آنکھ اُن صنعتی اور اُجرتی مزدوروں کے مسائل اور مصائب کو نہ دیکھ سکی۔ جو صنعتی سرمایہ داری کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ ایک آدھ مرتبہ مختلف طبقوں کے مفاد پر اجتماعی فلاح کے زاویہ نگاہ سے بحث کرتا ہے۔

جہاں تک اصولِ معاشیات کا تعلق ہے "قوموں کی دولت" پہلی مرتبہ کئی ایک اصطلاحوں سے متعلق الجھن دور کرتی ہے۔ ایڈم سمتھ کے خیالات سے آگاہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کتاب "اخلاقی احساسات کا نظریہ" کا مطالعہ بھی کیا جائے اس کے خیالات نے ڈیوڈ ریکارڈو کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ایڈم سمتھ جہاں استخراجی اور استقرائی دونوں طرزِ استدلال کو کام میں لاتا ہے۔ وہاں ریکارڈو مجرد استخراجی طریقِ استدلال سے کام چلاتا ہے۔ ریکارڈو اگرچہ تاریخی معلومات کا وہ ذخیرہ تو نہیں رکھتا۔ جو ایڈم سمتھ کے پاس تھا لیکن وہ اپنی کتاب "پولیٹیکل اکانومی کے اصول" میں تقسیم دولت کے مسائل پر بحث کرتا ہے۔ اسی کتاب میں وہ لگان کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ ایڈم سمتھ کے نظریہ قدر میں تضاد تو ضرور ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے قدر کی وضاحت میں کافی کامیابی حاصل کی۔ ریکارڈو کو بھی نظریۂ قدر میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ریکارڈو کا نظریہ قدر سمتھ اور مارکس کے نظریوں کے بین بین ہے[2]۔ ریکارڈو کے بعد فلسفۂ معاشیات کی یگانگت ختم ہو جاتی ہے۔ مالتھس کی شہرت اگرچہ اسکے نظریۂ آبادی میں مضمر ہے۔ لیکن فلسفۂ معاشیات کی تاریخ میں اس کی اہمیّت اس وجہ سے ہے۔ کہ اس نے سرمائے کے اضافے (سرمایہ بندی) کے متعلق ریکارڈو کے نظریئے کی مخالفت کی۔ وہ نظریۂ قدر میں بھی ریکارڈو کے خیالات سے متفق نہیں۔ اگرچہ شروع شروع میں مالتھس معاشیات کے کلاسیکل اسکول کا پیرو دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وہ بہت جلد اس اسکول کا نقاد بن جاتا ہے۔ مالتھس سرمایہ دارانہ انڈسٹری کا تو حامی ہے لیکن وہ سرمایہ داری کے اس انقلابی پہلو کی مخالفت کرتا ہے۔ جس کی زد جاگیرداری پر پڑتی ہے۔ وہ جاگیرداروں کے مفاد کے بچاؤ کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ اسی قسم کا ردِ عمل جرمنی میں ہوا ہے۔ جہاں معاشیات کا رومانی اسکول وجود میں آیا۔ انقلاب کے بعد فرانس میں اسی قسم کا ردِ عمل انقلابی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

سرمایہ داری کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسکے نقاد بھی پیدا ہوتے گئے۔ ایک جماعت جس میں مالتھس اور رومانی پسند جو من شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ اسلئے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح جاگیریت کو بچا دیا جائے۔ دوسری جماعت ماضی کی کسی چیز پر آنسو بہائے بغیر نئے مجلسی نظام کے ہر اس پہلو پر جسے وہ ناپسند کرتی ہے۔ سختی سے حملہ کرتی ہے۔ اس جماعت میں سب سے نمایاں مقام کارل مارکس کو حاصل ہے۔ لیکن کارل مارکس کا معاشی فلسفہ اچانک نمودار نہیں ہوتا۔ اُس سے پہلے کچھ لوگ اُس کے انداز میں سوچ رہے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ ہے لیکن اس مقالے میں اسسمونڈی، پرودھن، کوسن اور

---

[1] تاریخ فلسفۂ معاشیات :- ایرک رول

[2] تاریخ فلسفۂ معاشیات :- ایرک رول

گرے ہی کا ذکر کیا جا سکے گا۔

سسمونڈی (۱۷۷۳ - ۱۸۴۲) فرانس کا ایک نامور مؤرخ ہے۔ لیکن اس نے معاشیات پر بھی بہت کچھ لکھا۔ وہ معاشیات کی وضاحت کرتا ہوا لکھتا ہے کہ معاشیات کا موضوع اس دولت کا مطالعہ ہے۔ جس کا تعلق انسان سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نزدیک سب سے اہم معاشی مسئلہ تقسیم دولت ہے۔ سسمونڈی کا شمار ان ابتدائی ماہرینِ معاشیات میں سے ہے۔ جنہوں نے صنعتی سرمایہ داری کے فروغ میں طبقاتی کش مکش کے قرائن کو دیکھا۔ وہ اس امر کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ کہ صنعتی سرمایہ داری نے معاشرے میں جو دو طبقے پیدا کر دیئے ہیں ان کا مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے۔ طبقاتی کش مکش کے بارے میں سسمونڈی کے خیالات کا مارکس کئی جگہ حوالہ دیتا ہے۔ وہ ان اسباب پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو مزدوروں کی زبوں حالی کے ذمہ دار ہیں۔ سسمونڈی ایک طرف تو مزدوروں کے مصائب پر روتا ہے اور دوسری طرف ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت کو بھی قائم رکھنا چاہتا ہے " وہ جاگیر داری کو اس لئے مسترد کرتا ہے کہ وہ انسان کی تخلیقی قوتوں کو محدود کر دیتی ہے۔ وہ کمیونزم کو اسلئے ٹھکرا دیتا ہے۔ کہ وہ ذاتی ملکیت کا بہت بڑا حامی ہے۔ وہ اس دور میں لیجانا چاہتا ہے۔ جہاں کسان اور صناع آزاد ہوں گے"

معاشیات کے سوشلسٹ اسکول میں پرودھن (۱۸۰۹ - ۱۸۶۸) کو سسمونڈی سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کی اہمیت اسلئے بھی زیادہ ہے۔ کہ مارکس نے اس کی کتاب " فلسفہ افلاس " پر تباہ کن انداز میں نکتہ چینی کی۔ اس کا سارا مجلسی فلسفہ عدل کے مرکزی تصوّر کے ارد گرد چکر کاٹتا ہے لیکن وہ بھی مسائل کا کوئی انقلابی حل پیش نہیں کرتا۔ وہ اپنی تحریروں میں متصادم قوتوں میں آشتی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے اس نعرے کے باوجود کہ " ملکیت چوری ہے " معاشرے کے مختلف معاشی رشتوں کا تجزیہ نہیں کرتا۔ وہ لگان سود اور منافع کو مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن اس انداز میں کہ ملکیت میں کوئی فرق نہ آنے پائے وہ کہیں بھی ذرائع پیداوار کی مشترک ملکیت کا خیال پیش نہیں کرتا۔ وہ انقلابیوں کی نسبت ان ماہرینِ معاشیات سے زیادہ قریب ہے۔ جو خیالی سوشلسٹ کہلاتے ہیں۔ ان خیالی سوشلسٹوں میں سین سائمن، فوریئے اور رابرٹ اوون کے نام بہت مشہور ہیں۔ پرودھن ریاست کے وجود کا بھی قائل نہیں۔ وہ ایک انقلابی کا جوش و خروش لے کر اٹھا تھا۔ لیکن ایک ارتجاعی ہو کر رہ گیا۔ اس کے برعکس تھامسن گرے اور ان کے دوسرے ساتھی انگلستان کی ٹریڈ یونین تحریک کے مختلف مراحل دیکھ چکے تھے۔ اسلئے ان کے ہاں سوشلسٹ نظریہ نسبتاً بہتر صورت میں موجود ہے۔

ولیم تھامسن (۱۷۸۳ - ۱۸۳۳) اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ مزدور جس اجرت پر کوئی شے تیار کرتا ہے۔ وہ اجرت اس شے کی قدر سے کم ہوتی ہے اور زائد قدر کو سرمایہ دار منافع کی صورت میں ہضم کر لیتا ہے۔ لیکن وہ سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا علاج رابرٹ اوون کا وہ سسٹم بتاتا ہے۔ جو امداد باہمی کہلاتا ہے۔ ولیم تھامسن اور جون گرے (۱۷۹۹ - ۱۸۵۰) کے معاشی افکار میں ایک ہی طرح کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس امر کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ ایک طبقہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتا۔ سب کچھ سمیٹ لیتا ہے اور وہ طبقہ جو محنت کرتا ہے بہت کم صلہ پاتا ہے۔ وہ ملکیت کا حق محنت اور صرف محنت کو دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لئے اس نے تبادلے کی یہ اسکیم بتائی کہ مزدور کو اس کی محنت کے صلے میں ایک سرٹیفکیٹ دے دیا جائے۔ جس کی قدر اس کی محنت کے برابر ہو تاکہ وہ اس سرٹیفکیٹ سے وہ شے خرید سکے۔ جس پر اتنی ہی محنت صرف کی گئی ہو۔ گرے انفرادی تبادلے کو تو ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ پیداوار کے سرمایہ دارانہ حالات کو برقرار رکھتا ہے۔ حالانکہ یہی حالات انفرادی تبادلہ کے ذمہ دار ہیں۔ کارل مارکس (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳) کے سامنے بھی یہی مسائل ہیں۔ لیکن وہ خیالی سوشلزم کو سائنٹیفک سوشلزم میں بدل دیتا ہے۔ بلاشبہ مارکس ایک بہت بڑا ماہرِ معاشیات ہے۔ لیکن اس کی معاشی تحریروں کو سمجھنے کے لئے اس کی ان تحریروں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ جو تاریخ اور فلسفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ معاشیات سے متعلق چند مضامین

لکھنے کے بعد اس نے ۱۸۴۷ء میں پرودھن کی کتاب "فلسفۂ افلاس" کا جواب "افلاسِ فلسفہ" میں دیا۔ اگلے سال کے شروع میں مارکس اور اینگلز دونوں نے مل کر "کمیونسٹ مینی فیسٹو" پیش کیا۔ اس کتاب میں ان خیالات کی مزید وضاحت کی گئی جو ایک سال پہلے مارکس نے "افلاسِ فلسفہ" میں پیش کئے تھے۔ ۱۸۵۹ء اس کی کتاب "معاشیات پر تنقید" شائع ہوئی۔ جس میں مارکس کی آئندہ کتاب "سرمایہ" کے جراثیم موجود ہیں۔

"معاشیات پر تنقید" میں اس نے جن خیالات کو پیش کیا ہے۔ انہی خیالات کو آگے چل کر "سرمایہ" کی بنیاد بنایا گیا ہے، وہ اس کتاب میں بتاتا ہے کہ "مجلسی پیداوار اور مجلسی تعلقات کی کیفیت کا انحصار معاشرے کی پیداواری قوتوں پر ہوتا ہے۔ یہی مجلسی تعلقات معاشرے کا معاشی ڈھانچ تیار کرتے ہیں اور پھر اس کے اوپر سیاسی، قانونی اور فکری ڈھانچ کھڑا ہوتا ہے۔ اس اوپر والے ڈھانچ کے اداروں اور خیالوں کو سمجھنے کے لئے اس معاشی ڈھانچ کا مطالعہ ضروری ہے۔ جس نے اُسے پیدا کیا معاشیات، مطالعہ ہے۔ معاشرے کے ان پیداواری رشتوں کا جو معاشی نظام کو ترتیب میں لاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی پیداواری قوتوں کے واسطے جگہ بنانے کے لئے انسان جلدی یا دیر میں اس مجلسی رشتے کو بدل لیگا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ سیاسی اور قانونی اداروں کو بھی بدلنا پڑیگا۔ مجلسی تبدیلی کے ساتھ ہی سیاسی انقلاب پیدا ہوتا ہے۔"

کارل مارکس "سرمایہ" میں معاشرت کے سرمایہ دارانہ پہلو اور اس سے پیدا ہونے والے مجلسی اور معاشی مسائل کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ کلاسکی معاشیات کے اس تصوّر کو قبول نہیں کرتا۔ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے قوانین ابدی ہیں اسکے برعکس وہ اس نظام کو تاریخی ارتقا کی ایک ایسی منزل قرار دیتا ہے۔ جو نہ تو اس سے پہلے تھی اور نہ وہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہ اس کتاب میں سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد کی وضاحت کرتا ہے۔ اصولِ معاشیات میں مارکس نے قدر کے نظریۂ محنت کو ان الجھنوں سے نکالا جو کلاسکی معاشیات نے پیدا کر رکھی تھیں۔ زائد قدر کے متعلق کارل مارکس کے نظریئے کو اس کے اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے "مزدور کے پاس اپنی قوتِ محنت فروخت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ مزدور کی یہ قوتِ محنت دوسری اجناس کے طرح ایک جنس ہے جو بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار اس جنس (قوت محنت) کو اسلئے خریدتا ہے۔ کہ اس جنس میں ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جو دوسری اجناس میں نہیں ملتی۔ یہ جنس (قوت محنت) اپنی طبعی قدر سے زیادہ قدر پیدا کرتی ہے اور یہی زائد قدر سرمایہ دار کے لئے نفع بن جاتی ہے[1]" زائد قدر سے مراد وہ فرق ہے جو قوتِ محنت کی قدر اور اس قدر میں ہوتا ہے۔ جسے مزدور پیداوار کے دوران میں پیدا کرتا ہے۔ قوت محنت کی قدر مزدور کی اجرت کہلاتی ہے۔ مزدور کی اُجرت اور مزدور کی محنت سے پیدا ہونے والی قدر میں فرق زائد قدر کہلاتا ہے۔

معاشیات کے اس اسکول نے جو سوشلسٹ (اشتراکی) کہلاتا ہے جون سٹوارٹ مل (۱۸۰۶ - ۱۸۷۳) کو کلاسکی معاشیات سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جدید عمرانیات کے بانی آگست کونت کی تحریروں نے بھی مل کو متاثر کیا تھا۔ فلسفۂ معاشیات کی تاریخ میں جون سٹوارٹ مل کو نہ پوری طرح سے کلاسکی کہا جا سکتا ہے اور نہ اشتراکی اس کی کتاب "اصولِ معاشیات" متضاد خیالات و بیانات کا ایک مجموعہ ہے۔ آگسٹ کونت اپنی تحریروں میں اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ معاشیات کو تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جرمنی میں معاشیات کا "تاریخی اسکول" نمودار ہوتا ہے۔ اس اسکول کے علمبرداروں کا یہ کہنا ہے۔ کہ معاشی پالیسی کلیتہً صداقت پر مبنی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی صداقت اضافی ہوتی ہے۔ وہ اس امر سے بھی انکار کرتے ہیں کہ معاشیات ایسے قوانین دریافت کر سکتی ہے۔ جو ہر مقام اور ہر وقت کے لئے موزوں ہوں۔ انہوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ قانونی اداروں، اخلاقیات اور عادات کا معاشی تعلقات کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ معاشیات کا یہ تاریخی اسکول انگلستان کی کلاسکی معاشیات کی طرح اپنے ماحول کی آواز تھا

---

[1] کارل مارکس (تیسرا اڈیشن)، بارتی

آسٹریا میں معاشیات کا جو اسکول پیدا ہوا اس کے حامیوں نے قدر کے افادی نظریہ کی تشریح کی۔ امریکہ کے ماہرین معاشیات میں ایلے اور ٹاسگ خارجی زاویۂ نگاہ سے بحث کرتے ہیں۔ برطانیہ کا الفریڈ مارشل امتزاجی اور استقرائی طریقوں کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں افادۂ مختتم کا نظریہ پیش کیا جا چکا تھا۔ الفریڈ مارشل (۱۸۴۲ - ۱۹۲۴) نے افادۂ مختتم کے نظریہ میں نمایاں اضافہ کیا ولفریڈو پاریٹو (۱۸۴۸ - ۱۹۲۳) معاشیات پر ریاضیات کی تطبیق کرتا ہے۔ ویبلین (۱۸۵۷ - ۱۹۲۹) معاشیات میں شماریات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ لینن تیف، معاشیات پر اشتمالیت (کمیونزم) کے زاویہ نگاہ سے بحث کرتا ہے۔

دوسری بڑی لڑائی کے بعد معاشیات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ دنیا کا ہر ملک تعمیر نو میں معروف ہے۔ معاشی پروگرام مرتب ہو رہے ہیں۔ معاشیات محبوب علوم کی بزم میں داخل ہو چکی ہے۔

● جوش ملیح آباد

ہندوستان کی ترقی پسند تحریک ادب کا ام
جس نے دور غلامی سے لیکر موجودہ دور حکوم
تک ہمیشہ سچی آزادی کے تندوتیز نغمے گائے ہی
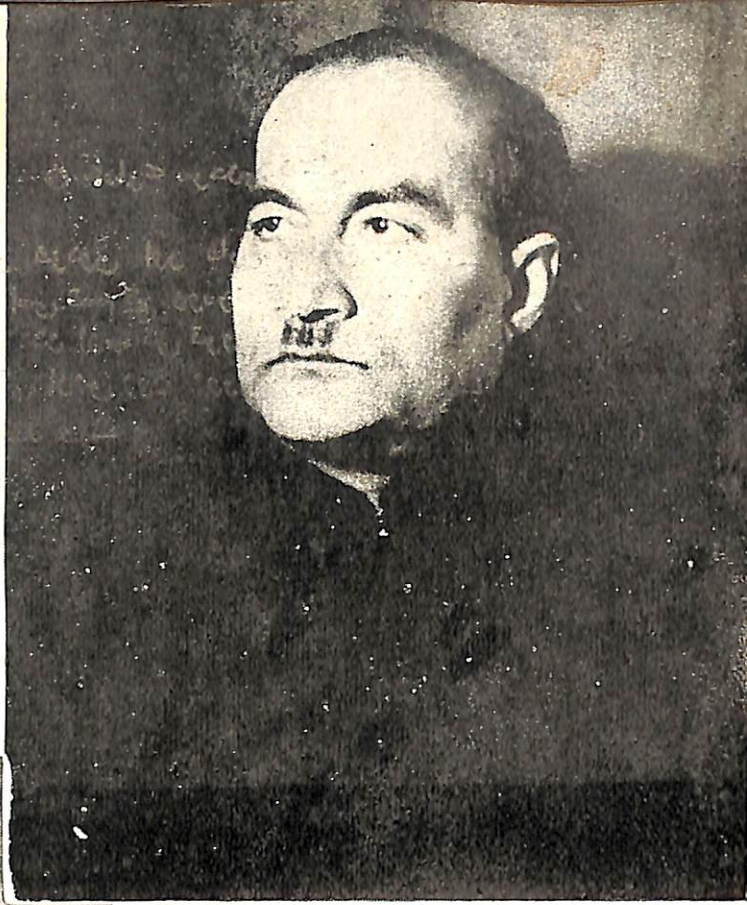
● احمد ندیم قاسمی

پاکستان کی ترقی پسند تحریک ادب کا
راہنما جس کی شاعری کے رواں دواں اور
نرم و نازک جھونکے عوام دشمن طاقتوں
کے لئے طوفانوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں

● ہمارے سرحدی فنکار

دائیں سے بائیں - رضا ہمدانی، خاطر غزنوی اور فارغ بخاری جنہوں نے صوبہ سرحد میں ادب برائے ادب اور اسی قسم کے دوسرے تفریحی کھلونوں کی توڑ پھوڑ کے بعد زندہ اور صحت مند ادب کی ترویج میں امکانی حصہ لیا ہے - اور آج صوبہ سرحد کی نئی ادبی پود پورے جوش و خروش سے ترقی پسند ادب کی رہنمائی قبول کر رہی ہے -
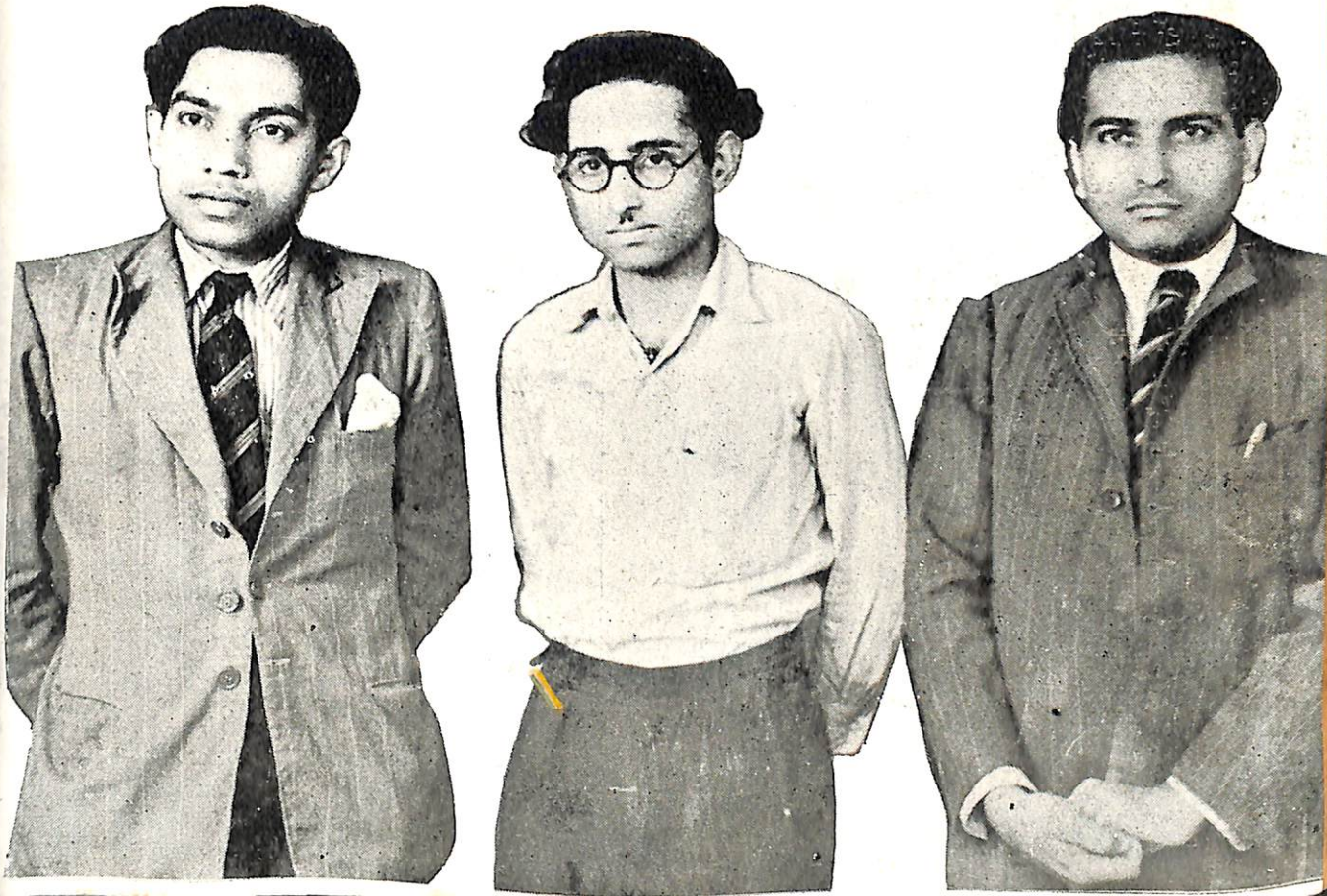
● مشرقی پنجاب کے ساتھی

دائیں سے بائیں - بلراج کومل، مخمور جالندھری، تخت سنگھ اور فکر تونسوی جو فرقہ دارانہ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کو امن و آشتی کے چھینٹے دے دے کر عوام کو انسانیت کا پیغام دے رہے ہیں - کیونکہ وہ انسان ہیں، ایسے انسان جو ساری دنیا کو ایک ہی برادری سمجھتے ہیں جس میں ہندو مسلم یا سکھ کی بجائے صرف انسان شامل ہیں -

● میرزا ادیب

● قتیل شفائی

فکر تونسوی

مسخرا

کنہیا لال کپور کو میں سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اُف! اس کے چہرے کے وہ طلسمی نقوش جو ذہن کی پوری گرفت میں کبھی آتے ہی نہیں۔ طلسمی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ اس چہرے میں کوئی جادو ہے۔ کوئی افسوں ہے۔ بلکہ یہ کہ کپور کے نقوش دیکھنے والے کے لئے ایک بڑی مصیبت بن جاتے ہیں۔ یہ نقوش کچھ قابلِ اعتراض حد تک مدھّم بھی نہیں۔ قابلِ فخر حد تک تیز بھی نہیں۔ یوں سمجھئے۔ کہ پنکھے پن اور دھیمے پن کو اگر ملا جُلا دیا جائے اور پھر کوشش کی جائے۔ کہ کپور کے رخسار۔ کپور کی آنکھیں۔ کپور کی ناک۔ اس کے ہونٹ اُس کی ٹھوڑی ذرا واضح اور روشن شکل میں سامنے آجائیں۔ تو اکثر ناکامی ہوگی۔ ناک کے پورے نقشے کو پکڑتے پکڑتے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ناک نہیں ہے رُخسار ہے۔ اور پھر رُخسار کی طرف نگاہ دوڑائی جائے۔ تو وہاں آنکھ کا سا عالم طاری دکھائی دیتا ہے —— اسی لئے تو میں اپنی مجبوری اور بیچارگی کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس شخص کے صحیح ترین نقش کا مکمل نمونہ کھینا اور ان سے کوئی صاف تصویر بنا سکنا انتہائی مشکل ہے۔

ویسے اگر عام فہم انداز میں کہا جائے تو ایک مٹ میلے سے چہرے پر لمبی سی ناک دکھائی دیتی ہے چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں جن کو عینک کے بڑے بڑے شیشوں نے بُری طرح چھپا رکھا ہے۔

یہ شیشے اکثر و بیشتر لیڈی کٹ کے ہوتے ہیں جس سے شاید کپور چہرے کو نسائیت کا دھوکا دینا چاہتا ہے۔

ہڈیوں بھرے، پچکے ہوئے گال، لکیروں بھری پیشانی، چہرے کی نسبت سے کان بڑے بڑے —— گویا تمام چیزیں ایسی، جن میں ٹھٹھک کر کھڑا کر دینے والی یا لمحہ بھر کے لئے ہی مبہوت بنا دینے والی کوئی کیفیت دکھائی ہی نہیں دیتی۔ امتدادِ زمانہ کی ٹھوکروں کے نشانات کا احساس چہرے کے ہر مسام سے پھوٹا پڑتا ہے۔ اور ان روتے ہوئے مساموں کو دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا ہوں۔ کہ ہاں! ایسا شخص ہی طنز نگار بن سکتا تھا۔ یہ دُکھی اور الم رسیدہ مسامات۔ زیرِ لب تبسم یا گُل بدامن مُسکراہٹیں تو بکھیرنے سے رہے۔ ان سے تو قہقہہ ہی پھوٹ سکتا ہے۔ زہریلا قہقہہ، جس کی تلخی میں ایک بھرپور دار ہو۔ جس کی لہریں گرد و پیش سے ٹکرائیں۔ تو ہر آدمی کو کپکپا دیں۔

بادی النظر میں کپور کو دُور سے دیکھئے۔ یا دُور ہی سے کیوں؟ چاہئے آپ نزدیک آکر گھور گھور کر اسے دیکھئے۔ تو ایک عام سا ستم رسیدہ آدمی دکھائی دے گا جس سے کسی خاص منفرد قسم کی ذہانت یا فراست کا پتہ نہیں چلتا۔ اور حیرت ہوتی ہے۔ کہ یہ شخص ادیب اور آرٹسٹ تو کجا کسی عام سی بات کو بھی ذرا علیحدہ اور اثر انگیز ڈھب سے بیان نہیں کر سکتا ہوگا —— ہمارا سماجی نظام اپنے استبداد کی بدولت بہت کم لوگوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اگر انہیں چوٹ لگے۔ تو وہ "اوئی" بھی کر سکیں۔

دباؤ اور گھٹن ہی اس نظام کے استبداد کا عام سا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ دباؤ اور گھٹن کپور کے نصیب میں بھی شامل ہو جاتا۔ لیکن اس کڑے کلیجے والے آدمی نے چوٹ کے ساتھ ہی ساتھ "اوئی" کا اظہار بھی سیکھ لیا۔ اس "اوئی" کو جاری رکھنے کی عادت بھی پیدا کر لی۔ اور یوں دباؤ اور گھٹن کی مسلسل نبرد آزمائی نے اسے قہقہہ لگانے کا فن سکھا دیا۔ اس قہقہے میں بے ساختگی تو ہے۔ لیکن کڑوی کسیلی بے ساختگی۔ اس میں زندگی تو ہے لیکن چیختی چلاتی زندگی —— مسرت اور ہنسی کے پردے پر کپور کے کھینچے ہوئے نقش و نگار کی شکل دیکھ کر ایک دُنیا لرز اُٹھتی ہے۔ خوف سے کانپ

کانپ جاتی ہے۔ اور یہی کپور کا آرٹ ہے۔ جو اس کی منفرد شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ اور جس نے جماعتی شخصیت کا احاطہ بھی کر رکھا ہے۔ غالب کے الفاظ میں سادگی و پُرکاری ہی اس کے کیریکٹر کا اہم عنصر ہے۔ اور سادگی و پُرکاری ہی اُس کے آرٹ کا نصب العین۔

چہرے کو علیحدہ کر کے دیکھئے۔ تو کپور کا باقی سارا جسم اتنا نمایاں اور اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہ میل بھر سے پہچانا جا سکتا ہے۔ پنجابی زبان کی ایک مخصوص اصطلاح "لم سلما" سے ذہن میں جو جاذبِ نظر اور رومانٹک سی تصویری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ کپور اس سے مکمل طور پر محروم ہے۔ لیکن "لم سلما" کا لفظ اُس پر صادق خوب آتا ہے۔ لمبے لمبے بازو۔ لمبے لمبے ہاتھ۔ لمبی لمبی ٹانگیں جو سڈول نہیں ہیں۔ جن میں اگرچہ مستقیمی ضرور ہے۔ مگر حسین بناوٹ نہیں۔ لمبی لمبی پیٹھ پر ہلکا سا جھکاؤ۔ اور کمر کے گرد مجنونانہ قسم کی حسینانہ لچک رہتی ہے تو جیسے پورا جسم بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ناچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ لچک اور بل ایک خاص آہنگ پیدا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان سے اگر کسی کو یہ خطرہ پیدا ہونے لگے۔ کہ لچکتے لچکتے یہ جسم کہیں راستے ہی میں اچانک ٹوٹ کر آ رہے گا۔ تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ ان لمبی لمبی ہڈیوں میں زندہ رہنے کی بے پناہ قوت ہے۔ ان کی لچک میں موت کی دعوت نہیں۔ بلکہ زندگی کا ایک مسلّمہ اور بے باک ڈھب پایا جاتا ہے۔ یہ پتلا پتلا جسم۔ سنگینوں اور سختیوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کا عامیانہ خطرہ بے معنی ہے۔

اسے اپنے اس پتلے جسم کا خود بھی کافی احساس ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ ایک انگریز خاتون سے ملا۔ تو اس کا یہ احساس ایک نہایت فخریہ لطیفے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس خاتون نے کپور کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ کپور صاحب! (you are as thin as a needle) کہ آپ تو اتنے پتلے ہیں جتنی سوئی ہوتی ہے۔ کپور نے بے ساختہ بھولپن سے جواب دیا۔ محترمہ! آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں۔

اسی لئے عورت کے متعلق کپور کا خیال ہے کہ وہ کم بخت جسم پر مرتی ہے۔ دماغ پر نہیں۔ اور دماغ پر شاید اس لئے نہیں مرتی کہ بچاری کے پاس دماغ ہوتا ہی نہیں۔

جب وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہو۔ تو اُس کے ستھرے کیریکٹر میں سونے پر سہاگہ کا کام ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لہراتے اور جھومتے ہوئے کوٹ پتلون کپور سے لگاؤ کھا نہیں سکتے۔ اس لئے اُس کے پتلے پتلے جسم کی غمازی کرنے کے فعل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دُنیا کا بڑے سے بڑا درزی بھی شاید اس سختی اور لچکیلے جسم پر کسی قسم کا سوٹ فٹ نہ کر سکے۔ ویسے میں نے کئی بار چاہا ہے۔ کہ یوں کوٹ پتلون پہنے ہوئے کپور سے جا کر کہہ دوں ـــــ "طنز نگار"! اگر تمہارے ہاتھ میں ایک چھڑی دے دی جائے۔ اور سر پر مینا ری فیلٹ اور اس کے ساتھ ہی خشخشی داڑھی کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ تو تم برنارڈ شا معلوم ہونے لگو۔ ممکن ہے میرے اس مذاق کو کپور سنجیدگی کا رُوپ دے دے۔ اور کسی حین تنہائی میں اپنے لباس کو برنارڈ شا کے معیار کا لباس بنا کر دیکھ لے ـــــ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے شا کی نقل کو بھونڈی نقل سمجھے گا۔ اور کبھی اسے عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔

کپور کی عام زندگی جن جن سیڑھیوں سے گزری ہے اس میں بہت کم اہم واقعات یا حادثات پائے جاتے ہیں۔ ایک اوسط ذہین لڑکے کی طرح میٹریکولیٹ، ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایم۔ اے کے مراحل طے کرتا رہا۔ امتحانوں میں کبھی دوسرا اور کبھی چوتھا رہا۔ بقول کپور کے زندگی میں کبھی اوّل رہنے کے فخر کو برداشت نہیں کر سکا۔ ہاں، جب پیدا ہوا۔ تو پہلی جنگِ عظیم چھڑنے میں ابھی چار سال باقی تھے۔ اس لئے اس حادثہ سے بھی محروم رہا۔ ایک بار موڈ میں آ کر وزن تولنے والی مشین میں اکنی ڈال بیٹھا۔ بس۔ پھر تو زبردستی تُلنا پڑا۔ اور ثابت ہوا کہ حضرت پچاس سیر سے کچھ زیادہ ہیں۔ اس وقت سے آج تک اس قسم کا موڈ دوبارہ پیدا نہیں ہوا۔ اور کپور صابر شاکر ہو کر بیٹھ رہا۔ کوئی درزی جب اس کی قمیص کا ماپ لیتے وقت چھاتی ماپنے لگتا ہے۔ تو اسے نہایت بے تکلف انداز میں کہہ دیتا ہے۔ بھئی جانے دو۔ تیس انچ سے زیادہ کبھی

بڑھ ہی نہیں سکی کمبخت!"

گھر میں وہ باریک اور مہین ململ کی دھوتی پہن کر پھرتا ہے۔ لیکن پھرتا کہاں ہے وہ؟ پھرنے کی اُس میں تاب ہی کہاں باقی رہ گئی ہے؟ وہ تو بس دھوتی پہن کر ریڈنگ روم میں پڑے ہوئے صوفے پر لیٹا رہتا ہے اور پڑھتا رہتا ہے۔ نہیں پڑھتا کبھی میں نے غلط کہا۔ اُسے پڑھنے کے لئے دم ہی کون لینے دیتا ہے؟ وہ تو بمشکل صبح کا ڈیلی اخبار سرسری نگاہوں سے دیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ جونہی صبح وہ بغیر ہاتھ مُنہ دھوئے، داتن کئے، دھوتی پہنے اس صوفے پر آکر بیٹھتا ہے۔ تو ملنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ ان ملنے والوں میں کالج کے ذہین طالب علم ہوتے ہیں جو اپنے ذہن پر جِلا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اور کپُور کے سامنے یوں بے تکلّف بیٹھے رہتے ہیں جیسے وہ ایک پروفیسر نہ ہو۔ جس سے خوف کھایا جا سکے۔ بلکہ ایک ذہین ترین دوست ہو جس سے گھُل مل کر باتیں کی جا سکیں۔ اور اخذ لذت کے سائے میں اخذ علم کیا جا سکے ـــــ پھر کئی ایک مفلس طالب علم ہوتے ہیں۔ جو اُس سے زندگی کے رُکے ہوئے دھارے کو آگے چلانے کے مشورہ حاصل کرنے آتے ہیں۔ کالج کی کتابیں کے پبلشر ہوتے ہیں جن کے بینک بیلنس کا بتدریج اضافہ، کپور کے تیز طرّار قلم کا رہین منت ہوتا ہے یہ پبلشر اس کے آگے پروفوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اُس کے قلم کو دیکھ کر چاہتے ہیں۔ کہ یہ قلم چلے اور اس تیزی کے ساتھ چلے کہ کل صبح ہی انہیں ڈیڑھ سو صفحوں کے پروف تصیح شدہ حالت میں مل جائیں۔

پھر چھوٹے اور بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ چھوٹے ادیب کپُور کی دلچسپ باتیں سُننے کے لئے آتے ہیں۔ بڑے ادیب چالو ادبی سیاست پر اُس سے بحث کرنے کے لئے آتے ہیں۔ رسائل کے ایڈیٹر آتے ہیں جو اپنے پُرانے سالناموں کی ہیبت کا رُعب جما کر اُس سے مضمون کا وعدہ مانگنے آتے ہیں۔ ادبی کتابوں کے ناشر آتے ہیں۔ جو کپُور کی تعریفوں کے پُل باندھ کر بغیر رائلٹی کے اس سے کتاب کا مسودہ لے جاتے ہیں۔ محلے کے کلرک آتے ہیں۔ جو اس کے ساتھ کانگرس، مسلم لیگ اور راشٹریہ سنگ کی سرگرمیوں پر بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ فلم پروڈیوسر آتے ہیں۔ جو اُسے کلکتہ اور بمبئی کے طلسم زار میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اور چند ایک رشتہ دار آتے ہیں جو کپور کو اس درجہ مصروف دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ کہ وہ اپنے گھر بار کا مطلق خیال نہیں کرتا۔ اور بے معنی اور بے فائدہ باتوں میں گھر کر بگڑ گیا ہے۔

کپُور ان سب آنے والوں کا ایک معنی خیز تبسم سے استقبال کرتا ہے۔ صوفے پر قدرے اچھلنے کی سی کیفیت میں اُٹھتا ہے۔ پھر انہیں سیگرٹ پیش کرتا ہے۔ چائے پلاتا ہے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ نہایت شگفتہ اور محبوب لہجہ میں اُن سب کے مسائل کو چٹکیوں میں حل بھی کر دیتا ہے۔ اور وہ سبھی یہ خیال لے کر چلے جاتے ہیں کہ کپُور ایک نہایت مخلص آدمی ہے۔ نہایت گریٹ آدمی ہے۔ نہایت معقول آدمی ہے۔

اُس کی باتیں خاص پیچیدہ نہیں ہوتیں۔ نہ اُن میں عالمانہ رنگ ہوتا ہے۔ اور نہ وہ کسی ذہنی گہرائی کا احساس دلاتی ہیں۔ لیکن جب وہ بے ساختہ تسلسل کے ساتھ باتیں کر رہا ہوتا ہے جب ہر دوسرے تیسرے فقرے پر وہ ایک بچے تلے قہقہہ کے ساتھ ملاقاتی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔ داد کی تالی بجاتا ہے۔ اس کے کندھوں پر، پیٹھ پر، زانو پر، ہاتھ مارتا ہے۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔ لیکن اُس کہی جانے والی بڑی بات کی پوری شدت اس لمحے بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات تو حیرت بھی ہوتی ہے کہ کپور نے کوئی خاص اہم اور عظیم بات تو کہی نہیں۔ پھر یہ کامیڈی قہقہہ کیوں؟ یہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا کیسا؟ ـــــ مگر آپ کپور سے جدا ہو جایئے تو دو تین گھنٹے کے بعد آپ اپنے اندر اُس قہقہے کا اثر محسوس کریں گے اور اس شدت کے ساتھ چونک پڑیں گے۔ جیسے واقعی کسی بہت بڑی بات پر چونکا جا سکتا ہے۔ بس یہی کپور کی باتوں کا طلسمی پہلو ہے۔ اتنے لاابالیانہ پن سے، اتنی بے نیازی سے باتیں کرے گا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ دُنیا کے بڑے بڑے حادثے کو اپنے اندازِ بیان کی بے پروائی سے یوں بے معنی اور بے اثر بنا کر

سکھ دے گا۔ اور آپ کے ذہن پر پڑے ہوئے بوجھ کو یوں تسلی جلنے کا اشارہ دے گا کہ ایک بار تو دماغ پر ایک لطیف قسم کا غبار چھا جائیگا۔ لیکن جیسا کہ مَیں لکھ چکا ہوں رپورتاژ سے جدا ہونے کے بعد آپ سوچئے۔ کہ کپور کا قہقہہ بے پناہ معنی پیدا کرتا ہوا آپ کے دل و دماغ میں گونج رہا ہوگا۔ جیسے کہہ رہا ہو — "میری جان! تم اس حادثے کو مذاق سمجھ رہے تھے؟ یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی ضرب نہایت کاری ہے۔ ذرا احتیاط کرنا۔ اور نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ زندگی اتنی سادہ لطیف اور نظر انداز کئے جانے کے قابل چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک بھرپور چوٹ ہے۔ اس چوٹ کو سہنے کی قوت پیدا کرو۔ ورنہ مر جاؤ گے، پس جاؤ گے —!"

کپور کی باتوں کا بے ساختہ انداز اور ہلکا پھلکا پن اتنی خوفناک سنجیدگی کے اثرات رگ و پے میں چھڑک جاتا ہے۔ کہ لبسا اوقات تو میں اس سے دوبارہ ملتے ہوئے ڈرنے لگتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ وہ پھر اسی بے ساختہ پن سے باتیں کرے گا۔ قہقہے لگائے گا۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارے گا۔ اور اپنے اندازِ بے شدت چھپی ہوئی گہری قنوطیت، پھوڑے دُکھ اور اٹل غمگینی کی پرچھائیں بھی مجھے نہیں دکھلائے گا۔ کتنا خوفناک ہے۔ یہ طنز نگار۔ کتنا بڑا مذاق کرتا ہے یہ دُنیا بھر سے۔ کتنی پیچیدگی کے مراحل غور کرنے پڑتے ہیں۔ اُس کے اصلی مرکز تک پہنچنے کے لئے۔

وہ آپ کو پتہ نہیں چلنے دے گا۔ کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟ — جو کچھ کہہ رہا ہے۔ کیوں کہہ رہا ہے؟ — جو کچھ اُسے کہنا چاہیے۔ کیا اُسی چیز کے متعلق ہی کہہ رہا ہے؟ — آپ کے مسئلے کو وہ کسی بندھے بندھائے فارمولے کے ذریعے حل نہیں کرتا۔ کسی بنے بنائے زاویئے سے اُسے نہیں دیکھتا۔ اگر آپ اس سے پوچھیں کہ اگر پانچ میں سے آٹھ تفریق کر دئے جائیں۔ تو کیا باقی رہے گا۔ تو وہ ایک مخصوص قہقہہ کے ساتھ آپ کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہے گا — "چھوڑو یار! اگر کچھ بچ بھی گیا۔ تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ ویسے میرے خیال میں آٹھ کا ہندسہ کوئی معقول ہندسہ نہیں ہے۔ اگر اس کا نام آٹھ نہ ہوتا۔ بلکہ کچھ اور ہوتا۔ مثلاً دو یا تین۔ تو زیادہ خوبصورت شکل اختیار کر سکتا تھا" اور پھر وہی بے ساختہ قہقہہ۔ جیسے کسی بہت بڑے کا تالاب میں زہر کی چسکی نہایت تیزی کے ساتھ گھول رہا ہو۔ وہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ کہ کسی بات کا واضح شعور دُکھ کی علامت ہے۔ اور وہ دُنیا کو دکھ دینے نہیں۔ بلکہ دُکھوں پر مسکراہٹ کا رنگ چھڑکنے کے لئے آیا ہے۔ اگر کوئی دُکھ، مسکراہٹ کے خوش رنگ پردے میں لپٹا لپٹایا ہوا زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ تو اس کمبخت کی ٹیسیں تو کم ہو جاتی ہیں — اس لئے کپور کی باتیں سمجھ میں کم آتی ہیں۔ جذبات سے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں۔ کپور جو کچھ کہتا ہے۔ اُس سے اتنا بھی پتہ نہیں چلتا۔ کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ بات کر رہا ہے۔ یا مذاق میں اُڑا رہا ہے۔ اس لحاظ سے تجاہل عارفانہ کی ترکیب اُس کی شخصیت کے لئے نہایت موزوں بن جاتی ہے۔

اور اس کے کردار کی یہی خوبی (اگر اُسے خوبی کہا جا سکے)، اُس کے طنزیہ آرٹ میں بُری طرح گھس کر آ گئی ہے۔ وہی سادہ سادہ سے فقرے وہی ہلکے پھلکے سے الفاظ، عام فہم شگفتہ بیان۔ لیکن جیسے جیسے آپ کی نظر اس کے مضمون پر پھیلتی چلی جائے گی۔ آپ کے دماغ میں ہنستی کھیلتی ہوئی ٹیسیں اُٹھتی چلی جائیں گی۔ اور ایک سادہ سے تسلسل میں گندھا ہوا اس کا مضمون آپ کے دل و دماغ کو بے چین کرتا چلا جائے گا۔ یہ بے چینی مٹھاس بھری ضرور ہوگی۔ لیکن اس مٹھاس پر آپ کو چڑچڑاہٹ بھی ہونے لگے گی۔ کہ اس شخص کو پڑھنے والے پر اتنا بھی رحم نہیں آتا۔ کہ اگر ضرب لگاتی ہے، تو ایک ہی مرتبہ سیدھے سبھاؤ سے لگاؤ۔ یہ بھی کیا۔ کہ چوٹ بھی لگائی اور پھر دماغ میں اس قسم کی کیفیت بھی پیدا کر دی۔ کہ "برادرم! اس چوٹ کو ہلکے پھلکے سہلاؤ۔ بڑا مزہ آئے گا۔" سہلانے کا مزا مسلّم! مگر اس سے چوٹ کا مادی نتیجہ تو بدل کر نہیں رہ جائے گا۔

اور مَیں کہتا ہوں۔ کہ کپور مادی نتیجے کی حقیقت تک تو آپ کو پہنچا ہی دیتا ہے۔ اور اس راستہ سے پہنچا دیتا ہے جیسے آپ کسی ریشمی پنگوڑے

میں جھولتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے ہوں اور نتیجہ تک نہایت خوبصورت اور خوشگوار انداز میں پہنچا کر آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس لئے چھوڑ دیتا ہے۔ کہ اس کی سماجی ذمہ داری یہاں تک آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا کام تو یہی ہے۔ کہ نہایت پُراسرار اور خوبصورت چالاکی کے ساتھ آپ کو زہر کی حقیقت کے پاس لے جائے۔ اگر وہ آپ کو کانٹوں بھرے راستے سے لے جاتا۔ تو ممکن ہے آپ راستے ہی میں دم توڑ کر رہ جاتے۔ لیکن وہ انسانیت کا ظالم جراح نہیں ہے۔ ہمدرد ڈاکٹر ہے —— اس ہمدرد ڈاکٹر کے پاس اپنا ایک خاص قسم کا کلوروفارم ہے۔ جس کے ذریعے وہ انجکشن کرتا ہے یہی کلوروفارم ہی اُس کا آرٹ ہے۔ اسی مخصوص کلوروفارم ہی سے کپُور کے مریض صحت و شفا کا کھیل کھیلتے ہیں۔

چونکہ وہ کوئی دیوتا اور فرشتہ نہیں ہے۔ اس لئے عام انسانی خصائص اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ اُس میں بھی موجود ہیں۔ بعض لوگ۔ اس کی ان کمزوریوں کا ذکر کر کے لذت حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں چائے کی میز پہ بیٹھے ہوئے اگر آپ اُس کے سامنے سگرٹ کی بھری ہوئی ڈبیہ پھینک دیں۔ تو وہ اپنے بہت سے اہم پروگرام بدل کر۔ اس سگرٹ کی ڈبیہ کو ختم کرنے کی خواہش میں گرفتار ہو جائے گا۔ اور نئی سگریٹ نکال کر اسے سلگاتے ہوئے۔ ایک انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جیسے وہ انگڑائی کہہ رہی ہو "اب کیا رہ گیا ہے اس ڈبیہ میں۔ اب بیٹھے رہنے کے کیا معنی ہیں؟" —— ہوٹل میں چائے کا بِل اگر کوئی دوسرا ادا کرے۔ تو اس کی طرف یوں دیکھے گا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "شاباش کیا تم نے دوست! تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے تھا ——" شراب کا کوئی پیگ اگر کبھی کسی نے پلا دیا۔ تو پی لے گا۔ ورنہ عمر بھر اُس کے بغیر جی سکتا ہے —— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہ مالی اعتبار سے کنجوس ہے۔ نہیں۔ اُس کے گھر پہ جائیے۔ آپ کو سگرٹ پر سگرٹ پیش کرتا چلا جائے گا۔ چائے پر چائے پلائے گا۔ بسکٹوں اور مٹھائیوں سے آپ کی تواضع کرے گا۔ اور آپ کو فرطِ حیرت میں چھوڑ جائے گا۔ کہ یہ شخص جو کل چائے کی میز پہ اپنی بظاہر کنجوسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیونکر بغیر سمجھے بوجھے دھن لٹاتا چلا جا رہا ہے۔

مگر ایسا ہے اور یہ اس لئے ہے۔ کہ وہ ایک عام قسم کا سماجی انسان بھی ہے۔ اس کی کرداری انفرادیت۔ عام سماجی ماحول میں آ کر اُس سے بالکل علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اُسے بیوی سے محبت بھی کرنی پڑتی ہے۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں بھی مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ ایک پروفیسر کے سے معیار کو قائم رکھنے کے لئے گھر کی فضا کو اُسی معیار میں ڈھالنا بھی پڑتا ہے۔ بچے بھی پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، پڑھائی لکھائی کا دھیان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اپنی چھوٹی سی بچی کے ساتھ توتلی زبان میں باتیں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ اُسے ہنستا اور گدگدانا بھی پڑتا ہے۔ جب اُس کے دونوں بچے۔ تیر کمان سنبھالے، لکڑی کی بندوق بنائے اس کے سامنے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ تو انہیں دادا کے سے انداز میں ڈانٹنا بھی پڑتا ہے۔ اگرچہ یہ ڈانٹ اکثر بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ کپُور میں روایتی باپ کا سا دبدبہ مفقود ہے۔ اُس کی ڈانٹ میں مسکراہٹ کا سایہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔ اس کی ڈانٹ۔

اسے مالی لحاظ سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنی آمدنی کے مقابلہ پر کم خرچ کرنا جانتا ہے۔ پھونک پھونک کر خرچ کرتا ہے بیوی پر، بچوں پر، گھی پر، راشن پر، لکڑیوں پر، اور اسی طرح کے سینکڑوں دوسری ضروریات پر۔ لیکن اس کی پیشانی پر بل نہیں آتے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ڈیڑھ سو صفحے پروف پڑھانے والا پبلشر اس کا غلام ہے۔ وہ اُس کی تمام مشکلیں حل کر سکتا ہے۔ ادبی تخلیقات نے اسے کبھی مالی امداد بہم نہیں پہنچائی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی پہلی کتاب ایک پبلشر کو مفت دے دی تھی۔ اور دوست احباب کے احتجاج کرنے کے باوجود اس کی یہ ہمت نہیں پڑی تھی۔ کہ اس پبلشر سے پیسوں کا تقاضا کر سکے۔ مگر پھر بھی مالی اعتبار سے وہ مطمئن ہے۔ اس لئے کہ اُس کی زندگی کے نظام میں ایک توازن اور باقاعدگی اور احتیاط شامل ہو چکی ہے۔ غریب والدین کا بیٹا مالی اعتبار سے لااُبالی پن اختیار ہی نہیں کر سکا۔ اگرچہ ایسے مواقع کئی آئے تھے۔ جبکہ وہ اپنے دیرینہ خاندانی افلاس سے انتقام لے کر زندگی کو بے اختیار اور پُرسوز لہروں پہ بہنے کے لئے چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اور ایک مخصوص سماجی انضباط کے پنجے سے رہائی نہ پا سکا۔ اسی لئے تو

اسے ملنے والے ایک شریف آدمی کہتے ہیں۔ایک معزز پڑوسی کہتے ہیں —— کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سماجی اعتبار سے وہ بیشتر باتوں میں ہمارا ساتھی ہے۔اور کوئی علیحدہ ڈرا دینے والی یا حیرتناک شخصیت نہیں ہے۔

لیکن کیا کپور واقعی ایک شریف آدمی ہے۔ ایک معزز پڑوسی ہے۔ کیا جب وہ گفتگو کر رہا ہوتا ہے۔تو کیا یوں محسوس نہیں ہوتا۔کہ وہ اپنے ملاقاتی کو بنا رہا ہے۔اور اس بنانے میں اُسے انتہائی ابلیسانہ قسم کی لذت محسوس ہو رہی ہے۔اس قسم کی ابلیسانہ لذت کا مظاہرہ اُس نے ایک بار ایک محفل میں کیا تھا۔بدقسمتی سے ایک آدمی کپور سے بحث میں اُلجھ پڑا۔کپور نے دوران گفتگو میں اُس سے کہا۔"میں آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا۔"بغیر سوچے سمجھے اور چوٹ کا جواب چوٹ میں دینے کی غرض سے اُس شخص نے بھی کپور سے کہہ دیا۔کہ میں بھی آپ کو شریف آدمی ہی سمجھتا تھا — "یہ چوٹ کوئی اتنی وزنی نہیں تھی۔اس لئے کپور نے چوٹ کو وزنی کرنے کی خاطر اُس شخص سے کہا — "آپ ٹھیک سمجھے تھے۔ دراصل غلطی مجھ سے ہوئی۔"

اور ایک لمحہ تک تو وہ آدمی کچھ چکرا سا گیا۔لیکن دوسرے ہی لمحے جب ساری محفل کو چوٹ کی گہرائی کا احساس ہوا۔تو سارے کھکھلا کر ہنس پڑے۔

کپور اس قسم کا بہادر آدمی بھی نہیں ہے۔کہ اپنے مخالف کو لے پالک نہ چیلنج کر سکے۔اپنے بل بوتے پر اعتماد کر کے اسے محاربے کے لئے پکار سکے۔ اگرچہ ایک طنز نگار کی زندگی ایسے حادثوں کے امکانات سے بھرپور ہو جاتی ہے جن کی وجہ سے مخالفین کی ایک عجیب و غریب جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔اور کپور کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔ وہ اگر کوئی چوٹ کرتا ہے۔کیونکہ وہ چوٹ کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔تو بعض چوٹ سہنے والے بلبلا اُٹھتے ہیں۔اور جب یہ بھی دیکھتے ہیں۔کہ چوٹ لگانے والا کپور جیسا منحنی اور دُبلا پتلا شخص ہے۔تو آنکھیں بھی نکالنے لگتے ہیں۔اگر جواب میں کپور بھی آنکھیں نکال سکتا۔تو شاید آج کپور اپنی اس شکست خوردہ حالت میں دکھائی نہ دیتا۔اس کی شخصیت کے تمام خطوط اس امر کی غمازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں —— کہ "مجھ سے تمہیں کیا لینا ہے بھائی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں تمہارا کچھ بگاڑ بھی کیا سکتا ہوں؟ میں تو ایک شریف سا انسان ہوں۔ باقی رہی طنز۔تو وہ میرے بس کا روگ نہیں۔اس پر میرا کچھ اختیار بھی نہیں۔ وہ تو میری فطرت میں بغیر اتہ پتہ لگائے داخل ہو گئی۔کہ اس افلاس زدہ، ہڈیوں کے ڈھانچے اور کمزور سے انسان کے اندر داخل ہوتا اُس کے ساتھ مذاق کرنا تو نہیں۔

چنانچہ سپردگی اور بیچارگی کا یہ انداز اسے کہیں بھی مقابلہ بازی کی حیثیت میں پیش نہیں ہونے دیتا۔ایک مرتبہ لاہور کی ایک ادبی انجمن حلقۂ اربابِ ذوق میں اُس کے ایک طنزیہ مضمون پڑھنے پر لاہور کا ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد بوکھلا اُٹھا تھا۔اور کپور کے خلاف وہ طوفانِ بدتمیزی اُٹھایا تھا۔کہ کپور کو اعترافِ شکست بھی کرنا پڑا تھا۔اور معافی بھی مانگنی پڑ گئی تھی۔

اسی طرح — ایک دوسری مرتبہ اُس کے مشہور مضمون "اہل زبان" پر لاہور سے پٹنہ تک ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔اور چاروں طرف سے "تیرا یہ مان! تیرا یہ مان" کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ وہ تو کہیئے۔چند ایک پشت پناہوں نے کپور کو اہلِ زبان کے ان تابڑ توڑ حملوں سے بچا لیا۔ ورنہ شاید کپور یہاں بھی معذرت طلب کر کے یہ وعدہ کر لیتا۔کہ میں ہندوستان چھوڑ کر چین چلا جاؤں گا۔اور اسی طرح اپنی طنزیہ عظمت کا ایک اور ثبوت مہیا کر دیتا۔کہ —— "دوستو! مجھ میں لڑنے مرنے کی تاب نہیں ہے۔ ویسے انصاف سے دیکھا جائے۔تو تم میں بھی کوئی خاص ایسی تاب و تب نہیں ہے۔جس کے بوتے پر تم میری طنز کو برداشت کر سکو۔طنز برداشت کرنے کے لئے میرے جیسا کلیجہ چاہیئے۔ویسے تمہاری تلملاہٹ سے مجھے اتنی تسکین تو ہو ہی جاتی ہے۔کہ میری باتوں میں واقعی چبھن ہے۔اور چبھن جھوٹ پر نہیں ہمیشہ سچ کی نوک پر نمودار ہوتی ہے۔"

بہت سے قسم کے لوگوں میں کپور کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔لیکن یہ عزت بھی ہر جنس کے لئے مختلف قسم کی شکل اختیار

کرجاتی ہے — پروفیسر لوگ کپور کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ اُس کا ایک ادبی مقام ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ پڑھانے کے ایک خاص ڈھب کا مالک ہے۔ کالج کے طالب علم اُس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا اور پاپولر پروفیسر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کے لکھے ہوئے خلاصے "بڑے کام کی چیز ہوتے ہیں۔ اور امتحانوں کے پاس کرنے میں مدد پہنچاتے ہیں۔ ادیب لوگ اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے۔ کہ وہ ایک اچھا ادیب ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی ہے۔ پبلشر اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ اچھی گفتگو کرسکتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی کتاب بکتی خوب ہے۔ محلے والے اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا پروفیسر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ایک شریف پڑوسی ہے۔ اُس کے اپنے بچے اُس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک جابر باپ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی عزت کرنے میں کوئی خاص بنیادی فرق نہیں پڑجاتا۔ اور اب رہی اس کی بیوی۔ تو وہ کپور کی عزت ایک ایسے خاوند کے نقطہ نظر سے کرتی ہے۔ جس کا اس دُنیا میں سوائے بیوی کے کوئی نہ ہو۔

ایک اَور قسم کی عزت سب سے نرالی ہے۔ اَور کپور کے شایانِ شان بھی۔ اور وہ ہے لاہور کی ایک دیرینہ ادبی انجمن کی طرف سے کپور کی عزت افزائی۔ اور وہ یوں کہ اس حلقہ کے بعض سربرآوردہ ارکان اس کی عزت اس لئے کرتے ہیں۔ کہ عزت کئے بغیر اُن کے سامنے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔ ورنہ بقول کپور کے اگر ان کا بس چلے۔ تو کپور کو کچا چبا جائیں۔ اور اس کے مضمون میں زبان کی غلطیاں نکال نکال کر کپور کو ادھ مُوا کردیں۔

حُسن اور عشق کے روایتی معاملہ میں کپور کے کاغذات بالکل کورے چلے گئے ہیں۔ ان کاغذوں کو چھیڑا تک نہیں گیا۔ اور آج تک یہ عالم ہے کہ اس کورے کاغذ کو چھیڑنے کی کسی میں ہمت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوکر سامنے کی چھت پر کھڑی ہوئی عورت کی طرف نگاہِ التفات سے دیکھ بھی لے۔ تو وہ عورت اتنا بھی نہیں کرے گی۔ کہ دوپٹے کا پلّو ہی سر پہ لے لے۔ یا آنکھیں چرا کر دوڑتی ہوئی، گھر کی سیڑھیاں اُتر جائے — اگر وہ بن ٹھن کر گھر کے دروازے سے باہر نکلے۔ تو گلی محلے میں بیٹھی ہوئی عورتیں اُسے احترام سے تو دیکھ سکیں گی۔ لیکن چونک کر نہیں۔ ذراسی جُنبش یا ذراسی لرزش بھی تو پیدا نہیں ہوسکے گی اُن میں۔ بس یوں جیسے گلی میں سے کوئی بچارا، شریف سا گائے کا بچھڑا چلا جا رہا ہو۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہو — "اگرچہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ کہ میرے گلی میں اترنے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ لیکن اس میں تمہارا بھی کیا قصور ہے۔ تمہارے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کے لئے میری کوئی بھی تو کوشش کامیاب نہیں ہوسکی"۔

سیاسی اعتبار سے شاید وہ کسی بھی مدرسۂ فکر کا قائل نہیں ہے۔ "شاید" میں نے اس لئے کہا۔ کہ وہ اپنی گفتگو میں سنجیدگی اور یقین کا رنگ آنے ہی نہیں دیتا۔ آپ اس کے ساتھ سیاست پر گفتگو کریں۔ تو وہ اُسے مذاق میں اڑانا شروع کردے گا۔ لیکن اس مذاق مذاق میں بھی اگر کوئی آدمی یہ اندازہ لگانا چاہے، کہ جونہی اُسے کپور کی سیاسی گفتگو میں کسی ایک لمحہ کے لئے بھی قدرے اعتماد اور عنایت کی جھلک مل جائے۔ تو وہ اس کے اصلی سیاسی رجحان کو سمجھ سکے۔ تو وہ ناکام رہے گا۔ کیونکہ کپور ایسا موقع آنے ہی نہیں دیتا۔ میں نے خود کئی مرتبہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ مگر کپور کی طرار مزاجی اور سیلابی مذاق نے مجھے کسی مقام پر ٹھہرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں نے کتنے ہی اندازے لگا لگا کر چھوڑ دیے۔ کبھی میں سوچتا۔ کہ اُس نے ایک نہایت ترقی پسندانہ بات کہی ہے۔ اس لئے وہ شاید کمیونزم کا حامی ہوگا۔ کبھی سوچتا۔ ہاں اب وہ ذرا ذرا سوشلزم کی طرف جھکتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ کبھی سوچتا۔ وہ ہندو سبھا کے متعلق باتیں کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے وہ کانگرسی خیالات رکھتا ہو۔ کبھی مسلم لیگ کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کا جھکاؤ راشٹریہ سنگ کی طرف دکھائی دینے لگتا — لیکن نتیجہ ہمیشہ "صفر" ہی نکلتا۔ وہ ہر تحریک پر تبصرہ کرتا اور یوں جیسے اُن سبھوں کو چٹکیوں میں اڑا رہا ہو۔

مذہب کے متعلق کپور کے خیالات دو تین فقروں میں سموئے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کی ہیئت کذائی دیکھیں جبکہ اس نے مخصوص دھوتی پہن رکھی ہو۔ تو کوئی مہا پنڈت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "پنڈتائی" سے وہ اتنا ہی دُور ہے۔ جتنا کوئی کافر خدا سے ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے۔ کہ مذہب بے وقوفوں کے لئے ہے۔ کیونکہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی بات نہیں بتائی جاتی۔ جسے ایک ذہین آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو۔ اس لئے ذہانت، مذہب کی محتاج کبھی نہیں رہی۔ ہاں بیوقوفوں کو مذہب کے توسّط سے بڑی کامیابی کے ساتھ پھانسا جا سکتا ہے۔

جب کبھی اُسے خدا کے متعلّق گفتگو کرنے کا موقع مل جائے — تو اُس کا طنز بہت بے باک ہو جاتا ہے۔ شائد اس لئے کہ ان دیکھی چیز سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ ہر شخص کے چہرے کو خدا نے مسخ کر ڈالا صرف اس لئے تاکہ ذرا تنوّع پیدا ہو جائے۔ اس لحاظ سے ہر شخص کی رسوائی کا باعث دوستوں سے پہلے خدا ہی ہے۔ آدم و حوا کو اگر خدا نے جنّت سے صرف اسی لئے نکلوا دیا۔ کہ انہوں نے گندم کا ایک آدھ دانہ کھا لیا تھا۔ تو اُن کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہُوا۔ اور اس جرم کے لئے خدا کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو فراخدلی کے ساتھ معاف کر دے۔

جب لاہور میں فسادات انتہائی عروج پہ پہنچ چکے تھے۔ اور وہ گھر میں مقیّد رہتا تھا۔ تو مَیں قریباً ہر روز اس سے ملا کرتا تھا۔ وہ اپنی نشست گاہ کے اُسی مخصوص صوفے پہ دھوتی پہنے ہوئے، سگرٹ پیتے ہُوئے دکھائی دیتا۔ اور اس کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان دکھائی دیتا جیسے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں رہا۔ ہنس ہنس کر قہقہے لگا لگا کر وُہ باتیں کرتا رہتا۔ محلّے کے لوگ نہایت وحشت انگیز اور خوفناک خبریں آ کر ذکر سناتے۔ لیکن اس کے چہرے پر شکن تک نہ آتی جیسے وہ تاریخ کے اس عظیم ترین حادثے کو صرف ایک مذاق سمجھ رہا ہو۔ ممکن ہے۔ اُس لرزہ خیز وقت میں، جبکہ فسادیوں سے ہر لمحہ خطرہ کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہ رات کے کسی لمحے میں بیوی کے دباؤ پہ چند ایک منٹ کے لئے سوچ لیتا ہو۔ کہ ہاں! انہیں جان بچا کر بھاگ جانا چاہئیے۔ لیکن عام طور پر اس کی پیشانی متبسّم رہتی۔ شاید کہنا چاہتا ہو۔ کہ موت سے ڈرنا کس قدر بے معنی ہے۔ انسانی بربریت سے گھبرانا جہالت ہے۔ اگر وہ مر بھی جائے گا۔ تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟ آخر زندگی اس قدر کشش انگیز اور جاذب چیز تو ہے نہیں۔ کہ اُس کی خاطر اپنی اطمینان بخش مسکراہٹ کو بھی مار دیا جائے — اس لئے کپُور کے بیان کے مطابق اُس نے اپنا سامان کئی مرتبہ باندھ باندھ کر گلی میں لا رکھا۔ اور شام کو پھر اندر لے گیا۔ بعد کھول دیا۔ صبح پھر باندھ کر گلی میں لا رکھا اور شام کو پھر لے جا کر کھول دیا — اور بالآخر جب وہ گھر چھوڑ کر ایک ٹرک پہ سوار ہُوا۔ تو اپنی قیمتی سے قیمتی کتابوں کے ٹرنک گھر ہی پہ چھوڑ آیا۔ کیونکہ اس کی بیوی کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ گھریلو برتن، بستر اور کپڑے ان کتابوں سے زیادہ کار آمد چیزیں ہیں۔ چنانچہ اُس نے بیوی کی نگاہوں کو اپنی خواہشات کا مرکز بنا لیا۔ اور کتابوں کے بجائے گھر کا سامان ہمراہ لے آیا۔

لاہور جیسے مہذّب، مکمّل، رنگین اور ہنگامہ خیز شہر کو چھوڑ کر وہ کہاں چلا گیا؟ کتنے ہی مہینوں تک کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ کہ کپور کہاں گیا ہے۔ نہ جالندھر میں۔ نہ دلی میں۔ نہ شملہ میں۔ کیا وہ کسی دُور دراز گاؤں میں چلا گیا ہوگا؟ مَیں نے سوچا۔ اس مسخرے سے کوئی بعید نہیں۔ کہ وہ کسی ایسے ہی اوٹ پٹانگ مقام پہ چلا گیا ہو۔ جہاں بقول غالب ؏ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو۔

ایک دن پرکاش پنڈت نے مجھے بتایا کہ کپُور موگا میں ہے۔ یا مظہر العجائب کتنا کوتہ ہمت شخص ہے یہ۔ موگا؟ بھلا یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہو سکتی ہے؟ لیکن پھر مَیں نے سوچا کہ اُس کی کوتہ ہمتی، ہماہمی سے بیزاری، اور انسان کی وحشیانہ حرکات نے اُسے اَور بھی بجھا کر رکھ دیا ہوگا۔ وہ پہلے ہی کچھ کم بجھی ہوئی شخصیت نہیں تھا۔ بقول کرشن چندر وہ ایک قبر تھا جس پہ شاید پھول چڑھانے کے لئے بھی کوئی نہیں آئے گا — اسی لئے وہ لاہور چھوڑ کر موگا کے قبرستان میں جا لیٹا ہوگا۔ جہاں کوسوں تک ادب، کلچر، سوسائٹی، علم، آرٹ کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں دیتی — وہاں وہی چند بدھے گے۔ سکڑے سمٹے پروفیسر ہوں گے۔ بجھے بجھے طالب علم ہوں گے اور کپُور کے [illegible] ہوں گے

اور لیس - وہ قہقہے اور چہچہے جن سے لاہور کی ادبی اور کلچرل فضائیں مسحور رہتی تھیں - کپور اُن سے دامن جھٹک کر گوشۂ عافیت میں جا بیٹھا ہے - اگرچہ وہ اب بھی سوچتا ہے کہ اُس نے اچھا نہیں کیا - لیکن یہ سوچنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتا - مدافعت اور مقابلہ کی قوت سے تو وہ ازلی طور پر محروم ہے - اس لئے اُسے ایسا کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا سو وہ شاید زندگی سے بھاگ کر پناہ ڈھونڈھ چکا ہے - شاید اُس میں یہ جرأت نہیں کہ ملازمت کے لئے سفارش اور رشوت مہیا کر سکے - مکان کے لئے الاٹمنٹ آفیسروں سے لڑ جھگڑ سکے - ادبی سیاست گری میں دوبارہ اُلجھ سکے - اور کسی کلچرل شہر کی ہنگامہ خیز زندگی میں اپنے آپ کو جھونک دے -

لیکن — اس فرار کے باوجود وہ اپنی فطرت کے طنزیہ اُبھار کو مار نہیں سکتا - وہ لاکھ ایک امن پسند شہری سہی - لاکھ ایک شریف اور بندھا ٹکا خاوند سہی - لیکن ہوگا جیسے بے جان کنج تنہائی میں جاکر بھی وہ ادب اور تمدن سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکا ہوگا میں بیٹھ کر بھی اُس نے پھر طنزیہ مضامین لکھنے شروع کر دئے - اور ایک بار پھر زندگی کے ساتھ نئے نئے مذاق کرنے لگا - آج بھی اگر اُسے کہیں سے کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے - تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے - اگرچہ وہ اپنے آپ کو گھریلو معاملات میں کھوجانے کی سنگین کوشش کر کر کے اپنے دل کی اس دھڑکن کو بند کرنا چاہتا ہے - لیکن یہی دھڑکن تو اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے - وہ اُسے کیونکر روک سکتا ہے
گذشتہ دنوں جب میں نے اُسے جالندھر کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی - تو اس نے لکھا -

"میری ساس مرگئی ہے - کالکا جا رہا ہوں - اور تم جانتے ہو کہ یہ کمبخت ساسیں روز روز تو مرا نہیں کرتیں - اس لئے تمہارے مشاعرے میں شرکت سے معذور ہوں —"

ساس تو مرتی رہی - لیکن ہم نے دیکھا - کہ وہ ہمارے مشاعرے کی صدارت کے لئے جالندھر آدھمکا - یہاں تک کہ اس نے سٹیشن پر اپنے استقبال کی بھی پروا نہ کی - اور بغیر ہمارا انتظار کئے میرے گھر آرہا اور پھر رات کے تین تین بجے تک ہم لوگ کپور کے وہی مانوس قہقہے - وہی بے ساختہ مسکراہٹیں پھبتیاں اور طنزیہ جملے سنتے رہے - وہ متواتر بولتا رہا - ادب پر، آرٹ پر، سیاست پر، ادبی شخصیتوں پر گہری اور نفیس چوٹیں کرتا رہا - ہم سب کو جماہیوں پر جماہیاں آتی رہیں - لیکن وہ ان جماہیوں کی پروا کئے بغیر تیز بے ساتہ تک چہکتا رہا جیسے اسے پھر نئی زندگی مل گئی ہو - جیسے اُسے پھر اپنا پرانا مقام مل گیا ہو -

وہ ایک بہت بڑا اسکیم ساز بھی ہے - عمل سے گریز اور فرار نے اسے ذہنی عمل کا راستہ سجھا دیا ہے - اس لئے اُس کا ذہن سکیمیں تیار کرتا رہتا ہے - یہ سکیمیں نہایت عجیب و غریب ہوتی ہیں - اگرچہ یہ سکیمیں بیان کرتے وقت وہ ذرہ بھر بھی سنجیدہ دکھائی نہیں دیتا - لیکن اگر اس کی گفتگو میں سے مذاق کے عنصر کو نکال دیا جائے - تو اس کی سکیموں میں ایک جدت اور خاص عملی رنگ بھی ہوتا ہے - لاہور کے کئی ادبی پبلشرز اس کی سکیموں کے والا و شیدا رہے ہیں - یہ سکیمیں اس کے دماغ میں پوری اور مکمل شکل میں کبھی نہیں آتیں - بلکہ سب سے پہلے مذاق کے طور پر وہ صرف ایک تجویزی فقرہ بولتا ہے - اور پھر وہی تجویزی فقرہ اُس کے دماغ میں پھیلنا شروع ہو جاتا ہے - وہ بولتا چلا جاتا ہے - اور فقرہ پھیلتا چلا جاتا ہے - یہاں تک کہ ایک بہت بڑی سکیم کے روپ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے - بات سے بات کرنے کے فن کا وہ ماہر ہے - اور ان باتوں کے دوران میں اُس کے چبھتے ہوئے جملے اُس کی اسکیم پر چلا کرتے رہتے ہیں - وہ اپنی اس اسکیم کو طنز کے تخریبی انداز میں پیش کرتا رہتا ہے - اور گویا اس کا تخریبی انداز کہہ رہا ہوتا ہے - کہ ع

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

وہ تخریب کے زاویے سے تعمیر کی راہ دکھاتا ہے - کیونکہ اُس نے زندگی کو ہمیشہ اسی زاویے سے دیکھا ہے - اور اسی زاویے سے پیش کرنا ہی اُس کے فن کا خاص رنگ ہے -

ادبی اعتبار سے وہ سٹیفن سن سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن اسے جب یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ سٹیفن سن تپ دق سے مرا تھا۔ تو اس مشابہت سے قدرے گھبرا جاتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ وہ سٹیفن سن کبھی نہیں ہے ـــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس گھبراہٹ کے باوجود اُسے سٹیفن سن کی آخری روایت یعنی تپ دق سے بھی ضرور دلچسپی لینی پڑے گی ـــ اس کا خیال ہے کہ اُردو ادب میں باوجود اس درجہ ترقی پسندی کے غوغا کے ابھی بات نہیں بنی۔ ادب اگر بلند پایہ نہیں۔ تو کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ ایک تاج محل، سینکڑوں جھونپڑیوں پر بھاری ہے ـــ تاج محل والی تشبیہ اگرچہ خوبصورت ضرور ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ..... مگر میں کپور کی تشبیہ پر کیوں بحث کر کے سر کھپاؤں۔ کیا اس سر کھپائی سے سینکڑوں جھونپڑیاں تاج محل میں بدل جائیں گی؟ ـــــ"

پُرانے شاعروں میں سے اُسے صرف غالبؔ سے عشق ہے۔ اُسے صرف غالب ہی کے شعر یاد ہوتے ہیں۔ غالب جیسے سنجیدہ شاعر کے کلام کو کپور جیسے پھکّڑ اور طنز نگار کے ہاں دیکھ کر تعجب تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن کپور کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے۔ کہ وہ اپنی طنزیہ گفتگو میں غالبؔ کے شعروں کے حوالے کچھ اس طرح دے جاتا ہے۔ کہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے غالبؔ کے شعروں کی سنجیدگی پر کپور کے طنزیہ حوالوں نے ڈاکہ ڈال لیا ہے۔ اور غالب نے شاید کپور کی ڈاکہ زنی کے لئے ہی اپنا سارا دیوان ترتیب دیا تھا۔ اس کے مضامین کے سب سے پہلے مجموعے کا نام بھی غالبؔ ہی کے دیوان سے لیا گیا تھا۔ یعنی "سنگ وخشت"۔ اس کے بعد "سنگ وخشت" کی رعایت سے جب اُسے غالب کے ہاں سے اور کوئی ترکیب نہ مل سکی۔ تو اس نے غالب کے دیوان کی اس افسوسناک کمی کو خود ہی پورا کر دیا۔ اور اپنے دوسرے مجموعوں کے نام بھی "سنگ وخشت" کی تقلید میں "شیشہ وتیشہ" اور "چنگ ورباب" ہی رکھے۔ اور شاید غالب پرستی کا یہ تقلیدی سلسلہ مرتے دم تک اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

کرشن چندر کی طرح اُس نے چند دنوں تک فلمی ماحول کا رُخ ضرور کیا تھا۔ اس کے لئے اُس نے بمبئی اور کلکتہ کا سفر بھی کیا تھا۔ لیکن اس سفر سے اُسے کچھ حاصل نہ ہُوا۔ سوائے ایک دو مضامین کے جو اُس نے ان شہروں پر لکھے۔ ورنہ دو ایک فلموں کے جو مکالمے اس نے لکھے۔ ان میں تو فلم کے ڈائرکٹروں، فلم کی خوبصورت ہیروئینوں اور پروڈیوسروں کے محبوب ڈرائیوروں نے ہی تبدیلیاں کر کر کے ان کا حُلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور جب فلم کی شوٹنگ کے وقت کپور کو سٹوڈیو میں لے جایا جاتا۔ تاکہ وہ صحیح مکالمے کی نگرانی کر سکے۔ تو کپور سوائے اس کے اور کچھ نہ کرتا۔ کہ وہاں سیٹ پر فلم کے ڈائرکٹر۔ ہیروئین اور پروڈیوسر کے ڈرائیور کے حُسنِ مذاق پر عش عش کرتا رہے۔ اور انہیں داد دے دے کر کہے۔ کہ آپ نے اس ڈرامے کے فلاں مکالمے اور فلاں فقرے کو بدل کر اُس میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ مجھے آپ کی اس تبدیلی پر ناز ہے۔

آج کل اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ آئندہ کسی بھی فلم کے مکالمے نہیں لکھے گا۔

"بعض اوقات ایک طنز نگار اپنی مختصر سی طنز انگیز تحریر سے ایک ایسا
کارنامہ انجام دیتا ہے۔ کہ بڑے سے بڑا مفکّر بھی دنگ رہ جاتا ہے۔
عام طور پر طنز نگار ایک فلسفی اور شاعر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے"

(دلوز نیو یوک)

کنہیا لال کپور

مکرّمی و محترمی

لیڈر کے نام

مکرّمی!

جب سے حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آئی ہے۔ آپ کی تقریریں پڑھ پڑھ کر ادھ مُوا ہو گیا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تقریر کرنے کے علاوہ آپ کوئی اور کام نہیں کرتے۔ مَیں جب اخبار اُٹھاتا ہوں۔ تو اس خیال سے سہم سا جاتا ہوں۔ کہ حسبِ معمول اس میں آپ کی "تقریر" ضرور ہو گی۔ ستم یہ ہے کہ آپ ہر تقریر میں وہی بات کہتے ہیں۔ جو مجھے پہلے معلوم ہے۔ یا بالکل غلط ہے۔ مثلاً ایک پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ملک کو پاگلوں کی ازحد ضرورت ہے۔ بندہ پرور! خود ہی انصاف فرمائیے کہ سرپھرے قومی راہنماؤں، جاہل ادیبوں۔ خود غرض پنڈتوں اور مولویوں کی موجودگی میں آپ کا ارشاد کہاں تک درست ہے۔ عموماً آپ اپنی ہر تقریر میں تین باتیں دہراتے ہیں۔ (۱) ملک نازک ترین دَور سے گزر رہا ہے۔ (۲) پاکستان اور ہندوستان کے تعلّقات کشیدہ تر ہو رہے ہیں (۳) مہاجرین یا شرنارتھیوں کا مسئلہ حل ہوتے نظر نہیں آتا۔ حضور! میرے لئے یہ انکشافات نہ نئے ہیں نہ حیرت انگیز۔ مَیں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کہ جب تک آپ برسرِ اقتدار رہیں گے۔ ملک نازک ترین دَور سے گزرتا رہے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کبھی شریف ہمسایوں کی طرح نہیں رہ سکیں گے۔ رہا مہاجرین کا مسئلہ۔ وہ صرف اُس وقت حل ہو گا جب مہاجرین دُنیائے آب و گل میں نہیں رہیں گے۔ آپ فرماتے ہیں: "کچھ عرصہ اور ہم پر اعتماد رکھئے" گستاخی معاف میں تو اعتماد کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ بقول داغ مجھے اپنی زندگی کا اعتبار نہیں۔ ورنہ شاید میں اس اعتماد کے سلسلے کو اَور طُول دیتا۔ اپنی تقریروں میں آپ ہر روز سینکڑوں پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ مثلاً "مشرقی پنجاب میں لاکھوں آدمی بھوک۔ طاعون اَور ہیضہ کے شکار ہونے والے ہیں۔"

"ہمارے ملک پر متعدّد حریص ممالک کی نظریں ہیں۔ اور وہ عنقریب ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔"

"مَیں اس انہماک سے قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔ کہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

حضور! آپ ہمیں، اس قسم کی ہزاروں باتیں بتلاتے ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کس تاریخ یا سن تک ہمارے اعتماد کے اہل ثابت ہوں گے۔ آپ کی تقریروں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آپ چور بازاری کو سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔ مجھے حیرانی ہے۔ کہ آپ کو "چور بازاری" کا علم ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ اسے بند نہیں کر سکتے۔ حضور! کیا میں یہ پوچھنے کی گُستاخی کر سکتا ہوں کہ وہ آپ کی خفیہ پولیس۔ عدالتیں۔ سزائیں کیا ہوئیں؟ اگر آپ چور بازاری کا انسداد کرنے میں واقعی بے بس ہیں۔ تو کم از کم اسے قانوناً جائز قرار دے دیجئے۔ تاکہ ہم دوسرے ممالک کو مُنہ دکھانے کے قابل تو ہو سکیں۔ لیکن میرا سب سے پہلا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ ملک کو چاہے آپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے یا نہیں۔ آپ کی زبان اور پھیپھڑوں کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔

(مخلص)

---

(۲)

ترقی پسند دوست کے نام

محترمی!

تمہارے افسانوں کا مجموعہ "درانتی کے دانت" نظر سے گزرا۔ پڑھنے کے بعد فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ اس کا نام "ہاتھی کے دانت" ہونا چاہیئے تھا یا درانتی کے دانت، ظالم کہنے کو تو تم نے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن دراصل 'مارکیسٹ' پر اچھے خاصے مضامین لکھ ڈالے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تمہارے افسانوں سے کرداروں کے نام اور دو ایک خوبصورت تشبیہیں نکال دی جائیں۔ تو انہیں آسانی سے کارل مارکس کے فلسفے کا ضمیمہ تصور کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ بعض افسانوں سے بھی نکالے جائیں جب بھی شاید کام چل جائے۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں تم لکھتے ہو "اب وقت آگیا ہے کہ ہر ادیب کھلم کھلا اشتراکیت کا پراپیگنڈا شروع کر دے" اے دوست اسی بیچ بتانا۔ مجھے یہ الہام کب اور کیسے ہوا۔ اگر تمہیں اشتراکیت کا پراپیگنڈا کرنا ہی مقصود ہے۔ تو اس غرض کے لئے افسانے لکھنا ہی کیوں لازم ٹھہرا۔ یہ مطلب تو افسانے لکھے بغیر بھی پورا ہو سکتا ہے۔ آخر بھلا کارل مارکس کہاں کا افسانہ نگار تھا۔ مجھے اشتراکیت سے چڑ نہیں۔ لیکن اس بات سے ضرور ہے۔ کہ ہر افسانے کا مرکزی خیال ایک ہی ہو۔ اور افسانہ معشوق کی "نہیں" کی طرح کوئی دوسری بات کہہ ہی نہ سکے۔ تمہارے مجموعے میں گیارہ افسانے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ مشابہت کے اعتبار سے سب کے سب نہ صرف بھائی بلکہ ہمزاد معلوم ہوتے ہیں۔ تم کہتے ہو۔ کہ جو ادیب اشتراکی نہیں۔ وہ ادیب ہی نہیں اے دوست ادبا پر اتنا سخت فتوے تو کسی روسی ادیب نے بھی نہیں لگایا۔ کیا تم روسی ادبا سے بھی زیادہ ترقی پسند ہو۔ اور پھر تمہارا ان ادبا کے متعلق کیا خیال ہے۔ جو بدقسمتی سے کارل مارکس کے پیدا ہونے سے پہلے پیدا ہوئے۔ میری مراد ہومر۔ شیکسپیئر۔ میر اور کالیداس سے ہے۔ سرخ بہت اچھا رنگ ہے۔ اے دوست لیکن اس امر سے تو تمہیں بھی انکار نہیں ہوگا۔ کہ اس کے علاوہ بھی اور خوبصورت رنگ ہیں۔ جس قوس قزح کا ذکر تو بار بار اپنے افسانوں میں کرتا ہے۔ اس کا رنگ اگر صرف سرخ ہوتا۔ تو شاید تو اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ تو چاہے کچھ کہے۔ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ یہ تو نہایت مبارک فال ہے کہ قلم کے آس پاس کبھی کبھی اشتراکیت ضرور رہے۔ لیکن یہ اس سے بھی اچھا ہوگا کہ وہ اسے کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دے۔

(تمہارا گستاخ دوست)

(۳)

ایڈیٹر کے نام

مکرمی و محترمی!

آپ کا خط ملا۔ آپ لکھتے ہیں کہ آپ ایک "خاص نمبر" نکال رہے ہیں۔ مگر آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آپ اسے میرے مضمون کے بغیر کیسے نکال سکتے ہیں۔ محترمی! یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔ متعدد رسائل نے زمانہ ماضی اور حال میں خاص نمبر نکالے ہیں جن میں میرا کوئی مضمون نہیں تھا۔ دراصل اگر وہ میرے مضمون کا انتظار کرتے۔ تو شاید حشر تک خاص نمبر نہ نکال سکتے۔

آپ پوچھتے ہیں۔ کہ میں اب مضامین کیوں نہیں لکھتا؟ مکرمی و محترمی! آپ ہی فرمائیے۔ کہ میں مضمون کیوں لکھوں۔ اگر خدا لگتی کہتا ہوں۔ تو حکومت کمیونسٹ سمجھ کر جیل میں ٹھونس دیتی ہے۔ اگر حکومت کی مدح سرائی کرتا ہوں۔ تو ترقی پسند ادیب کان سے پکڑ کر "مجلس" سے باہر نکال دیتے ہیں۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ ہے محترمی آپ ہی کہئے۔ کہ یہ آپ کا سادہ دل بندہ اب جائے تو کہاں جائے۔ آپ اپنے رسالے کے لئے چند مشورے چاہتے ہیں۔ میرا پہلا اور آخری مشورہ یہ ہے۔ کہ رسالہ بند کر دیجئے۔ حکومت اور قوم کا جو مزاج اس وقت ہے۔ اس کے پیشِ نظر آپ کو خواہ مخواہ مصیبت مول لینے

آج کل میں قومی راہنماؤں کے سوانح حیات مرتب کر رہا ہوں۔ بظاہر یہ آسان لیکن دراصل نہایت مشکل شغل ہے۔ اس کو یہی لیجئے کہ مجھے ہر قومی راہنما کو شریف النسل فرشتہ سیرت اور ولی اللہ ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات واقعات کو کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد بھی یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ دوسرے ہمارے قومی راہنماؤں کی زندگیاں اتنی غیر دلچسپ واقع ہوئی ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیل جانے، چرخہ کاتنے یا اشتعال انگیز نعرے ایجاد کرنے کے علاوہ انہوں نے کوئی بات کی ہی نہیں۔ اس لئے زیب داستان کے لئے متعدد قصے گھڑنے پڑتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان مشکلات کے باوجود میں نہایت صبر سے اپنے فرض کی تکمیل کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ کتاب کے شائع ہونے کے بعد فوراً مجھے کسی نہ کسی غیر ملک میں سفیر بنا کر بھیج دیا جائے گا۔

میرا آپ کو بھی مخلصانہ مشورہ ہے کہ خاص نمبر نکالنے کی بجائے کسی قومی راہنما پہ ایک آدھ کتاب لکھ ڈالئے۔ اگر اگلے انتخابات میں وہ کامیاب ہو گیا۔ تو آپ کی پانچوں گھی میں ہیں۔ سفیر نہیں تو کم از کم محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر آپ ضرور بنا دئے جائیں گے۔ بصورت دیگر اگر آپ ایسا نہیں کریں گے۔ تو چاہے خاص نہیں "خاص الخاص" نمبر نکالئے۔ آپ محض ایڈیٹر ہی رہیں گے۔ اور خدانخواستہ آپ گرفتار کر لئے گئے۔ تو شاید ایڈیٹر بھی نہ رہیں۔

(مخلص)

(۴)

اسمبلی کے سپیکر کے نام

محترمی!

نہایت بے ادبی اور گستاخی سے آپ کی خدمت میں التماس کرنا چاہتا ہوں کہ آپ وزراء کو ہدایت فرمائیں کہ اسمبلی میں سوالات کے جوابات دیتے وقت اپنے اوسان بجا رکھا کریں۔

مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جب سے اسمبلی معرض وجود میں آئی ہے کسی معقول سوال کا جواب معقول انداز میں نہیں دیا گیا۔ مثال کے طور پر پچھلے اجلاس میں جب "وزیر معلومات" سے پوچھا گیا۔ کہ ملک میں مرغیوں کی تعداد کیا ہے۔ تو انہوں نے شانِ بے نیازی سے فرمایا۔ "چونکہ مرغیوں کی تعداد صحیح کا انکشاف مفادِ عامہ کے خلاف ہے۔ اس لئے میں اس سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں"۔ غضب خدا کا۔ گوشت خور عوام تو "مرغی مرغی" چلا رہے ہیں۔ اور ہمارے وزیر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ مرغیوں کے اعداد و شمار کا علم عوام الناس کے لئے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں "آیا گورنمنٹ کو معلوم ہے۔ کہ فلاں شہر میں طاعون سے دو ہزار آدمی مر چکے ہیں۔ اور اگر یہ معلوم ہے۔ تو اس نے انہیں دفنانے کا کیا انتظام کیا ہے"۔ کہا گیا۔ کہ گو یہ صحیح ہے۔ کہ واقعی دو ہزار آدمی مر چکے ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کو کوئی اطلاع نہیں۔ اس لئے انہیں دفنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک اور ممبر نے یہ پوچھنے کی کوشش کی "کیا گورنمنٹ کو علم ہے کہ اشیائے خوردنی کے بھاؤ برق رفتاری سے بڑھ رہے ہیں۔ اگر ہے تو گورنمنٹ کو اس بات کا علم ہے۔ لیکن چونکہ مختلف اشیاء کے بھاؤ گورنمنٹ سے مشورہ کئے بغیر بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے گورنمنٹ انہیں بڑھنے سے روکنے کے معاملے میں قاصر ہے"۔

آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے میں چند اور سوالات مع جوابات نیچے درج کر رہا ہوں۔ تا کہ آپ اندازہ لگا سکیں۔ کہ ہمارے وزراء کس پایہ کے قانون ساز واقع ہوئے ہیں۔

سوال:۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اسمبلی کے ان پڑھ اراکین کے بارے میں حکومت کی پالیسی کیا ہے

جواب:۔ حکومت کی پالیسی یہ ہے۔ کہ انہیں ان پڑھ رہنے دیا جائے۔ چونکہ انہیں تعلیم دلوانا جمہوریت کے مفاد کے سخت منافی ہوگا۔

سوال:۔ وزیر خوراک دن بدن دبلے کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔

جواب۔ ماہنیں فاقہ مستوں کا غم کھائے جارہا ہے۔

سوال۔ کیا یہ صحیح ہے کہ وزراء کے سفر خرچ کا بل اُن کی تنخواہوں سے تگنا ہے؟

جواب۔ یہ غلط ہے۔ تگنا نہیں پانچ گنا ہے۔

سوال۔ گندم؟

جواب۔ چلنیا!!!

محترمی سپیکر صاحب۔ یا تو کسی ممبر کو سوال کرنے کی اجازت مت دیجئے۔ ورنہ وزراء حضرات کو سمجھائیے۔ کہ اگر وہ اتنی بڑی بڑی تنخواہیں پانے کے باوجود اتنی ذہانت کے بھی مالک نہیں۔ کہ معمولی سوالوں کے جواب ٹھکانے سے دے سکیں۔ تو انہیں فوراً اپنے عہدوں سے مستعفی ہوجانا چاہیئے۔

اُمید ہے آپ اس عرضداشت پر غور فرمائیں گے۔ (خیراندیش)

(۵)

فلم ڈائریکٹر کے نام

مکرمی و محترمی!

افسوس ہے کہ آپ ابھی تک زندہ ہیں۔ اور حسب معمول عجیب و غریب فلمیں تیار کررہے ہیں۔ سُنا ہے۔ آپ نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آئندہ ہر فلم کی کہانی آپ خود لکھیں گے۔ اور اگر خود نہیں لکھیں گے۔ تو کہانی کا پلاٹ کسی امریکن فلم سے چرانے کے بعد اس کا حلیہ اس کامیابی سے بگاڑیں گے۔ کہ ہالی وڈ کے ڈائریکٹر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ جائیں۔ یہ بھی سُنا ہے۔ کہ کہانی کے علاوہ مکالمے اور گانے بھی آپ خود تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ہندوستانی فلموں پر کیا گزرے گی۔ اس کا خیال کرتے ہوئے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ . . . . . آپ کی تازہ فلم "کھٹاک کھٹاک" دیکھی۔ ایسی دلچسپ کامیڈی تھی کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپ نے جس خوبی سے ایک نوجوان کو خوبصورت لڑکیوں کا تعاقب کرتے اور موخرالذکر کو اس کی جوتیوں سے مرمت فرماتے ہوئے دکھایا ہے۔ وہ کچھ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اور ہاں یہ کہنا تو میں بھول گیا۔ کہ فلم کا آخری سین فلم کی جان ہے۔ نوجوان کی چاند رفتہ رفتہ گنجی ہوتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ لیکن اُس کو حادثے کا احساس اس طرح کرایا گیا ہے۔ کہ حجام اس کی حجامت بنانے سے انکار کردیتا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو اس فلم میں آپ نے قوم کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ کہ گنجا ہوجانے کے بعد عشق کے سب امتحان ختم ہوجاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جس شخص نے ہیرو کا پارٹ ادا کیا ہے۔ وہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ کیونکہ اس کی ناک آپ کی ناک سے ملتی جلتی ہے۔ اور آپ کی ناک طوطے کی ناک سے مشابہت رکھتی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے۔ کہ بیشتر طوطوں کی ناک آپ کی ناک سے خوبصورت ہوگی بندہ پرور! ایسے شخص کو ہیرو کا پارٹ دینا جس کے چہرے پر اس قسم کی ناک ہو۔ افسوسناک نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ ایسے شخص سے کوئی خاک محبت کرے گا۔ میرا مطلب ہے۔ کہ محبوبہ کو اُس کی ناک کے مطالعہ سے فرصت ہی کب ملے گی۔ کہ وہ اُس سے محبت کر سکے۔ گانوں کے اعتبار سے آپ کی تازہ فلم آپ کی پہلی سب فلموں پر بازی لے گئی ہے۔ خاص کر مجھے آپ کا ایک دوگانا بہت پسند آیا جس میں ہیرو کہتا ہے۔

ہائے میری سجنی ایسی پتلی جیسی پتلی سُوئی

اور ہیروئن اس خوبصورت مصرع پر اس طرح گرہ لگاتی ہے۔

اُوئی بالما۔ اُوئی ساجنا۔ اُوئی جالما اُوئی

شاید آپ نے غور نہیں فرمایا اس مصرع کے آخری ٹکڑے یعنی اُوئی جالما اُوئی میں فلم انڈسٹری زبان حال سے فریاد کرتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ خدا کرے کہ آپ خیریت سے نہ ہوں۔ اور آپ کی آخری فلم واقعی آخری فلم ثابت ہو۔ (مخلص)

منظومات

جوش ملیح آبادی — ضمیر جعفری — تخت سنگھ

احمد ندیم قاسمی — نریش کمار شاد — افضل پرویز

مخمور جالندھری — اختر انصاری — شاد عارفی

شریف کنجاہی — عبدالمجید بھٹی — سلام مچھلی شہری

بلراج کومل — یوسف ظفر — مقبول حسین احمد پوری

خلیل الرحمن اعظمی — قیوم نظر — مجید شاہد

جمیل ملک — عبدالحمید عدم — حافظ لدھیانوی

احمد فراز — ضیا جعفری — جگن ناتھ آزاد

انور جلال — نذیر مرزا برلاس — تنویر نقوی

احمد ظفر — اعجاز بٹالوی — اکرام انگار

کرشن موہن — حسن طاہر — ضمیر اظہر

فارغ بخاری — رضا ہمدانی — خاطر غزنوی

احمد راہی — ناصر کاظمی — قتیل شفائی

ہمارے ساتھی

جوش ملیح آبادی:۔ ہندوستان کی ترقی پسند شاعری کا امام۔ جس نے اُردو شاعری کے ہر دور کا خلوص دل سے ساتھ دیا ہے۔ جب انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے تو فضا میں شعلے سے لپکنے لگتے ہیں اور جب پیار بھرے گیت گاتا ہے تو خیالوں میں کلیاں سی چٹکنے لگتی ہیں۔ آج یہ عظیم شاعر حکومت ہند کے سرکاری جریدہ آج کل عنانِ ادارت سنبھالے ہوئے ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ دیہات کی رومان بھری فضاؤں کا سب سے بڑا عکاس۔ جس نے وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے اپنے رومانی سازوں میں پورے سماج کے نغمے سمو دیئے ہیں۔ اور آج اردو ادب میں وہ ایک ایسے مقام کا مالک ہے جو خالصتاً اسی کے لئے وقف ہے۔

محمود جالندھری:۔ حقیقت پسندی کے سنہرے پھول چننے والا البیلا نوجوان جسے بدنما ہوئی ترتیب گلستان میں سنہرے پھولوں کے پہلو میں کچھ زہریلے کانٹے بھی دکھا دیئے ہیں۔ اور آج کا محمود بیتی ہوئی کل سے کچھ الگ الگ سے نظر آنے لگا ہے۔ شاید آنے والی کل کی نگہبانی کے لئے۔

شریف کنجاہی:۔ سیدھا سادا سانولا سلونا دیہاتی فنکار۔ جسے بڑے بڑے شہروں کی ادبی انجمنوں نے شاذ شاذ ہی دیکھا ہے۔ پنجاب کے ایک دور افتادہ کونے میں بیٹھا ہمارے ماحول پر ایسے ایسے کیلے طنز کرتا رہتا ہے۔ کہ اس کے مخاطب چیخ چیخ اُٹھتے ہیں۔

بلراج کومل:۔ شبنم کی طرح شفاف اور غنچہ گل کی طرح نرم و نازک تخلص رکھنے والا نو آموز شاعر۔ جس نے ادب کی محدود سی وادیوں کی سیاحت کے باوجود اپنے ذوقِ نظر میں اتنی وسعت پیدا کر لی ہے کہ اسے تمام دنیا ایک ہی گلشن کا حسین پر تو نظر آنے لگی ہے۔

خلیل الرحمان اعظمی:۔ علی گڑھ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری۔ جسے ہندوستان کی نوکر شاہی نے عوامی شاعر ہونے کے جرم میں آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ وہ ایک معین نقطۂ نظر کے تحت اپنی نظموں کی تخلیق کرتا ہے اور اپنی ذات کو بہتر جانتا ہے۔

انور جلال:۔ ایک مصور شاعر ایک شاعر مصور۔ جو تصویریں بناتے بناتے شعر لکھنے لگتا ہے۔ اور شعر لکھتے لکھتے تصویریں بنانے لگتا ہے۔ اگر انور جلال کی توجہ زندگی کے کسی دور میں بھی ایک ہی فن کے لئے وقف ہو گئی تو اس کا یہ تلون آلودہ ماحول اسے راس نہیں آ سکے گا۔

کرشن موہن:۔ نقاد نگار کرشن موہن، شاعر کرشن موہن۔ دوست کرشن موہن۔ جو کرشن موہن تھوڑا ہے اور "ام" ۔ اُسے "زیادہ ہے۔ اپنے فن کو سینے سے لگائے "نیلو کھاری" میں ڈیلیفیر انسپکٹر کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اور اُس کا ادبی ارتقا خراماں خراماں ایک نئی منزل کو رواں ہے۔

جمیل ملک:۔ اُردو شاعری کے نئے رجحانات کا پرستار۔ جسے ابتدائے فن ہی میں بعض ایسے تجربوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جن کی آنچ نے اس کے فن کو پگھلا کر آفاقی سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ سوچ سمجھ کر لکھنے کا قائل ہے۔ اسے تفریحی ادب سے کوئی شغف نہیں۔

احمد فراز:۔ سرحد کے اُبھرتے ہوئے نوجوانوں میں سب سے کم سن شاعر۔ جسے شعر و شاعری کا شغف ورثے میں ملا ہے۔ اور جو اس ادبی وراثت پر ہی اکتفا نہیں کر رہا بلکہ اس میں نئے نئے اضافے کرنے پر تلا نظر آتا ہے۔ اس نوجوان سے ادبیات سرحد کو بہت سی توقعات ہیں۔

عبدالمجید بھٹی:۔ اُردو ادب میں نئے نئے تجربے کرنے والا اندر شاعر۔ جسے بعض تجربوں نے دوامی حیثیت بخش دی ہے۔ اور بعض تجربے اسے کچھ راس نہیں آ سکے۔ فسادات پر جتنی نظمیں بھٹی نے کہی ہیں اتنی شاید کسی شاعر کو بھی نصیب نہیں ہو سکیں۔ بھٹی پاکستان کا واحد شاعر ہے جس کی سب لوگ عزت کرتے ہیں۔

یوسف ظفر:۔ نئی شاعری کا پرانا معمار جس نے غیر مقفی شاعری کی ترویج اور نئے اسالیب نگارش کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ آج کل اپنی معین ہیئتوں سے ہٹ کر مترنم اور مقفی نظمیں بناتا نظر آتا ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ غزل کو اپنانے کی مساعی میں بھی پیش پیش ہے۔

قیوم نظر:۔ حلقہ ارباب ذوق کا روحِ رواں۔ جس نے اُردو شاعری میں ہیئت کے نت نئے تجربے پیش کئے اور نظر کو ایسے ایسے سانچوں میں ڈھالا۔ کہ اُس کی جدت پسندی ایک مثال بن کے رہ گئی اسکی نظمیں اگر نام کے بغیر بھی چھاپ دی جائیں تو ہر نظر کہہ اُٹھے گی کہ میرا مصنف قیوم نظر ہے۔

فارغ بخاری: صوبہ سرحد کے ترقی پسندوں کا رہنما جس کے "سنگِ میل" نے سرحد میں اتنا ہی کام کیا ہے۔ جتنا بمبئی میں "نیا ادب" نے۔ فارغ ایک سچا فنکار اور نڈر مدیر ہے۔ جسے سرحد کا ادبی مستقبل کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔

سلام مچھلی شہری: "مسکرا بن رہی ہے" اور "ڈرائینگ روم" جیسی نظموں کا خالق آج بھی جب قلم اٹھاتا ہے۔ تو اس کے فن کی جوانی جیسا سماں پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ ریڈیو کی ملازمت نے اس کی بیشتر صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ لیکن سلام پھر سلام ہے۔

تخت سنگھ: رومان اور تفریح سے روٹھا ہوا شاعر تخت سنگھ جو کبھی لائل پور کے ادبی حلقوں میں چپہ چپہ پر پوچھا جاتا تھا۔ آج کل مشرقی پنجاب کے فرقہ وارانہ شعلوں پر سرخ پانی چھڑک رہا ہے۔ وہ انسان کو انسان سمجھتا ہے۔ نہ کہ ہندو مسلم یا سکھ۔

احمد ظفر: جوانی کی مستیوں کا شاعر احمد ظفر جب ماحول کے تضاد کی سچی تصویریں پیش کرتے کے ساتھ ساتھ ان پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ تو اسکی نظمیں اس کی وسعت فکر و نظر کا ثبوت بن جاتی ہیں۔ اور اس کے پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ایک پُرخلوص سچائی سے ہمکلام ہیں۔

نریش کمار شاد: بھولا بھالا، سیدھا سادا مخلص نوجوان جس نے پنجاب سے حاصل کئے ہوئے ادبی ذوق کی نمائش یو۔پی کی ٹکسالی گیری میں کچھ اس انداز سے کی ہے۔ کہ اس کے فکر کی ایک تصویر بول اٹھی ہے۔

شاد عارفی: ہندوستان اور پاکستان کا عزیز ترین طنز نگار جس کے طنزیہ کلام نے بڑے بڑے فنکاروں کو متاثر کیا ہے لیکن شاد کی انفرادیت بدستور قائم ہے۔ وہ موضوعات پر قدم نہیں اٹھاتا۔ بلکہ نشتر سے عمل جراحی کرتا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے رنگ رنگ کی نمائش کر سکے۔

افضل پرویز: راولپنڈی کے ترقی پسندوں کی انجمن کا سرگرم رکن۔ جس کی شاعری کمسنی کے باوجود سوجھ بوجھ سے عاری نہیں۔ وہ لکھتا ہے تو سوچ سمجھ کر چھپواتا ہے تو دیکھ بھال کے۔ اگر اس کی مشقِ سخن پر اس کی ورزشِ جسمانی غالب نہ آ گئی تو مستقبل کے ادبی سمن زاروں میں ایک شگفتہ پھول مہکتا نظر آئے گا۔

اکرم افگار: زندگی کی شاہراہ پر اپنی جوانی کو گھسیٹتا ہوا مخملیں کپڑا۔ جو مڑ مڑ کر اپنے قدموں کے نشان دیکھتا ہے۔ اور ان سے عدمِ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے انہیں مٹا دیتا ہے۔ اس کی جوانی ایک ایسی منزل کی تلاش میں ہے۔ جہاں شاعری کے اونچے اونچے صنوبر سایہ فگن ہوں اور ان صنوبروں کے سائے میں بیٹھا ان سے جھڑتے ہوئے گیتوں سے اپنی جھولی بھرتا رہے۔

خاطر غزنوی: زندگی کے گاتے لہراتے مرغزاروں میں جھومنے والا خاطر جب اپنے البیلے فن کی سریلی بانسری میں سوئے ہوئے نغموں کو بیدار کرتا ہے تو یوں کائنات کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے موسمِ بہار کی آمد سے کلیاں چٹکنے لگیں۔ جیسے بادِ سحر کے جھونکوں سے گلاب کی پتیاں کھل کھل جائیں۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے۔ جو خاطر کو اپنے ہمعصروں سے جدا کرتی ہے۔ خاطر نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی — لیکن گیت میں اس کا آرٹ نکھر نکھر جاتا ہے۔

عبدالحمید عدم: شراب و شباب کا البیلا شاعر جس کے نغموں میں شراب کی سی مستی اور شباب کی سی تیزی اور تندی ہے شاعری کے دھڑکتے ہوئے دل میں خطیبانہ شور شوں کا ایک طوفان برپا ہے۔ اور نغمہ سرائیوں کے آغوش میں سیمابی کیفیتوں کا شدید تلاطم موجزن — حکومت کے محکمے میں ایک "سند یافتہ افسر" کی خواب آلود فضا اس کے بیدار، زندہ و تابندہ احساسِ جواں پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

تنویر نقوی: زندگی کے تلخ حقائق کی گود میں بیٹھ کر سنہرے سپنے دیکھنے والا جوان فکر شاعر۔ ماحول کی تلخیوں سے پریشان ہو جاتا ہے۔ تو شعر و نغمہ میں پناہ لیتا ہے۔ اس طرح ناسازگار حالات سے مفاہمت کر کے اپنے حساس دل کو عارضی طور پر فریب دے لیتا ہے۔ فلمی دنیا اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی ہے

ضیا جعفری:- اردو کا قیام جو رباعی کی پرانی صنفِ سخن کو نیا خون دینے کے ساتھ ساتھ تنگنائے غزل میں بھی نئی نئی وسعتیں پیدا کر رہا ہے۔ ضیا کی شاعری کے مخصوص لب و لہجہ ... ایک خوشگوار موڑ لیا ہے۔ جو اس وقت کے بدلتے ہوئے تیوروں سے حاصل ہوا ہے یہی توقع رکھنی چاہیئے۔ کہ اس کا آرٹ ہر نئے دور میں ہمارا ساتھ دے گا۔

نذیر مرزا برلاس:- سرحد میں نئی شاعری کا رواج۔ جس نے اس دور میں قدامت سے بغاوت کا اعلان کیا۔ جب روایات سے منحرف ہونا ادبی خودکشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک نئی آواز لیکر میدان میں آیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے استقدر تحیر خیال پیدا کر دیئے کہ سرحد کی روایت پرست سرزمین جدت پسند اذہان کے مشورے قبول کرنے لگی۔

اعجاز بٹالوی:- حلقۂ اربابِ ذوق کا قدیمی پرستار جو بہت تھوڑا کہتا ہے لیکن سوچ سمجھ کر کہتا ہے۔ اس نے افسانے بھی لکھے اور نظمیں بھی۔ لیکن غزل میں اس نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کے اجنبی پن سے ایک ارتقائی سلسلے کا پتہ چلتا ہے جو حال و مستقبل کا ناطہ مضبوط کئے ہوئے ہے۔

حسن طاہر:- پھولوں کا سا شگفتہ دماغ رکھنے والا جیالا نوجوان۔ جس کی آواز اگرچہ انجانی سی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں اپنا پن محسوس ہوتا ہے وہ اپنی آواز کی نرمی اور لہجے کی شگفتگی میں ایک ہمہ گیر پکار اور آفاقی درد سمو دیتا ہے اور یہی اس کے مستقبل کا روشن پہلو ہے۔

احمد راہی:- پنجاب کے ادبی حلقوں میں سب سے کڑوی اور سب سے پیاری شخصیت جس کے تیکھے پن سے بڑے بڑے تمتماتے اٹھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے زہر میں بجھا ہوا تیر ہے۔ جس کا میٹھا میٹھا اثر مدتوں تک خون میں گدگدی پیدا کرتا رہتا ہے۔ وہ ترقی پسندوں کی انجمن سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے ذاتی لب و لہجے سے اپنے قلم کو پاک کرنے کی سعی نہیں کر سکا۔ لیکن یہ بھی کب تک؟

رشا ہمدانی:- اپنے ماضی سے پشیمان اور مستقبل سے پر امید نوجوان جس نے سالہا سال روایتی ادب کی دیواروں سے سر پھوڑا لیکن اب اسے اپنے سر سے بہتے ہوئے خون سے آفاقی نقش و نگار بنانے کی ضرورت کا احساس ہو چکا ہے۔ اور یہی وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

ناصر کاظمی:- غزل کے نئے رجحانات کو اپنانے والا حساس شاعر جس کی زندگی صرف غزل کے لئے وقف ہے۔ اور جس کا فن غزل کے ارتقائی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ ناصر کاظمی کی اکثر غزلیں کافی ہاؤس کے مخصوص ماحول میں گونجتی لہراتی رہتی ہیں۔

اختر انصاری:- مشہور مجموعۂ قطعات "آبگینے" کا مصنف۔ جس نے سب سے پہلے سنجیدگی سے اردو قطعے لکھے اور انہیں کتابی صورت میں چھپوا کر لازوال شہرت حاصل کی یہ باتیں اگرچہ ماضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اختر انصاری کا آرٹ آج بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہے وہ قطعات کی بجائے اس بار غزل کی جانب توجہ دے رہا ہے۔

مجید شاہد:- سرور کا سلجھا ہوا نوجوان غزل گو۔ جس کے شعروں میں جدید تغزل کی غزالیں کچھ اس طرح سمٹ آتی ہیں کہ انہیں پھیلا دینے سے اک جہانِ حسن و نغمہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ ابتدائی شاعری کی ... احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ لیکن شباب کی آہنیں اس ہچکچاہٹ کو بہت جلد شکست دے دیں گی۔

حافظ لدھیانوی:- غزل + غزل = غزل۔ اور یہی اس کا سرمایۂ حیات ہے۔ جسے وہ مدتوں سے بچا بچا کر مستقبل کا سہارا بنا رہا ہے۔ اسے اپنی طبیعت کی کفایت شعار صلاحیتوں پر ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ اور اس نے شعروں کے معاملے میں کبھی فضول خرچی کا ثبوت نہیں دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسے اپنا کلام دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

جگن ناتھ آزاد:- پنجاب کا شہ پارہ تھی۔ جسے ماہنامہ "آجکل" دہلی کے دفتر میں پناہ مل گئی۔ تو پنجاب کو بھول گیا۔ بعض دوستوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ پنجاب نے اسے بھلا دیا ہے لیکن حقیقت میں یہ سب کچھ سفر کی تھکان کا اثر تھا جو اب زائل ہو رہا ہے۔ شاید آزاد کی تازہ غزل اس کا ثبوت بہم پہنچا سکے۔

مقبول احمد پوری:- گیتوں کی پھلواری کا شفیق مالی جس نے عمر بھر اپنے آرٹ کے خون پسینے سے اس پھلواری کی آبیاری کی ہے۔ اور اس پھلواری میں ایسے گل بوٹے پیدا کئے ہیں جن کے رنگ نوکھے ہیں اور جن کی مہک نرالی ہے۔ اور جب کوئی سیاح اس پھلواری سے گزرتا ہے تو اسے کیاری کیاری میں کچھ اس قسم کا سماں دکھائی دیتا ہے جس میں اس کے جہاندیدہ مالی کا حسن نظر شامل ہو۔

جوش ملیح آبادی

مسجودِ آسماں

میری پیشانی پہ جھکنے آسماں آتا ہے جوش
اِس زمیں کو سجدہ کرنے آسماں آتا ہے جوش

وہ ہے میرا کعبۂ عصیاں جہاں وقتِ غروب
روز حج کرنے گروہِ قدسیاں آتا ہے جوش

میرے دل کے آستاں پر کاسہ ہائے گُل لئے
آرزوئے رنگ و بو میں گلستاں آتا ہے جوش

میرے نازِ طبع کی انگڑائیوں کو دیکھنے
حسنِ قدس و جلوۂ ابرواں آتا ہے جوش

میرے اوجِ شاعری کے جھٹ پٹے کی دید کو
آسمانوں سے جمالِ کہکشاں آتا ہے جوش

میں ہوں وہ پروانۂ فانوس گیرِ شمعِ صید
جس پہ گھمنے شعلۂ حسنِ جواں آتا ہے جوش

وہ برہمن ہوں کہ جس کے گوشۂ دستار پر
ٹوٹ کر خود طرۂ زلفِ بتاں آتا ہے جوش

ہر ملیحِ دہر جھکتا ہے پئے آب و نمک
ہر صبیح شہر بہرِ شہد و تاں آتا ہے جوش

ہاں وہ قسّامِ جوانی ہوں کہ جس کی بزم میں
حُسنِ خوباں کارواں در کارواں آتا ہے جوش

میرے ساغر زادمے خوارس کی خدمت کیلئے
مغبچے کے بھیس میں پیرِ مغاں آتا ہے جوش

میرے قصرِ شاعری میں گنگنانے کے لئے
اُنس و جاں کیا ہیں خدائے انس و جاں آتا ہے جوش

میرے دریائے تخیّل سے روانی مانگنے
رودِ وقت و چشمۂ عمرِ رواں آتا ہے جوش

احمد ندیم قاسمی

کھری کھری

صبح کو جب سرِ کہسار شفق پھولتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ پل بھر میں سویرا ہوگا

کون جانے کہ یہ لالی ہے عناصر کا مذاق
اور سورج کا گھٹاؤں میں بسیرا ہوگا

عین ممکن ہے کہ اعلانِ سحر کے باوصف
دوپہر کو بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا

کون جانے کہ اگر دھند ہٹی - ابر چھٹا
ایک طوفان نے آفاق کو گھیرا ہوگا

عین ممکن ہے کہ طوفان کے دب جانے پر
ابر کا اِک نئے انداز میں پھیرا ہوگا

کون جانے کہ اِدھر ابر کھلے گا، تو اُدھر
رات کے ہاتھ میں ظلمت کا پھریرا ہوگا

مَیں نے اِن دائروں میں گھوم کے دیکھا ہے کہ تم
مجھ میں غلطاں ہو مگر مجھ سے گریزاں بھی ہو

تم ستارہ ہو، شفق ہو، گلِ تازہ ہو، مگر
سنسناتا ہوا پُرہول بیاباں بھی ہو

تم جو بستی ہو جوانی کے سمن زاروں میں
اپنی تنہائی کے احساس سے ویراں بھی ہو

تم جو کترا کے نکلتی ہو مری نظروں سے
کتنے قصوں کا دمکتا ہوا عنواں بھی ہو

تم جو کہتی ہو کہ حوروں سے گراں ہے عورت
شبنم اور پھول کی مانند فراواں بھی ہو

تم نے لوٹا ہے مجھے تم نے بسایا ہے مجھے

میری رہزن بھی ہو میرا سروساماں بھی ہو

ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے نہ بہلاؤ مجھے
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے چلن جانتا ہوں

سرخ ہونٹوں میں ہے پامال جوانی کی پکار
میں کہ فنکار ہوں رنگینیٔ فن جانتا ہوں

اس اٹکتے ہوئے لہجے سے نہ کھاؤں گا فریب
میں تو انساں کا ہر اندازِ سخن جانتا ہوں

کیسے پندار کی بنیادوں میں بل آتے ہیں
کیوں چھپاتی ہو کہ میں تشنہ دہن جانتا ہوں

کتنی راتوں کے اندھیروں سے شناسائی ہے
کالے بالوں کی میں ایک ایک شکن جانتا ہوں

ڈالیاں مجھ کو بلاتی ہیں گلوں سے لد کر
پھول روتے ہیں کہ میں رازِ چمن جانتا ہوں

ہر ستارہ نہیں پیغامبرِ نورِ سحر
میں بصارت کے فریبوں میں نہیں آؤں گا

اتنی شدت سے نہ اپناؤ، کہ میں آخرِ کار
پاس رہ کر بھی بہت دور چلا جاؤں گا

یہ محبت کہیں محرومیٔ جاوید نہ ہو
کھو گئیں تم تو خدا کو بھی نہیں پاؤں گا

اس تبسم میں کہیں طنز کے نشتر تو نہیں!
اب امنگوں کو کھلونوں سے نہ بہلاؤں گا

اوس موتی بھی نہیں، اوس شرارہ بھی نہیں
عشق کو خام خیالی میں نہ الجھاؤں گا

جن کے دم سے مرا وجدان ہے ادراک آلود
ان شکستوں کی میں تاریخ نہ دہراؤں گا

مخمور جالندھری

اِن سے پُوچھو

لے چلو ہے کے پھندوں میں جکڑ کر مجھکو
میری سانسوں میں تعفّن ہے شرابی ہوں میں
چیتھڑے میرے بدن پر مری ذلّت کا ثبوت
عبرت آموز، حیا سوز خرابی ہوں میں
چارہ جوئی بھی تو میں اپنی نہیں کر سکتا
بیگناہی کا جو دعوے کروں مجرم ہوں میں
کوئی وقعت نہیں رکھتا مرا نادار بیاں
میرا افلاس خطا کار ہے ملزم ہوں میں
پا بہ زنجیر گذارو مرا سڑکوں سے جلوس

پا بہ زنجیر مجھے لے چلو بازاروں میں
قہقہہ مجھکو لگانا ہے ـــــ کہ ایواں لرزیں
کانپ کر ہاتھوں سے گر جائیں چھلکتے ہوئے جام
ڈر سے کھل جائیں عمارات کی سمٹی درزیں
اور تم سامنے وہ جھومتے منظر دیکھو
کوئی قانون اجازت نہیں دیتا جن کی
ان گناہوں کے لئے کوئی بھی تعزیر نہیں
عدل کیوں کوئی شہادت نہیں دیتا ان کی
دست و پا بستہ گذارو بھی مجھے گلیوں سے
مجھے اک نعرہ لگانا ہے کہ تہ خانے کھلیں
اور تم دیکھو ـــــ وہاں بند ہزاروں کی حیات

تشنہ لب کون رہے گا جو یہ میخانے کھلیں
جس نے تشہیر کا ٹھہرایا سزاوار مجھے
وہی تحقیق یہاں بھی تو پہنچ سکتی تھی
بزمِ تفتیش کا ہوتا نہیں کس گھر میں گذر
وہ نہاں اور عیاں بھی تو پہنچ سکتی تھی
لے چلو سڑکوں پہ لوہے سے گرانبار مجھے
میری پُر ہول ہنسی تا کہ ـــــ تجوری کھولے
اور تم دیکھو ـــــ چھپایا ہوا سونا چاندی
کیسے بیوپار کی اجرت ہے یہ ـــــ کوئی بولے؟
کیا "الہ دیں" کا چراغ ان کو پڑا پایا ہے
آسماں تک یہ اٹھائے ہوئے رنگین محل
ساز و ساماں سے لبالب یہ دکانوں کی قطار
کیا دیانت کے، صداقت کے، شرافت کے ہیں پھل؟

میرے افلاس سے کہتے ہو جو منسوب گناہ
ان سے بھی پوچھو یہ لاتے ہیں کہاں سے دولت!
ان سے پوچھو کہ ہے مجھ پر یہ نوازش کس کی
میں جو رہتا ہوں تعفّن میں ہمیشہ لت پت
ان شتاب نہیں کر سکتے ہو تم میرا سوال
وقت اڑتا ہوا آتا ہے فضاؤں میں گلال

شریف کنجاہی

"مہاجر"

جاؤ بڈھے نہ بے فائدہ سر کھپاؤ مرا
نانبائی کی دکاں نہیں میرا گھر
اور نہ میں اس فرشتے کا ایجنٹ ہوں
جس کے ہاتھوں میں ہے رزق کا انتظام
ہاتھ پاؤں ہلاؤ کرو کوئی کام

مجھ کو خود بھی تو مزدور درکار ہیں
تم سے لیکن بتاؤ میں کیا کام لوں
ٹوکری تم اٹھانے کے قابل نہیں
اور بجری بھی تم کوٹ سکتے نہیں
ٹھیک ہے تم ہو محتاج اور بے نوا
پھر بھی میں کیا کروں
تم کو خیرات دوں ؟
میرا مسلک نہیں ہے گدائی کی ترغیب دوں
میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جتنے گداگر ہیں سب جیل خانوں میں ہوں
تم مہاجر سہی
اور ویسے تو ہم بھی مہاجر ہی ہیں
اپنے اجداد آئے تھے خیبر کی راہ

ہندوکش کے پہاڑوں سے ہوتے ہوئے
بھوک اور پیاس کے صدمے سہتے ہوئے
ان دنوں یہ ٹرک اور ریلیں نہ تھیں
اور نہ کیمپوں کا تھا جابجا اہتمام
اس جگہ ہر کوئی اپنا دشمن ہی تھا

لیکن اجداد بھی تو بلا کوش تھے
وہ گداگر نہ تھے
وہ دراوڑ سے الجھے لڑے کول سے
ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے کاسے نہ تھے
میرے کہنے کا لیکن یہ مطلب نہیں
میں یہ کیا کہہ رہا تھا یہ کیا کہہ گیا
جاؤ بڈھے نہ بے فائدہ سر کھپاؤ مرا
میری کوٹھی ہے کوئی سرائے نہیں
نانبائی کی دکاں نہیں میرا گھر
اور نہ میں اس فرشتے کا ایجنٹ ہوں
جس کے ہاتھوں میں ہے رزق کا انتظام
ہاتھ پاؤں ہلاؤ کرو کوئی کام

بلراج کومل

کہانی اور کہانی

کہانیاں ہی کہانیاں آج تک سنی تھیں
کوئی پری تھی
وہ ایک دن گیت گاتی، ہنستی لچکتی آئی
مہکتے گلشن میں پھول چننے
چہار سو مسکراتی کلیاں تھیں، پھول اور سر اٹھیں تھیں
پری لچکتی، جمیل کلیوں کو گدگداتی
گلوں کی خوشبو کو سونگھتی اک حسین کیاری کے پاس آئی
قریب ہی ایک حوض تھا جس میں اس نے دیکھا
کہ اک حسینہ کی چشمِ رنگیں کسی کے قدموں کی منتظر ہے
پری نے سوچا —؟
پھر ایک دم یہ حسین کہانی
مری نگاہوں کے آنسوؤں ہی سے دھل چکی تھی
میں مدتوں ہی خلا میں کچھ ڈھونڈتا رہا تھا
مرے دریچے میں سہما سہما کوئی کھڑا تھا
اور اسکے پہلو میں دھندلے دھندلے سے ڈائرے کپکپا رہے تھے
پھر ایک دم دائرے فضاؤں میں گھل گئے تھے
مرے دریچے میں چند آنسو لرز رہے تھے

وہ خواب اب خواب بن چکے ہیں!!
نہ آسمانوں سے پریاں آتی ہیں اس زمیں پہ
نہ چشمِ رنگیں کسی کے قدموں کی منتظر ہے
مگر زمیں آج بھی جہنم بنے ہی سہے لاکھوں کہانیوں کو
کہ جن میں لاشوں کا رقص ہوتا ہے، بھوت گاتے ہیں
پریاں سہمی ہوئی سی منظر کو دیکھتی ہیں
کہانیاں ہی کہانیاں چار سو رواں ہیں

مگر مری یہ حسین دھرتی
جیسے مرے جگمگاتے تاروں نے آج اک داستاں
سنائی ہے، سوچتی ہے
یہ داستاں ہی وہ داستاں تھی
میں جس کی خاطر تڑپ رہی تھی
مجھے مسرت ہے میرے بیٹے نئی کہانی سنا رہے ہیں
میں اس کہانی میں سُن رہی ہوں وہ دھڑکنیں جس کو
لاکھوں صدیاں نہ سننے پائیں
میں ناچتی ہوں میں گا رہی ہوں

کہانیاں ہی کہانیاں میں سنا گیا تھا
میں آج اپنی زمیں کی داستاں لکھوں گا،
کہ جس میں انسان گیت گاتے رہیں گے پیہم
اور آدمیت کا رقص ہوگا!!!

خلیل الرحمٰن اعظمی

اجنبی سائے

ابھی ہیں آس لگائے یہ زیست کی راہیں
کبھی تو غم کے چراغوں سے پھول برسیں گے

یہ دھوپ چھاؤں یہ ہلتے ہوئے حسیں پردے — وہ چھٹ رہے تھے دھندلکے نکھر رہی تھی فضا
یہ اک غبار سا چھایا ہوا فضاؤں پر — وہ جگمگا رہے تھے قلب و نظر کے بت خانے
یہ آرزوؤں کی دنیا میں سرمئی بادل — مگر ہے بڑھ چلی کیوں آنکھ کی یہ حیرانی
ہے ایک نیند سی طاری ابھی ہواؤں پر — یہ آ رہے ہیں نظر اب بھی کیوں وہی چہرے

ابھی تو اُن کی طرف سے پیام آیا تھا — نئے اُفق سے وہی آفتاب نکلا ہے
ابھی تو کان میں گونجے تھے دُور کے نغمے — وہی ہے خواب جوانی، وہی نگاہ قتیل
مگر فضا میں یہ کیوں ہیں سکوت کی لہریں — یہ سوچ میں دل مجبور ہے کہ اب کیا ہو
طویل خواب میں شاید ہیں آج ویرانے — تلاش کر لیں کوئی ان جفاؤں کی تاویل

کبھی کبھی تو امیدوں کا جال ٹوٹا ہے — بہت دنوں سے ہیں لرزاں یہ اجنبی سائے
مگر نگاہ میں پھرتی رہی وہ اک تصویر — مگر وہ چشم عنایت ہے نیم باز ابھی
دلِ حزیں نے پرانے غموں سے اُکتا کر — ہزار بار جنون وفا ہوا عریاں
بنا لی اپنی محبت کی اک نئی تقدیر — مگر وہ حسن دو عالم ہے ایک راز ابھی

احمد ظفر

تسلسل

نئے چراغ نئی رہگذر پہ جلتے ہیں
اجالا اب بھی مگر تیرگی کی زد میں ہے
سکوتِ مرگ ابھی قہقہوں پہ طاری ہے
کھنکتے جام ابھی زہر سے چھلکتے ہیں!
زباں پہ جب بھی تھے محکومیوں کے افسانے
نظر میں آج بھی مایوسیاں جھلکتی ہیں
نئے رباب نئے چنگ تو ملے ہیں مگر
کوئی بھی گیت مسرت کے گا نہیں سکتا
ہزار غنچے چٹکتے ہیں پھول کھلتے ہیں
فسردہ چہروں کی افسردگی نہیں جاتی
حیات اب بھی بھٹکتی ہے شاہراہوں میں
نشانِ منزلِ ہستی کہیں نہیں ملتا

انور جلال

عقیدت

کون پرسانِ حال ہوتا ہے
اُس کلی کا جو لہلہاتی ہوئی
اپنے جوبن کے گیت گاتی ہوئی
دستِ گلچیں کے ایک صدمے سے
شاخ کو خیرباد کہتی ہے
ایک خاموش رسم سہتی ہے
اور پھر ایک ہاتھ میں بک کر
کہنہ معبد کی بھینٹ چڑھتی ہے
اور معبد کے دیوتا کا غرور
اُس کا رنگ و جمال پیتا ہے
یہ عقیدت ہے دیوتا کی غذا
وہ یہ خوراک کھا کے جیتا ہے

کرشن موہن

شرمیلی محبوبہ

(انگریزی کے ایک مابعد الطبیعاتی شاہکار کا تاثر)

دنیا اپنے بس میں ہوتی وقت اگر بس میں ہوتا
اپنے لئے پھر ظلم نہ ہوتا یہ تیرا شرمیلا پن
جرمِ عشق نہ ہوتا پھر انکار ترا
وقت کے سیلِ رواں کو روک جو سکتے ہم
سوچتے رہتے کیسے گذاریں لمبے دن لمبی راتیں ....
تو گنگا کے کنارے موتی چنتی رہتی شام و سحر
مَیں ہمبر کے ساحل پر
تیرے تغافل کے شکوے کرتا رہتا
لاکھ برس تیرا انکار روا رہتا

تیری آنکھوں کی تعریف میں لاکھوں سال بسر ہوتے
لاکھوں سالوں میں کھلتے تیرے سینے کے شوخ کنول
تیرے جسم کی پوجا میں کتنے ہی سال گذر جاتے
لاکھ برس میں تیرے بالوں کا اِک پیچ سلجھ سکتا
پھر جا کر میرا من تیرے من کا بھید سمجھ سکتا
بیتی صدیوں کے درپن میں مسکاتا جوبن تیرا
لاکھ برس تک شرماتا جوبن تیرا

لیکن — دیکھ بہا جاتا ہے وقت کا سیلِ فراواں
کیا یہ سپنے اِس کو ٹھہرا لیں گے — روک سکیں گے
تیری سُندرتا — یہ جوانی بھی پر تول رہی ہے

تیری جوانی جا کے نہیں آئے گی
قبر میں میرا گیت نہ سن پائے گی
کیڑے تیرے دوشیزہ ہونٹوں کے چوسے لینگے — رس چوسینگے
تیرے کنوارے گالوں کو کاٹیں گے
تیرا پیکرِ عصمت پھر کیڑوں کا مسکن ہو جائے گا
میرا عشق بھی آخر خاک میں کھو جائے گا
قبر ہے کنجِ خلوت — لیکن اُس میں
خلوتِ وصل فراہم ہو نہ سکے گی
ہم سے عشرتِ باہم ہو نہ سکے گی

اب کہ بہار ہے تیرے حُسن کے بس میں
تیرے جسم کے پھول پہ رخشاں ہے جوبن کی شبنم
تیرے انگ انگ میں رقصاں ہیں چنچل انگارے
آ یہ سہانا وقت نہ یونہی کھو دیں
آ یا ہم اُلفت کا رقص کریں
وقت، کا یہ سیلاب بہا جاتا ہے
روک نہیں سکتے ہم سیلِ رواں کو
روک نہیں سکتے — آ پیار کریں
جھومیں، گائیں، اِس کو بہنے دیں

جمیل ملک

تلوّن

تنہائی میں اکثر سوچتا رہتا ہوں

بچپن کے دن کتنے کیف بداماں تھے
جب ننھے دل کو غم کا احساس نہ تھا

ہر جانب خوشیوں کی لہریں رقصاں تھیں
روح پہ طاری عالمِ حزن و یاس نہ تھا

اف وہ زمانہ، اف وہ عالمِ مدہوشی
ذہن پہ رنگیں خواب سے چھائے رہتے تھے

سورج، چاند ستارے، پنچھی، گل بوٹے
اک سچی دنیا کی باتیں کہتے تھے

میں تھا ان کا اور وہ تھے میرے محبوب
ایک انوکھی کیفیت تھی الفت میں

نکہت و رنگ و نور کے طوفاں تھے ہر سو
میں رہتا تھا ایک اچھوتی جنت میں

تنہائی میں اکثر سوچتا رہتا ہوں

عہدِ جوانی مجھ کو کہاں لے آیا ہے
زیست میں اب پہلی سی کوئی بات نہیں

چاروں جانب اور ہی دنیا دیکھتا ہوں
اس میں بچپن کے سے وہ دن رات نہیں

اس دنیا میں چاہت کی وہ قدر کہاں
اس دنیا میں چاہ کی رسمیں جھوٹی ہیں

پل بھر میں دل توڑ کے یہ چل دیتے ہیں
جھوٹے محبوبوں کی قسمیں جھوٹی ہیں

اس دنیا میں ہر جھوٹی راحت کے بعد
روح کو کھا جانے والے غم ملتے ہیں

اس دنیا میں ہر جنت کے پردے میں
جاں فرسا، تاریک جہنم ملتے ہیں

تنہائی میں اکثر سوچتا رہتا ہوں

شاید میں اک اور بھی دنیا دیکھوں گا
ہولے ہولے جس کی سمت روانہ ہوں

اور — پھر اک دن وہ منزل آ جائے گی
اب تک جس کی صورت سے بیگانہ ہوں

سلام مچھلی شہری

"یادگار"

باغباں! شاخِ نسترن کو نہ توڑ—
— چاہے جیسی بھی ہو زمیں لیکن
کانٹے اُگتے ہیں، پھول کھلتے ہیں
ان ستاروں کی چال پر مت جا
خود بچھڑتے ہیں خود ہی ملتے ہیں
آج مانا ہوا مخالف ہے
اِس چنبیلی نے کیا بگاڑا ہے؟
رشتۂ لالہ و چمن کو نہ توڑ!

شیشۂ جلوۂ بہار نہ توڑ—
— ٹوٹ جائے گا سازِ موجِ شمیم
تتلیاں رقص بھول جائیں گی
اور بالائیں[1] اپنے جوڑے میں
کہکشاں گوندھ ہی نہ پائیں گی
اسی ہنستے ہوئے چمن کیلئے
ہم نے گھر کا چمن اجاڑا ہے
دلِ ویران و سوگوار نہ توڑ—!
اِک ذرا یہ گھڑی بھی ڈھلنے دے
آندھیوں میں چراغ جلنے دے—!!

[1] ایسی لڑکیاں جنہوں نے دوشیزگی کی منزل ابھی ابھی ختم کی ہو۔ سلام

سید احمد فراز

مشورہ

شیش محلوں کے دریچوں سے نہ باہر جھانکو
کہ ہر اک سمت نظر سوز نظارے ہیں ابھی
پھوٹ نکلیں گے رگِ سنگ سے جلتے لاوے
ذرّے ذرّے میں بغاوت کے شرارے ہیں ابھی

سازِ عشرت پہ نہ چھیڑو ابھی نغمات حسیں
کہ فضاؤں میں ابھی سوزِ دروں باقی ہے
اور کچھ دیر نہ کھنکاؤ ابھی جام و سبو
چند بے باک بگولوں میں جنوں باقی ہے

آندھیاں شور کرتی اُٹھی ہیں تو کچھ فکر نہیں
اور کچھ دیر میں دم توڑ کے رہ جائیں گی
دندناتی ہوئی، وحشت بھری سرکش روحیں
کچھ نہ پائیں گی تو سر پھوڑ کے رہ جائیں گی

اور پھر تم ہی خداوند ہو ان روحوں کے
جن کو آیا ہی نہیں راس بغاوت کرنا
پھر اسی طور سے ساغر بکف و نغمہ بہ لب
مسکراتے ہوئے بے خوف حکومت کرنا

عبدالمجید بھٹی

جلن

وہ پڑوسن کے بھی دینے ہیں ابھی
اور منّے کے سوا پانچ آنے
میں تو اس روز کی جھک جھک سے رہی
یہ ملامت، خفگی اور غصّہ
میری تذلیل گوارا ہے مجھے
تیری آنکھوں میں بھی عشرت کدے لہراتے ہیں
سرسراتے ہیں حریری پردے
جھلملاتے ہیں تری نظر دل میں زرکار لباس
اور تیری نظریں جلی جاتی ہیں
لیکن اس درد کا درماں کیا ہے
اس مقدر سے مفر — ؟ ناممکن
اپنی بدبختی کا ماتم ہی تجھے کرنا ہے
میری قسمت ہی کو رونا ہوگا
تیری برباد تمناؤں کا محور میں ہوں
میں جو ہوں تیرے لئے ربِّ مجاز
میں ترے جی کی جلن جانتا ہوں
یہ ملامت، خفگی، اور غصّہ
کچھ بھی ہو مصلحت آمیز بھی ہے
کچھ نہ کچھ حیلے بہانے سے بچے
کل کے لئے
آج بیکاری ہے کل بیماری
کون ہوتا ہے اڑے وقت کا ساتھی، ساجھی ؟
کھل کے تجھ سے نہ کہا جائیگا، شاید — لیکن
تری آشفتہ سری مجھ کو پتہ دیتی ہے
کپکپا دیتی ہے ایسی ہی کوئی سوچ مجھے
اور میری لاش پہ رو لیتی ہے تو
میں ترے جی کی جلن جانتا ہوں
یہ ملامت، خفگی، اور غصہ
ہے کسی کل کا امیں بھی شاید
جس میں رقصاں نظر آتے ہیں کئی خواب تجھے
جن میں آتی ہیں نظر مست فضائیں تجھ کو
جن میں لہراتے ہوئے گیت — سنورتے نغمے
آج کے فاقوں کی گھر جن میں ہے آباد وہ کل
جو تری کاہش و کلفت کا مداوا بن کر
منتظر رہتے پہ اکتاتی ہے
اور تجھے جینے کا پیغام دیئے جاتی ہے
میں ترے جی کی جلن جانتا ہوں
یہ ملامت، خفگی، اور غصّہ
یہ گوارا ہے مجھے، ہاں یہ گوارا ہے مجھے
لیکن آجائیں اگر تجھ کو نظر
میری آہوں میں سمٹتی ہوئی راہیں میری
میری تذلیل کے پہلو نہ رہیں گے لیکن
دب کے رہ جائیگا دل ہی میں ترے دل کا غبار
زندگی تیرے لئے۔ . اور بھی دوبھر ہوگی
ہاں کچھ اس طرح تراجی ہی تو ہلکا ہوگا
مجھ کو جل دینے کی راحت ہی سہی
کچھ تو ہو تیرے لئے
میں ترے جی کی جلن جانتا ہوں
ہاں تو بل جائینگے منّے کے سوا پانچ آنے
اور پڑوسن کے وہ دو بھی جو تجھے دینے ہیں

یوسف ظفر

جواز

(قیوم نظر کے نام، جس نے میرے غیر ادبی کسبِ معاش کو میری موت سے تعبیر کیا)

تری خموشی کے لہلہاتے مہیب طوفاں سے پوچھتا ہوں
گلوں کی عصمت فروش خوشبو پہ رحم کھاؤں کہ مسکراؤں!
ہوا اگر اپنے سادہ دامن میں بجلیوں کو سمیٹ لائے
تو اُس کی قسمت پہ ناز فرماؤں یا تحیّر میں ڈوب جاؤں
شبِ سیہ کے پھٹے ہوئے پیرہن سے چھوٹے جمالِ لرزاں
تو اُس کو تاروں کا نام دے کر ہنسوں کہ آنکھوں کے خُم لنڈھاؤں!

تری خموشی کے لہلہاتے مہیب طوفاں سے کہہ رہا ہوں
مرے تخیّل، مرے تصوّر پہ نازشِ ناروا نہ فرما
کہ اِن چراغوں میں تیل ہے تیری ہی نظر کی فسوں گری کا
مری حیاتِ شکستگی کی تمام ناکارہ آرزوئیں
عجیب سانچے بدل گئی ہیں
حسین قالبوں میں ڈھل گئی ہیں

تری نظر میں مرے تخیّل کی سربلندی ہے وسعتیں ہیں
وہ کائناتِ حسیں ہے جس میں مرا فسوں یوں ہے کارفرما
کہ جیسے اِک گلشنِ بہاریں میں ایک نغمہ — لطیف نغمہ
گداز سیمینیوں کی لہروں پہ بربطِ رنگ و بو سنبھالے
کسی بُتِ مرمریں کو چھیڑے، جگائے اور ہمنوا بنا لے
تری نظر میں مرے تصوّر کے سجدے ہیں — وہ مستکاری
کہ بیقراری سکوں تراشے، سکوت پر خامشی ہو بھاری
خیال کو ایسی خلوتِ خاص میں فریبِ جمال کر دے
کہ موت خود زندگی کے آگے درازِ دستِ سوال کر دے

ہزار تھی یورشِ زمانہ، مگر مرے فکر کی رسائی
ابد کے شفّاف آئنوں میں جلا کے قندیلِ خود نمائی
ترے تبسّم کی گود میں اپنی حسرتوں کو سُلا چکی ہے
تری نظر کی شگفتگی میں خزاں کی تعبیر پا چکی ہے
بہت دنوں تک یہ خود ہی مرے غموں کو چھپا چکی ہے

گریز سے مطمئن نہیں تھا، گریز سے مطمئن نہیں ہوں
مرا علاجِ الم یہی ہے کہ زندگی سے وہ کھیل کھیلوں
کہ پھر غمِ زندگی مرے خوابِ زارِ اُلفت میں در نہ آئے
کہ پھر تری خامشی میں کوئی مہیب طوفاں نہ بار پائے

قیوم نظر

آدم

یہ نرم و شیریں ہوا کے جھونکے
یہ داستاں گو بجھے دلوں کے
ہمیشہ یونہی اُٹھے ہیں گویا
رواں دواں تازگیٔ دنیا
دکھا کے اپنے بدلتے پہلو
جگا کے رعنائیوں کا جادو
ہر ایک ذرّے سے آشنا ہے
انہی کے بل پر ستم کدوں سے
نہ سامنے آئی منزلوں سے
میں سینہ تانے گزر سکوں گا
اُفق کے اُس پار اُتر سکوں گا
حسین خزانے سمیٹنے کو
مسرّتوں کے لپیٹنے کو
ہوا کی موجوں میں اور کیا ہے؟

ہوا کی موجوں نے ساز چھیڑا
ہوا کی موجیں میری تمنّا
نئی، انوکھی، نہاں، نمایاں
یہاں، وہاں، زندگی بداماں
عجیب کیفیتوں میں کھوئی
خرد کی ناکامیوں کا کوئی
اثر نہ جن پر کبھی ہوا ہے
ہوا کی موجوں میں کیا نہیں ہے؟
مگر یہی کو نہ آستیں ہے
یہ آدمی — یہ جنوں کا پرتو
یہ سرگراں زیست کی تگ و دو
ہزاروں موجوں کا ایک طوفاں
خموشیوں کو کیئے پریشاں
ملول و تنہا گذر رہا ہے

عدم

چوب دار

اے گئی رات کے سکتے کو جگانے والو قصرِ انصاف کی زنجیر ہلانے والو
فتنہ و شر کو کسی وقت بھی آرام نہیں جاؤ یہ شکوہ و فریاد کا ہنگام نہیں
شاہ اس وقت شبستاں میں ہوا کرتے ہیں حلقۂ گیسوئے جاناں میں ہوا کرتے ہیں
یہ محلوں کی قطاریں، یہ مناروں کے غبار باغ میں کوئی پرندہ بھی نہیں ہے بیدار
لیکے ارواحِ مقدس کے نوشتے اسوقت آسمانوں سے اترتے ہیں فرشتے اسوقت
وقت بیوقت کا احساس نہیں ہے تم کو شاہ کی نیند کا بھی پاس نہیں ہے تم کو

کیا غضب ہو گیا دو چار غزالوں کو اگر خلدِ گم گشتہ کے آوارہ نہالوں کو اگر
لیگئے قوتِ بازو سے جزیرے والے یوں ہی کرتے ہیں عقابوں کے وطیرے والے
عورتیں ہی تو تھیں، مرطوب نوالے ہی تو تھے پینے والوں کیلئے مے کے پیالے ہی تو تھے

جاؤ آرام سے سو جاؤ گھروں میں جا کر چین آجاتا ہے انسان کو تڑپ تڑپا کر
جاؤ خاموش فضاؤں کا فتیلہ کوئی غیض میں ڈوبی ہوئی روحِ جمیلہ کوئی
پھونک ڈالے نہ تمہیں اپنے نفس کی لَو سے آگ برسے نہ ستاروں کی مقدس ضو سے
جاؤ! چپ چاپ چلے جاؤ توقف نہ کرو آتشِ ضبط سے جل جاؤ مگر اُف نہ کرو

آگ کے کھیل کا انجام بُرا ہوتا ہے
حاکمِ وقت رعایا کا خدا ہوتا ہے

فارغ بخاری

تجربہ

پستیاں چھوڑ کے لپکے تھے فلک کی جانب — سوچتے تھے کہ اُفق پار سویرا ہوگا
چاند تاروں کے ضیا تاب شبستانوں میں — مسکراتے ہوئے خوابوں کا بسیرا ہوگا
مضمحل ذہنوں کو، رنجور تمناؤں کو — نقرئی کرنوں کے سیلاب نے گھیرا ہوگا

سوچتے تھے کہ تخیل کے سمن زاروں میں — خونِ انساں نہیں محبت کی شفق پھولی ہے
اب نئی گردشِ ایام نے رُخ پھیرا ہے — چرخ نے اپنی شقاوت کی ادا بھولی ہے
کارواں منزلِ مقصود پہ آپہنچا ہے — ناتواں ہاتھوں نے یزداں کی جبیں چھُو لی ہے

قرب ہونے پہ نگاہوں کو یہ عرفان ہوا — آگہی کہتے رہے جس کو وہ گمراہی ہے
جس کو ہم سادہ نظر کہکشاں سمجھے ہیں — وہ بھی قسطائیوں کا نقشِ کفِ پا ہی ہے
جذبۂ خدمتِ ملت میں ہیں اغراض نہاں — پردۂ عظمتِ جمہور میں بھی شاہی ہے

وہ موحد کہ رہی بت شکنی جن کا شعار — انکے افکار نے اصنام تراشے کیا کیا
کہنہ اقدار کی آرائشیں رہ رہ کے ہوئیں — جاگ اُٹھے مردہ روایات کے لاشے کیا کیا
مصحفِ پاک سے مذہب سے بھی لے کھیلے — زر پرستوں نے دکھائے ہیں تماشے کیا کیا

دور ہے دور بہت نقرئی کرنوں کا نظام — ظلمتوں میں ابھی آدم کو بھٹکنا ہوگا
ان سمن پوش بہاروں سے لپٹنے کیلئے — کئی کانٹوں کو ابھی دل میں کھٹکنا ہوگا

آگ میں کتنے براہیموں کو پڑنا ہے ابھی
کتنے منصوروں کو سولی پہ لٹکنا ہوگا

سید ضمیر جعفری

وطن پیارے وطن ...

ملایا کے مناظر بھی اگرچہ خوب ہیں لیکن

وطن، پیارے وطن! میں تیرے نظارے نہیں بھولا
تری راتیں، تری راتوں کے مہ پارے نہیں بھولا
برس لینے پہ ساون کی دُھلی خاموش راتوں میں
وہ سوئی سوئی رُت، وہ جاگتے تارے نہیں بھولا
چراگاہوں کے ہنستے، بولتے، گاتے ہوئے دامن
حسین فطرت کے وہ معصوم گہوارے نہیں بھولا

ملایا کی حسینائیں بھی گو محبوب ہیں لیکن

میں اُن بے عیب رخساروں کے انگارے نہیں بھولا
گھنی پلکوں سے رستے، ٹوٹتے تارے نہیں بھولا
وہ موسیقی جو آنکھوں میں چمک کر بول پڑتی ہے
میں اُس خاموش موسیقی کے شہپارے نہیں بھولا
بھرے چوکوں میں الھڑ شوخیاں مرغوب ہیں لیکن
وہ "چھپتی بجلیوں" کے تیز "چمکارے" نہیں بھولا

ملایا کے مناظر بھی اگرچہ خوب ہیں لیکن

وطن پیارے وطن! میں تیرے نظارے نہیں بھولا

نریش کمار شاد

آرٹسٹ

وہ خواب جن کو تراشا تھا میری آنکھوں نے
تصوّرات کے نور آفریں دھندلکوں میں
سلگتے، کانپتے۔ خاموش آنسوؤں کی طرح
جھلک رہے ہیں مری زندگی کی پلکوں میں
اِن آنسوؤں کو بھی دے کر ضیائے تابانی
تمہاری رُوح کی محراب میں جلاتا ہوں
میں زخم زخم ہوں بے شک مگر تمہارے لئے
مہکتے۔ جھولتے پھولوں کے گیت لاتا ہوں
تمہاری خشک نگاہوں کے آبگینوں میں
نچوڑتا ہوں میں قوسِ قزح کے رنگوں کو
پلا کے اپنے درخشندہ ولولوں کا لہو
نکھارتا ہوں تمہاری حسیں امنگوں کو
میں اپنے ساز کے نغموں کی نرم لہروں میں
تمہارے چہروں کی افسردگی ڈبوتا ہوں
مگر خود اپنی جوانی کی آرزوؤں پر
تمہارے بعد اکیلا ہی چھپ کے روتا ہوں
یہ میرا فن جو تمہارے دلوں کا غازہ ہے
مرے شباب کے جذبات کا جنازہ ہے

تخت سنگھ

لال سویرا

وہ دیکھو اگلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا
چھوٹ چلی ہیں رات کی نبضیں
کانپا گھور اندھیرا
من من میں ہے جیون بھر کے
سکھ سپنوں کا ڈیرا
لہرائیگا پل دو پل میں
ہر جا سرخ پھریرا
وہ دیکھو اگلرنگ اُفق سے
جھانکا لال سویرا

ایکا ایکی پھوٹ پڑیں گے
نور کے سمیں دھارے
شعلے بن کر ناچ اٹھیں گے
چرخ کے ٹھنڈے تارے
ہو جائیں گے راکھ جھلس کر
صدیوں کے اندھیارے
اُٹھنے کو ہے جیون پنتھ سے
دکھ کا ٹانڈا ڈیرا
وہ دیکھو گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

وہ کانٹوں کی شمشیروں کو
دیکھ کے گل غرّاتے
وہ ناچ اُٹھے خاک کے ذرّے
وہ غنچے مسکائے
وہ بھاگے کرنوں کے آگے
ڈھلتی رات کے سائے
وہ آزادی کے سورج نے
ہر سُو نور بکھیرا
وہ دیکھو گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

ایکا ایکی کروٹ لے کر
وہ محنت کش جاگے
وہ سیلاب سا امڈا ہر سُو
وہ ظالم اُٹھ بھاگے
کانپ رہے ہیں دھنیوں کے دل
مزدوروں کے آگے
وہ لاکھوں بھوکوں نے مل کر
محلوں کو جا گھیرا
وہ دیکھو اگلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

دھرتی پر سب کا حق ہوگا
سکھ کے دن آئیں گے
محنت کش اپنی محنت کا
خود ہی پھل کھائیں گے
آزادی کے مدھر ترانے
سب مل کر گائیں گے
راہگیروں کو چھو نہ سکے گا
کوئی چور لٹیرا
وہ دیکھو گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

شاد عارفی

"الستوا" سے "اجرا" تک

مجھ کو "تنہا چھوڑ دو، شعر و ادب خطرے میں ہے
فن برائے زندگی۔ یا للعجب خطرے میں ہے
کون جانے۔ جرم کیا ہے۔ بے سبب خطرے میں ہے

اِس نگوڑی شاعری میں کیا دھرا ہے، چھوڑیئے
آپ ہندی ہیں تو اُردو کیا بلا ہے چھوڑیئے
دیکھیے پنجرے میں "توتا"[1] چیختا ہے، چھوڑیئے

ہیں کبوتر کھولتی ہوں آپ دانہ ڈال دیں
ورنہ اِن سب کیلئے، ننّھو[2] کو بلّی پال دیں
آپ تو وہ ہیں غزلگوئی میں صدمہ ٹال دیں

قطعے لکھیے، نظم گھڑ لیجیے، غزل کہہ لیجیے
مصلحت آئے جو مانع، بے محل کہہ لیجیے
"خطِ نہ ملنے" ڈاک خانوں کا خلل کہہ لیجیے

ہو چکے ہیں بند۔ چوٹی کے رسالے آئیں کیا
(جب رسالے ہی نہیں، تو شاعری فرمائیں کیا
تیسرے درجہ کے اُمرتے ہیں۔ اُن پر جائیں کیا

یہ جو طاقوں میں پڑے سڑتے ہیں کیا کچھ بھی نہیں)
عورتوں کیواسطے۔۔ مَردوں کے لائق؟ جی نہیں
جانمن؟ جو پی چکا ہوں میں وہ تو نے پی نہیں

پوچھ سکتی ہوں کہ ٹوٹا اِن پہ تندر[3] کس لیے
"فن برائے زندگی" جیلوں کے اندر کس لیے
"کوزۂ "رجعت پسنداں میں "سمندر" کس لیے

تم نہ سمجھو گی کہ کیا ہے آج اردو کا مقام
آ چکا ہے جس صحافت کا صفِ اول میں نام
ہند و پاکستان اِس پر رکھ رہے ہیں اِتہام

دوست کو دشمن سمجھ لینا ہی دانائی نہیں
کوئی جائزِ نکتہ چینی وجہِ رسوائی نہیں
معنویت لیجیے۔ الفاظ پیمائی نہیں

ہے وہی زندہ ادب جو ارتقا کو گدگدائے
وہ نہیں جو آسماں پر آہ کی ٹھنگلی لگائے
احمقوں کی شان میں لمبے قصیدے۔ ہائے ہائے

عہدِ حاضر میں یہ "جھانپل ازم" چل سکتی نہیں
"باز" کا پرچار کر کے "چیل" پل سکتی نہیں
لوگ کس۔ ٹہنی کو کہتے ہیں کہ پھل سکتی نہیں

خامیوں پر طنز جب قید و قفس کی بات ہے
سینکڑوں پر جائے گی۔ دو چار دس کی بات ہے
نظم کہنی چھوڑ دوں کیا میرے بس کی بات ہے

دوپہر سے آپ میں کچھ شاعرانہ مُوڈ ہے
پنسل کب تک بنے گی والہانہ مُوڈ ہے
چھت کو نظروں کا بنا لیجے نشانہ — مُوڈ ہے

[1] طوطے کا یہی املا درست ہے۔ [2] بچے کا نام۔ [3] بجلی۔

افضل پرویز

خاکم بدہن

وہ ستم کیش و جفا پیشہ بتِ عربدہ جُو
صنمِ سنگ دل و آئینہ رُو
اُس کے زرکار جھروکے ہی تک
مری آواز پہنچ پائے اگر
تو بصد عجز کہوں
تیری زلفوں کی سلاسل کو سنوارا میں نے
اور ترا حُسن نکھارا میں نے
ترے ہونٹوں کو مسیحائی دی
ترے ابرو کو کماں دی میں نے
تری مژگاں کو سناں دی میں نے
اور پھر تو نے مجھے کیا بخشا؟
تُو نے لُوٹا مری صبحوں کا سکوں، راتوں کا چین
تُو نے تاراج کئے میری محبّت کے محل
تُو نے تاریک کئے میری مسرّت کے کنول
تو نے نیندیں مری آنکھوں سے چرا لیں ساری

تُو نے مجھ بندۂ بے دام سے منہ موڑ لیا
بڑا نازک تھا مرا شیشۂ دل توڑ دیا؛
جانتا ہوں مری فریاد کی مدھم تانیں
طبعِ نازک پہ گراں گزریں گی
اُس کے ابرو کی کماں غیظ سے تن جائے گی
آنکھیں چنگاریاں برسائیں گی
اس کے تیور کا اشارہ پا کر
اس کے دربان مجھے کتوں سے نچوا دیں گے
کسی دیوار میں چنوا دیں گے
پھر بھی میں ضبط نہیں کر سکتا
کیسے میں اپنی زباں کو سی لوں
کس طرح سینے پہ پتھر رکھ لوں
دل کہلوائے گا جو۔ کہہ دوں گا
دل تو دیوانہ ہے
اور دیوانہ بہلتا نہیں بہلانے سے

قتیل شفائی

دردِ مشترک

مَیں نے جو ظلم کبھی تجھ سے روا رکھا تھا
مَیں نے جو تیر ترے ہاتھ سے چھینا تھا کبھی
جس کی خاطر تری ذلّت بھی گوارا تھی مجھے
میری آنکھوں نے جسے چاند کہا تھا کل تک
تو نہ چاہے بھی تو آفاق ہنسے گا مجھ پر

آج اُسی ظلم کے پنجے میں گرفتار ہوں میں
آج اُسی تیر کے گھاؤ سے نگوں سار ہوں میں
آج اسی "پیکرِ عصمت" کا خطاکار ہوں میں
آج اُسی شعلۂ پرّاں سے عرق بار ہوں میں
وقت کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار ہوں میں

مَیں نے چاہا تھا کہ انسان کی عظمت کے لئے
ایک ٹھکرائے ہوئے پیار کے صدمے بانٹوں
ایک جھلسے ہوئے احساس کو ٹھنڈک بخشوں

ایک مظلوم جوانی کو سہارا دے دوں
ایک بھٹکے ہوئے راہی کو اشارہ دے دوں
اور کونین کو پھر ذوقِ نظارہ دے دوں

مَیں نے اخلاص کے پھولوں سے بنائے گجرے
مَیں نے روندی ہوئی راہوں پہ بچھائیں آنکھیں
مَیں نے افلاس کے دریا کا تموّج پی کر

میں نے احساس کے جھولوں میں جھلایا اُس کو
مَیں نے پیغام ستاروں کا سنایا اُس کو
اک نئی آس کے ساحل پہ لگایا اس کو

آج مَیں سوچ رہا ہوں شبِ تنہائی میں
دیکھ اِس دَور میں ایوانِ محبّت کے لئے
کل ترے دیدۂ حیراں سے لہو پھوٹا تھا

کِس قدر تلخ جوانی کی لٹی یادیں ہیں
کیسی کیسی غم و اندوہ کی بنیادیں ہیں
آج میرے لبِ خاموش پہ فریادیں ہیں

یہ محبت، یہ وفائیں، یہ مروّت، یہ خلوص
حُسن، اور حُسن کے ہر ایک صنم خانے کو
آ کہ اِس دَور کا معیار بدلنا ہے ہمیں
آ کہ اِس جنسِ گراں قدر کو بیدار کریں

ان کو سرمائے نے بیکار بنا رکھا ہے
زر پرستوں نے جفا کار بنا رکھا ہے
جس نے ہر ذہن کو بیمار بنا رکھا ہے
جس نے ہم سب کو خریدار بنا رکھا ہے

آ کہ اس فتنۂ زر پوش کو عریاں کر دیں
جس نے آفاق کو بازار بنا رکھا ہے

اعجاز بٹالوی

کتنی لڑکیاں، کتنے لڑکے اِس دنیا میں رہتے ہیں
پھر بھی تنہا تنہا ہیں، اپنا اپنا غم سہتے ہیں

ہم اُن کی باتیں پھولوں سے کبھی پروانوں سے کہتے ہیں
جب اُن سے ملنا ہوتا ہے ہم اکثر چپ ہی رہتے ہیں

ہم بستی بستی دیکھ آئے، ہم نگری نگری ڈھونڈ چکے
جو ہم کو بنا لیں گے اپنا وہ کون سے دیس میں رہتے ہیں

اِس دَور کے اِک فرہاد کا قصہ ساری دنیا سنتی ہے
جب ہنسنے والے ہنستے ہیں کیوں اپنے آنسو بہتے ہیں

ہم اُن کے خیال میں کھوئے رہے وہ اور کسی کے ہو بھی چکے
اور دیکھو دنیا والوں کو وہ اس کو محبت کہتے ہیں

میخانے والوں سے کہہ دو ساقی کی بات پہ مت جائیں
یہ ساقی جام نہیں دیتے سب جھوٹی باتیں کہتے ہیں

جب پھول چمن میں کھلتے ہیں، باغوں میں بہاریں آتی ہیں
اِن وعدہ کرنے والوں کی ہم راہیں دیکھتے رہتے ہیں

وہ اُن کا زمانہ بھی کیا تھا ہر اک کہانی کہتا تھا
اب ڈھلتی جوانی کے دن ہیں وہ کھوئے کھوئے رہتے ہیں

جگن ناتھ آزاد

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی، آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

اندازۂ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آجانے سے
ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

یہ گلشن تو ہے گلشن تو اے فکرِ کہن کے دیوانو
بیمارِ تفکر آخر اس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

اس دَور میں بھی کام آئے گا صدیوں کا پرانا علم ہمیں؟
اے پیرِ دبستاں بول ذرا دستورِ دبستاں کیا ہوگا

تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہوا
تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہوگا

اے بھاگنے والے وقت ہے یہ، ہاں صحنِ چمن سے بھاگ نکل
جب باغ قفس بن جائیگا اس وقت گریزاں کیا ہوگا

عدم

بربط ذرا سنبھال، بہار آ ہی جائیگی
ساغر میں رنگ ڈال بہار آ ہی جائیگی

بکھرا فضا کے دوش پہ جب جھومتا ہوا
کالی لٹوں کا جال، بہار آ ہی جائیگی

ہلکے سے اک لطیف تبسم کی دیر ہے
اے صاحبِ جمال بہار آ ہی جائیگی

اے مہ جبیں بہار کا اتنا بھی کیا خیال
اتنا بھی کیا خیال، بہار آ ہی جائیگی

ایسا کبھی ہوا ہے کہ آئی نہیں بہار
آنچل ذرا سنبھال بہار آ ہی جائیگی

جاتی ہے دُور دور صراحی کی لے عدم
ساغر ذرا اُچھال بہار آ ہی جائیگی!

اختر انصاری

•

محبت کے غمزوں سے کب تک نباہیں؟
بتا اے جدائی! کہاں تک کراہیں؟
اِدھر سوزشِ دل، اُدھر کاہشِ جاں
اِدھر جلتے آنسو، اُدھر ٹھنڈی آہیں
یہ افسردہ چہرہ، وہ مغموم صورت
یہ ترسا ہوا دل، وہ پیاسی نگاہیں
اُلٹ کیوں نہ دیں اس بساطِ الم کو؟
نہ تم ہم کو چاہو، نہ ہم تم کو چاہیں
نہ تم نام لو گفتگو میں ہمارا
نہ ہم اپنے شعروں میں تم کو سراہیں
بہت ہو چکا پیار اے عہدِ ماضی!
ہٹا ہاتھ اپنے، سمیٹ اپنی باہیں
نئے دَور نے مجھ کو آواز دی ہے
بلاتی ہیں مجھ کو نئی سیرگاہیں
پکارا ہے مجھ کو نئی منزلوں نے
مری منتظر ہیں نئی شاہراہیں
حقائق کی زد سے بچا دل نہ اختر
بہت ہم نے خوابوں میں ڈھونڈیں پناہیں

رضا ہمدانی

•

نہ اس قدر نظرِ التفات فرماؤ
دلِ حزیں کی کہیں دھڑکنیں نہ بن جاؤ

یہ موڑ بھی ہمیں لایا لہو کے سنگم پر
نئی حیات ملی بھی تو موت کے بھاؤ

گماں یہ تھا ترے آغوش میں سکوں ہوگا
جھلس رہا ہے یہاں بھی تضاد کا تاؤ

ابھی دکھاؤ نہ مجھ کو وفا کا آئینہ
ابھی میں سوچ رہا ہوں ذرا ٹھہر جاؤ

کچھ اس ادا سے بڑھو منزلِ وفا کی طرف
کہ داستانِ غمِ زندگی نہ بن جاؤ

احمد راہی

•

چھوڑ گئے ہو جب سے پیارے، چلے گئے ہو جب سے بچھڑ کے
موسمِ گل میں بھی اب دل میں رہتے ہیں ڈیرے پت جھڑ کے

ٹوٹ چکی ہیں ساری امیدیں، سارے سہارے ٹوٹ چکے ہیں
کوئی نہیں جب اپنا پرایا جانے دل کس آس پہ دھڑکے

کس کو خبر تھی الفت میں یہ حال بھی ہو جائیگا دل کا
کس کو گماں تھا اک دن یہ بستی یوں رہ جائیگی اجڑ کے

رات رات بھر تیرے غم میں پلکوں پہ جل دیپ جلائے
میں ہی جانوں تیرے غم میں جو شعلے بجھ بجھ کر بھڑکے

بات بات پر رونے والے رو رو کر ہلکان نہ ہوتا
اکثر یوں بھی ہو جاتا ہے بن جاتی ہے بات بگڑ کے

سید ضیا جعفری

بڑھو کہ رنگِ زمانہ بدلیں چلو چلو ہمت آزمائیں
جنوں کی لَو اور تیز کر دیں، فسردہ شمعوں کو پھر جلائیں

خزاں زدہ وادیوں پہ ہر سمت موت منڈلا رہی ہے اب تک
مگر یہ ارشاد ہے کہ اس کو بہار کہہ کر فریب کھائیں

یہ قاعدہ ہے سحر سے پہلے عروج ہوتا ہے ظلمتوں کا
مگر اٹھو اے فطرتِ درخشاں چراغِ قلب و نظر جلائیں

وہ جس نظر سے شراب بن کر برس رہا ہے لہو بشر کا
پھر اس نظر کا فریب کھائیں؟ پھر ان نگاہوں کے گیت گائیں؟

سنہری کرنوں کے روپ میں ہر سراب کو کہکشاں سمجھ کر
یہ دَور ہے عصرِ جواں کے راہی غبارِ منزل میں کھو نہ جائیں

بساطِ محفل بدلنے والو، پکارتی ہیں تمہیں بہاریں
چلو چلو سازِ نو اٹھائیں، فضائیں نغمے بکھیر آئیں

نذیر مرزا برلاس

یہ شاعرانہ سا ماحول ہم کو راس آیا
غزل کا روپ لئے کوئی اپنے پاس آیا

اداس اداس سے منظر ہیں شاہراہوں کے
مسافرو کوئی پھر سے مقامِ یاس آیا

بڑے عجیب ہیں دیر و حرم کے افسانے
یہ ہر مقام سے ذوقِ نظر اداس آیا

گھنیری زلفوں کے سائے میں زندگی بیتی
مری بلا سے زمانہ اگر نہ راس آیا

شراب خانے کی محدود سی فضاؤں میں
غمِ حیات نہ اک لمحہ آس پاس آیا

نذیر عہدِ جوانی کا اعتبار نہیں
بڑے نصیب ہیں اسکے یہ جس کو راس آیا

حسن طاہر

وہ شعلے اُٹھے ہیں قفس سے چمن جل رہا ہے
جلے خود یہ سمجھے نظامِ کہن جل رہا ہے

توقع تھی مل کر بجھے گی تپش دل کی لیکن
شرارے اُگلتی ہیں آنکھیں بدن جل رہا ہے

سُنا تھا کہ فصلِ گُل آئی ہے اپنے چمن میں
مگر کیوں بہاروں کا یہ بانکپن جل رہا ہے

سمجھتے رہے کھیل اُلفت کو اب ہوش آیا
کہ دل خود ہی ٹوٹے اٹھا پیرہن جل رہا ہے

کھِلے ہیں وہ نفرت کے پھول اپنی خاکِ وطن سے
یہ عالم ہے اِک ایک کوہ و دمن جل رہا ہے

یہاں تک پہنچ آئے ہیں اپنی اندھی لگن میں
گرا شیخ دھرتی میں اور برہمن جل رہا ہے

بلندی سے اک روشنی ہم نے دیکھی تھی طاہر
جواب دیکھتے ہیں تو اپنا چمن جل رہا ہے

حافظ لدھیانوی

دامن الجھ الجھ کے جو خاروں میں رہ گئے
دیکھو تو کتنے پھول بہاروں میں رہ گئے

کب بستیوں میں آئے جنہیں ماہرو کہیں
جلوے شبِ فراق ستاروں میں رہ گئے

اے گردشِ زمانہ کچھ ان کا پتہ بتا
وہ قافلے جو راہ گزاروں میں رہ گئے

کیا انقلابِ دہر کی نیرنگیاں کہیں
ہم چند لوگ ہیں جو ہزاروں میں رہ گئے

کلیاں ہی کھل سکیں، نہ کہیں جشنِ مے ہوا
بادل برس برس کے بہاروں میں رہ گئے

احباب کے بغیر ہے کیا لطفِ میکشی
ہم اک پرانے بادہ گساروں میں رہ گئے

حافظ چمک رہے ہیں مژہ پر سرشکِ خوں
محصور ہو کے کیسے شراروں میں رہ گئے

ناصر کاظمی

کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے
وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے

در و دیوار ویراں شمع مدھم
شبِ غم کا سماں دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں!
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

کہیں خوں اور کہیں لاشوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے!
غمِ ہر کارواں دیکھا نہ جائے

کہیں تم اور کہیں ہم کیا غضب ہے
فراقِ جسم و جاں دیکھا نہ جائے

بھری برسات خالی جا رہی ہے
سرِ ابرِ رواں دیکھا نہ جائے

ترے جلوے زمیں سے آسماں تک
تو کیا اے بدگماں دیکھا نہ جائے

وہی جو حاصلِ ہستی ہے ناصرؔ
اسی کو مہرباں دیکھا نہ جائے

مجید شاہد

مانوس ابھی تک ہیں دھندلکوں سے سویرے
لہرائیے آنچل کہ فضا پھول بکھیرے

پلکیں تو اٹھاؤ کہ ستاروں کو خبر ہو،
ہوتے ہیں کہاں چاندنی راتوں کے بسیرے

چھلکا دے پھر اک بار بھری بزم میں ساقی
وہ جام جو رخ گردشِ ایام کا پھیرے

حالات پہ موقوف ہیں ماحول کے اطوار
جذبات کو کیوں شدّتِ احساس نہ گھیرے

الزام نہ دے ورنہ یہ بھٹکے ہوئے راہی
آکاش کے اُس پار بھی جا ڈالیں گے ڈیرے

ہر بار تری ہنستی ہوئی آنکھوں نے جھک کر
اک بھید چھپایا تو کئی راز بکھیرے

کونین کی ہر شے کو سُلا دیتے ہیں شاہدؔ
اُن سُرمئی زُلفوں کے نشیلے سے پھریرے

مقبول حسین احمد پوری

گیت

جگ کے سجل نینوں کے آنسو
دُکھ سے تڑپتے دلوں کی دھڑکن
لیکے تُم تولو اِن شبدوں میں
بھاونا رس بھری جائے بن
دیکھوں کیسے نہ ہوگا بے کل سُکھ بھوگی نیتاؤں کا من

بے گھر بار ہیں کتنے مہاجر
تجے ہوئے سُکھ ساج جگت کے
موت سے پہلے ہی جیون میں
اُن کو قیامت ہے یا پرلے
کانپ رہا ہے یہ برہمانڈ کراہ سے
سُن نہیں سکتا اُن کی گلیَن
کیا اب بھی کچھ اثر نہ لے گا سُکھ بھوگی نیتاؤں کا من؟

اپنے وطن سے جب وہ سدھارے
چھوٹ گئے سب اُن کے سہارے
ہو رہے بس سپنوں کے ساتھی
اُن کے یار، یگانے پیارے
کھوج رہے اِک رین بسیرا
سب بسرا سے وہ بیچارے
کب جاگے گا مد بدرا سے سکھ بھوگی نیتاؤں کا من؟

کیا جب یہ آکاش دھواں سا
اپنے ہی آپ میں کھو جائے گا
کیا جب یہ دھرتی کا گولا
ٹوٹ کے ٹکڑے ہو جائے گا
کیا تب ہی اِس دُکھ کے کھیل کے
رچنے والے لیں گے چین؟
کِس آدرش کی دُھن میں لگا ہے سُکھ بھوگی نیتاؤں کا من؟

اکرم انگار

آرتی

اپنی دنیا میں اندھیارا اجیارا دھن وان
شانت رہو بھگوان

راج تجھے سونپیں تو چگلے تاج لیے بھاگیں
کیسے دوا اسے ہم دکھیا رے اس دیپ جلائیں
مار کسکے نام پہ لوٹے زر دھن کا ایمان
آن دیکھے بھگوان

مایا ساگر، دھرتی نیا، دھن والے پتوار
پار لگیں یا ڈوب مریں ہم جیت نہ ہار تہار
ان چرنوں میں سدا رہیگی پھولوں کی مسکان
شانت رہو بھگوان

اپنی دنیا میں اندھیارا اجیارا دھن وان

خاطر غزنوی

سہاگ

گورے ہاتھوں میں مہندی رچی

آج بکھرے ہاؤں میں سنیوں کے گیت
آج پوری ہوئی ساری ریتوں کی ریت

آج آنگن میں دھوم اک انوکھی مچی
گورے ہاتھوں میں مہندی رچی

پیار سے پھولوں سے سندریا نازوں پلی
کھلی گھونگھٹ کی چھاؤں میں کومل کلی

سب کے نینوں میں پیاری دلہنیا جچی
گورے ہاتھوں میں مہندی رچی

تنویر نقوی

نیا ترانہ

نیا ترانہ گائیں ــــ اے دل گائیں نیا ترانہ

گائیں اور مٹاتے جائیں ہر اک نقش پرانا ـــــ اے دل ـــــ گائیں نیا ترانہ

چھپ چھپ کی چلتی لے پر، ہر پہیا چکرائے

ان پہیوں سے لپٹ لپٹ کر راہ نشیمن بنائے

گھوم رہا ہے چکراتے پہیوں کے ساتھ زمانہ ـــــ اے دل ـــــ گائیں نیا ترانہ

ان راہوں سے پھوٹ رہے ہیں گرم لہو کے دھارے

ان راہوں میں بچھے ہوئے ہیں کانٹے اور انگارے

ان کانٹوں سے انگاروں سے ہنستے گزرتے جانا ـــــ اے دل ـــــ گائیں نیا ترانہ

ہنستے ہنستے آگ میں کودیں پربت سے ٹکرائیں

منجدھار کو کھیل سمجھ کر بے خوف بہہ جائیں

آندھی آئے، طوفان آئے پھر بھی دیپ جلانا ـــــ اے دل ـــــ گائیں نیا ترانہ

افسانے ڈرامے

ابراہیم جلیس — قرۃ العین حیدر

مہندر ناتھ — فیاض محمود

ممتاز مفتی — اختر احمد دہلوی

بلونت سنگھ — ابوالفضل صدیقی

اوپندر ناتھ اشک — شاہد احمد دہلوی

اے حمید — ناصر شمسی

اور

میرزا ادیب

ہمارے ساتھی

ابراہیم جلیس:- بہت تیز رفتاری سے لکھتا ہے۔ اور بہت اچھا لکھتا ہے۔ لکھتے لکھتے اسے کبھی خاص کیفیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر وقت "حاضر و ناظر" رہتا ہے خود بھی ہنستا ہے۔ اور دوسروں کو بھی ہنساتا رہتا ہے۔ مگر ہنسی ہنسی میں طنز کے ایسے زہر آلود نشتر چبھوتا ہے جن کی خلش مدت تک دل کی گہرائیوں میں محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مشاہدے اور خلوص کی گہرائی اس کی ہر تحریر کی نمایاں ترین خوبی ہے۔ اس عظیم فنکار کے دوست اس کی دوستی پر ناز بھی کرتے ہیں۔ اور ڈرتے بھی ہیں۔ نہ جانے جلیس کب کسی "پول آثار" میں ان کے ناز ہائے درونِ پردہ کو بے نقاب کر دے۔

مہندر ناتھ:- افسانہ نویس اور فلم آرٹسٹ۔ افسانہ نویس کی حیثیت سے جب نیا افسانہ کار ادب کے میدان میں آتا ہے تو لوگ اسے آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ لیکن جب فلمی ہیرو بن کر سکرین پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ تو تماشائی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جس قدر کامیاب افسانہ نگار ہے اسی قدر ناکام ہیرو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج تک کسی تجربہ کار ہدایت کار نے اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش نہیں کی۔ موضوعِ فکر عام طور پر جنسی زندگی ہے مگر خود فلک سے کسی ہو دو پرنچی اس ازلی اور ابدی رشتے کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو انسان اور چاندنی کے تاروں کے درمیان قائم ہے۔ آجکل ان گالیوں کو جمع کر رہا ہے جو ہمارے طبقاتی سماج میں عام ہیں۔ ایسے شرافت مآب لوگ ان کے منہ سے یہ گالیاں سن کر ضرور تھیلا اٹھیں گے۔

ممتاز مفتی:- نیم شعوری اور غیر شعوری کیفیات، کمزور خیال کا پارکھ ہے اور چابکدست مصوّر! مخصوص فن کی مشعل لے کر جب زندگی کی اندھیری کوٹھڑی میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو حیاتِ ذہن کے ایسے تاریک گوشے بھی روشنی میں آ جاتے ہیں جن کو روزمرہ کی زندگی میں شعور بھی محال ہے۔ اس کے افسانوں میں سادہ سی باتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن ان سادہ باتوں کی تہوں میں جنسی پیچیدگیوں کی ایک دنیا رینگتی رہتی ہے۔

فیاض محمود:- پہلے انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے۔ اب پرواز کر کے رائل پاکستان ایئر فورس میں ونگ کمانڈر ہو چکے ہیں۔ مگر اس بلندی پر پہنچنے کے باوجود انسانی زندگی کا جو پہلو پروفیسری کے زمانے میں آپ کا موضوعِ فکر تھا وہ ابھی مرکزِ توجہ ہے۔ ایک معمولی سا ذہنی حادثہ، "ایک غیر اہم سی رومانی خلش" ——— اس نقطے کے سینے میں آپ کی ساری کی ساری افسانوی کائنات سمٹ کر سما جاتی ہے۔

بلونت سنگھ:- پنجاب کی دیہاتی زندگی کا کامیاب ترین عکاس۔ آجکل پنجاب سے دور ایک سرکاری پرچے کے مدیرانہ فرائض انجام دے رہا ہے۔ بلونت کے پیش نظر زندگی کا صرف ایک پہلو نہیں پوری کی پوری انسانی زندگی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم فن کار ہے۔ اور ایک سچے فنکار کے فرائض سے بخوبی واقف ہے۔ بلونت کے بیان میں توازن اور ٹھہراؤ کی جو کیفیت نظر آتی ہے وہ اردو کے بہت کم افسانہ نگاروں میں موجود ہے۔

اوپیندر ناتھ اشک:- اردو اور ہندی ——— دونوں زبانوں کا مسلّم ثبوت، افسانہ نویس اور تمثیل نگار سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ کیونکہ انسانی زندگی کو اتنی نزدیک سے دیکھ چکا ہے کہ اسے سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے اسے اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھال کر سپردِ قلم کرتا ہے۔ کبھی کبھی جذباتی شدت میں آپ سے خفا بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کو برا بھلا بھی کہہ دیتا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے سب کچھ فراموش کر کے انتہائی محبت کے ساتھ آپ کو گلے سے لگا لیتا ہے۔ کہا کرتے ہیں "میں قدرت کی تمام غریبیوں کو شکست دے کر چھوڑوں گا"

قرۃ العین حیدر:- اونچے طبقے کی افسانہ نویس جن کا افسانوی ماحول عوام کے لئے یکسر اجنبی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ان چیزوں کے متعلق لکھتی ہیں جنہیں عام لوگ اپنی حقیقی زندگی میں نہیں دیکھ سکتے۔ کچھ دنوں سے آپ کی شعریت بآغوش افسانوی فضا میں تلخ حقائق کا زہریلا دھواں بھی پھیلنے لگا ہے اور افسانے کا مستقبل ایک نئی قرۃ العین حیدر سے آشنا ہونے والا ہے۔

اے حمید:- اُردو افسانے کی دنیا میں ایک نیا رنگ، ایک نیا ڈھنگ اور ایک نئی قسم کی ذہنی جامعیت لے کر آیا ہے۔ انداز بیان اس قدر دلآویز۔ اس درجہ میٹھا کہ بہار کی ایک صبح خنداں کی نکہت میں ڈوبی ہوئی ایک موج پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیوں میں سے جھومتی ہوئی گزر جائے۔ اے حمید ابھی زندگی کے شفق زار میں گم نہیں۔ مگر وہ وقت دور نہیں۔ جب اس افسانہ نویس کو شفق کی رنگینیوں میں خون کی سُرخی جھلکتی ہوئی نظر آنے لگے گی اُردو کا شاید ہی کوئی افسانہ نگار اے حمید جیسا تابناک آغاز لے کر میدان میں آیا ہو۔ مگر جس تیزی سے یہ آگے بڑھ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا مستقبل آغاز سے بہت زیادہ روشن اور تابندہ ہوگا۔

شاہد احمد:- مشہور ماہنامہ "ساقی" کے ایڈیٹر مذہب آلود نقاد اور مترجم۔ دہلی سے کسمپرسی کی حالت میں پاکستان آئے۔ سب کچھ چھوڑ آئے۔ مگر تصنیف و تالیف کی وہ ہمہ گیر امنگ ساتھ لے آئے جو انہیں وراثت میں ملی ہے۔ ساقی پھر باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اور اپنے مخصوص حلقے میں شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی:- تجربہ کار شکاری اور پختہ مشق افسانہ نویس۔ بظاہر ان کے شوقِ شکار کو افسانہ نگاری سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ مگر جب یہ لکھ کر شکار کرتے ہیں تو اُردو کو ایک نہایت دلچسپ اور بلند قسم کا افسانہ دے دیتے ہیں۔ ابوالہول کے نام سے ایک نہایت اچھا ناول بھی لکھ چکے ہیں — بعض لوگ پوچھتے ہیں ابوالفضل کو ابوالہول کا نام کیوں پسند آیا۔ ایک دو صاحبوں کی رائے ہے کہ ابوالفضل اور ابوالہول میں کچھ لفظی مناسبت ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے — آجکل صدیقی صاحب ایک اور ناول لکھ رہے ہیں۔

اختر اورینوی:- جس زمانے میں اُردو کے بڑے اچھے افسانے لکھے جا رہے تھے، اختر اورینوی افسانے کی دُنیا میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگے نکل گیا۔ اختر جذبات نگاری اور تحلیلِ نفسی کا ایک نیا انداز لے کر آیا ہے۔ اور ان خوبیوں کی بنا پر اس کے دو افسانوں نے خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔

ناصر شمسی:- اُردو کے چند ڈرامہ نگاروں میں امتیازی رنگ کا مالک جو ڈرامے کی تکنیک کا ماہر ہے۔ اور اس کا ڈرامہ "ترے کوچے سے ہم نکلے" ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

ابراہیم جلیس

آزاد غلام

ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کے نام

اٹھارہ سال کے بعد آج :-

بابو دین محمد کی زوجہ شاکراں بڑی خوش خوش گھر کے سارے کمروں میں سامان اکٹھا کرتی، باندھتی پھر رہی تھی۔ لیکن اس کی نوجوان لڑکی فاخراں اداس ایک ٹرنک پر بیٹھ گئی تھی۔ شاکراں اسی لئے خوش تھی کہ اس کرائے کے بوسیدہ اور پر ہول مکان میں زندگی گھسیٹتے گزارتے اٹھارہ سال بیت چکے تھے۔ اور اب اس اٹھارہ سالی تک ایک ایک پیسہ جوڑ کر گویا اپنے ذاتی مکان کے لئے ایک ایک اینٹ جمع کی تھی۔ جو اب انبالہ چھاؤنی کے سب سے زیادہ پُر رونق بازار لال کرتی میں مکمل طور پر تعمیر ہو چکا تھا۔ اور آج شام ہونے سے پہلے پہلے بابو دین محمد، اس کی زوجہ اور اس کی لڑکی منتقل ہونے والے تھے۔

فاخراں کو اس طرح اداس اور چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر ماں نے کہا، بیٹی تو تھک گئی ہیں ۔ ذرا چھوٹا موٹا سامان تو باندھ دے۔ تیرے ابا ابھی دفتر سے آتے ہی ہوں گے اور کیا معلوم وہ تانگے بھی لے کر آجائیں اور یہیں سامان تیار ہی نہ ہو — ہمیں تو شام سے پہلے پہلے اپنے نئے گھر میں پہنچنا ہے۔ اسے سجانا سنوارنا ہے۔ پھر اندھیرا ہو جائے گا تو . . . اونہہ اندھیرا ہو جائے گا تو کیا ہوگا۔ وہاں تو بجلی کی روشنی بھی ہے۔ یہاں کی طرح مٹی کے تیل کے چراغ تھوڑے ہی ہیں ۔ آج جانے کیوں میری عقل ماری گئی ہے . . . وہاں تو رات میں بھی سامان جمایا جا سکتا ہے۔

شاکراں کو نئے اور ذاتی مکان میں جانے اور بسنے کے خیال ہی سے بڑی خوشی ہو رہی تھی ۔ بے حد خوشی، بے اندازہ خوشی، اور اس خوشی میں وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی، خود ہی سوال پوچھتی اور خود ہی جواب دیتی — اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ فاخراں کیوں اداس بیٹھی ہے اور اس کو فاخراں کی اداسی کا راز آخر کس طرح معلوم ہو سکتا تھا بیٹی اپنی محبت کا راز ماں باپ یا بھائی یا کسی اور کو کیسے بتا سکتی ہے — یا وہ اپنی ماں سے کیسے کہہ دے کہ اسے اپنے نئے اور ذاتی مکان میں جانے کی خوشی کے بجائے اس کرایہ کے مکان کو چھوڑنے کا بے حد دکھ، ناقابلِ بیان دکھ ہے ۔ کیونکہ یہ مکان کرایہ کا سہی، بوسیدہ سہی مگر اس کے داہنے کمرے کی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جو سامنے والے مکان کی کھڑکی کے روبرو ہے۔ جس میں سے سردار محمد کا چہرہ جھانکا کرتا ہے۔ سردار محمد جو ایک لمبا تڑنگا، خوبصورت، لمبے بکھرے بالوں والا نوجوان تھا جو پانچویں پنجاب رجمنٹ میں حوالدار تھا اور جس کو چھپے چوری فاخراں نے اپنا دل بھی دے دیا تھا — ... کسی کو معلوم نہ تھا۔ اور کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ دل تو ہمیشہ چوری چھپے ہی دیا جاتا ہے

فاخراں ٹرنک، رضائیاں، برتن، کپڑے اٹھاتے اٹھاتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کھڑکی سے بھی ضرور جھانک آتی جس کے مقابل سردار محمد کی کھڑکی پر ساگوان کے میلے کھردرے تختے بند تھے سردار محمد بھی ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ اور اس کی کھڑکی بھی شام کو پانچ بجے کے بعد کھلا کرتی تھی۔ کاش سردار محمد ڈیوٹی سے آج جلد لوٹ آئے تاکہ اس کی فاخراں آنکھوں میں آنسو بھر کر اسے آخری بار دیکھ سکے۔ پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جائیں یا پھر وہ کھڑکی کو بند کر دے۔

مکان کے باہر تین تانگے کھڑکھڑاتے ہوئے رُکے۔ بابو دین محمد گھر میں داخل ہوا۔ اور اس نے سامان کو ابھی تک تیار نہ دیکھ کر اپنی زوجہ کو خوب ڈانٹا۔ اس کی زوجہ نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ بڑے گرم ہو۔؟"

دین محمد نے اور زیادہ برافروختہ ہو کر کہا۔

"بکواس بند کرو اور چلو جلدی کرو۔"

اور دین محمد نے اس کی مدد کرنے کے بجائے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگایا۔ اور باندھے ہوئے بستر پر بیٹھ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

شاکراں نے کہا۔

"اس طرح بیٹھے رہنے کے بجائے کچھ میرا ہاتھ تو بٹاؤ"

دین محمد غصے سے بے قابو ہو کر بولا۔

"اب چپ بھی کرے گی یا نہیں ـــــ یا اللہ یہ کیا عذاب ہے۔

نہ دفتر میں چین نہ گھر پر چین۔ ہر جگہ تو تو میں میں....

شاکراں اس کو حیران نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ دین محمد بڑا خاموش، بڑا ضبط کرنے والا، بڑا صابر و شاکر آدمی تھا۔ شادی کے اٹھارہ سال گزر چکے تھے۔ لیکن دونوں میں شاید پندرہ بیس بار لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اور وہ بھی معمولی قسم کی لڑائیاں ..... ایک ایک دو دو دن بات بند۔ پھر ایک رات اور ایک ہی چارپائی ـــــ اور پھر لڑائی کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوتی۔ مگر آج تو بغیر کسی وجہ کے اتنا غصہ۔ اتنا جلال ...... شاکراں کے نسائی غرور پر۔ یہ بلا وجہ کا غصہ ایک ناقابل برداشت ٹھیس ضرور تھی۔ اور عورت تو فوراً ہی روٹھ جانے اور بڑی دیر بعد من جانے کی عادی ہوتی ہے۔ لیکن شاکراں نے روٹھنے کے خیال ہی کو دل سے نکال دیا۔ کیونکہ آج نئے اور ذاتی مکان میں جانا تھا۔ وہ نیا اور ذاتی مکان جس کی اینٹیں اکٹھی کرنے کے لئے شاکراں نے گھر کے دوسرے اخراجات کم کر کے ایک ایک پیسہ بچا کر اٹھارہ سال تک پیہم تکلیفیں اٹھائی تھیں ـــــ محبت، مرد یا شادی کے علاوہ عورت ایک گھر پر بھی جان دیتی ہے۔ گھر جو اس کا اپنا ہو، ذاتی ہو، جہاں وہ مالکن بن کر بیٹھی رہے۔

شاکراں نے دین محمد کے غصے کو ہمیشہ کی طرح کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور اپنے کام میں لگی رہی۔ مگر اسے ہلکا سا شک تھا کہ یہ اس کے شوہر کو کیا ہو گیا ہے کہ نئے مکان میں جاتے وقت کچھ ناراض سا ہے

اور یہ کتنی بدشگونی ہے۔ حالانکہ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ نئے مکان میں اسباب جانے، اور سجانے کے بعد رات گئے جب وہ تھک کر اپنے شوہر سے جسم ملا کر لیٹے گی تو اس تھکن کے باوجود بڑی دیر تک اسے نیند نہ آئے گی۔ وہ اس کے ساتھ لیٹے لیٹے باتیں کرتی رہے گی کیونکہ کرائے کے مکان میں شوہر کے ساتھ لیٹنے میں اسے اتنا مزا نہیں آتا جیسے وہ خود بھی کوئی کرائے کی ....

دو تانگوں میں سامان لادا گیا اور تیسرے تانگے میں چھوٹے موٹے سامان کے ساتھ بابو دین محمد بیٹھ گیا۔ فاخراں نے آخری بار سردار محمد کی کھڑکی کے بند پٹوں کو دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن آنکھوں کے آنسوؤں سے بھر جانے سے پہلے ہی اس نے اپنی کھڑکی بند کر دی۔

محبت کی کھڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر کے وہ نئے مکان کی طرف چلی۔ لیکن شاکراں سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے!

اس کی آنکھوں میں آنسو!

یہ کیا بدشگونی ہے آخر!!

نئے مکان میں قدم رکھ کر جب دین محمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی موج بہہ نکلی اور فاخراں کی بڑی بڑی اور چمکیلی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ دکھائی دیا تو شاکراں نے محسوس کیا کہ یہ بدشگونی تو صرف اس کے اپنے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا فاخراں کے آنسو یا بابو دین محمد کے غصے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور سچ بابو دین محمد کے غصے کا شاکراں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ جب دفتر میں بابو دین محمد نے اپنے ساتھی کلرکوں سے یہ کہا تھا۔ کہ وہ آج اپنے نئے اور ذاتی مکان میں منتقل ہو رہا ہے۔ تو ڈسپیچ کلرک کرتار سنگھ نے بابو دین محمد کے عہدے کے خیال کو پس پشت ڈال کر اور اپنی ذاتی بے تکلفی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر یہ چوٹ کی تھی کہ،

"بابو صاحب۔ اپنے نئے مکان کا نام رکھو۔

"رشوت محل"

سب لوگ ہنس پڑے تھے اور بابو دین محمدؐ نے غصّے میں آکر اور یہ سب بھول کر کہ وہ ہیڈ کلرک ہے اور کرتار سنگھ ایک ڈسپاچ کلرک ——— کرتار سنگھ کی گردن پکڑ لی۔ مگر کرتار سنگھ جو بابو دین محمد کے نئے تعمیر شدہ مکان کو دیکھ کر احساسِ کمتری کے باعث اس سے حسد کرنے لگا تھا جھگڑنے پر تیار ہو گیا اور بیچ بچاؤ کرنے والے کلرکوں سے کہنے لگا۔

"بس ——— ہاں میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ رشوت محل ہے۔ ورنہ جی ڈسٹرکٹ کمشنر آفس کا ایک ہیڈ کلرک گیارہ ہزار روپے کی کوٹھی بنا سکتا ہے ———

واہ!"

دوسرے سب کلرک اور ساری دنیا یہی سمجھتی ہو کہ بابو دین محمدؐ نے رشوت لے کر یہ مکان تعمیر کیا ہو لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ اس کی کفایت شعار زوجہ نے ایک ذاتی مکان کے لیے جائز تنخواہ سے تھوڑے تھوڑے روپے متواتر اٹھارہ سال سے جمع کئے تھے۔ میکے سے ملے ہوئے زیوروں کو بھی اس نے مکان ہی کے لیے محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے پانچ چھ سال سے اپنے لئے نئے کپڑے بھی نہیں بنوائے تھے۔ چار پانچ شلواریں، چار پانچ قمیضیں اور صرف دو دوپٹے . . . . . اگر کبھی کبھار اس نے کچھ کپڑا اور زیور خریدا بھی تو اپنی جوان لڑکی کے لئے ———

مگر اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے اس دنیا میں ایک اچھا اور ذاتی مکان چھوڑ جائے۔

مکان بن چکا تھا۔ کرتار سنگھ اور کرتار سنگھ جیسے لوگوں کی فضول خرچ بیویاں اور کرائے کے مکانوں میں رہنے والے سب انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔

رشوت محل

رشوت محل

"بکنے دو کمینوں کو ـــ اپنی آگ میں آپ ہی جل مریں گے"

بابو دین محمدؐ چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو ـــ شاکراں ضرور دل سے یہی چاہتی تھی کہ جب اس کا مکان بن جائے ـــ اور وہ اس میں مالکن کی طرح بیٹھی تو اس کی سہیلیاں سلنے جلنے والیاں اور اڑوس پڑوس کے لوگ اس کے مکان کو دیکھ دیکھ کر جلا کریں۔ کڑھا کریں ———

شاکراں آخر ایک عورت تھی نا ـــ اسے اپنے سات کمروں، دو دالانوں، ایک باورچی خانے، ایک حمام، بڑے کھلے صحن والے مکان کی ملکیت اور ہر کمرے میں جلنے والے بجلی کے بلب اور دوسری آرائشوں کا خیال آنے سے پہلے عام لوگوں کا خیال آتا تھا کہ وہ اس کے مکان کی طرف حسد سے نظریں اٹھا کر دیکھیں گے کہ اسے دیکھو۔ یہ شاکراں کا ذاتی مکان ہے۔ جیسے شاکراں نے اپنی رہائش اور اپنے آرام و آسائش کے لئے یہ مکان تعمیر نہ کرایا ہو۔ بلکہ لوگوں کے دیکھنے کے لئے تعمیر کروایا ہو۔ جبھی تو وہ اپنے نئے مکان میں اپنے سارے رشتہ داروں، سہیلیوں، اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کو ایک بہت بڑی دعوت دینے کا پروگرام بھی بنا چکی تھی۔

بابو دین محمدؐ نے مکان کی بالائی بالکونی کی پیشانی پر پتھر کے ایک کتبے پر مکان کا نام بھی کندہ کرایا تھا۔

فاخراں منزل

۱۹۲۶ء

لیکن کرتار سنگھ اور اس جیسے بدطینت اور حاسد لوگ اس مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے شرارتاً گنگنایا کرتے تھے

اخوہم ـ اوغ غوم . . . . . . رشوت محل!

نئے مکان میں کھڑکیاں تو بہت تھیں۔ بڑی بڑی، رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکیاں مگر کوئی کھڑکی ایسی نہیں تھی جو رجمنٹ بازار کے اس مکان کے روبرو کھلتی ہو جس میں سے سردار محمد جھانکا کرتا تھا۔ اسی لئے فاخرہ بڑی اداس رہتی تھی چپ چاپ اور خاموش . . . . شاکراں سوچتی ہوئی نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا کرتی اور حیران تھی کہ اپنے نئے اور ذاتی مکان میں آنے کی بھی اس لڑکی کو کوئی خوشی نہیں۔ جب دیکھو چپ چپ جب دیکھو اداس ——— حالانکہ کنواری لڑکی تو ——— .

شاکراں نے بڑی سوچ بچار کے بعد صرف یہی نتیجہ نکالا کہ فاخراں کی عمر اب سولہ سال ہو گئی ہے۔ اور جب لڑکی کی عمر سولہ سال کی ہو جائے تو بس . . . . . .

ایک رات عام راتوں کی طرح اس نے بابو دین محمدؐ سے یہ ذکر چھیڑ

ہی دیا کہ فاخراں اب سولہویں برس میں ہے۔ اب ہمارا کیا ہے۔ ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ جانے کب آنکھ بند ہو۔ اس لئے میری آخری خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد اپنی بیٹی کی زلفوں میں راش چھڑک کر مانگ میں افشاں چن کر اس کی ہتھیلیوں اور تلووں کو مہندی سے رنگ کر، اس کو پھولوں میں چھپا کر، خوشبوؤں میں بسا کر اس کے سر پر سرخ آنچل اوڑھا کر اسے دلہن بنا دیکھ دوں ——— پھر اس کے بعد موت بھی آجائے تو فکر نہیں۔

شہر کے بوڑھوں اور بوڑھیوں سے بات چیت شروع ہوگئی۔ بات چیت ہوتی رہی۔ بات چیت ختم ہوگئی۔ اور باجوں ڈھولوں تاشوں اور نفیریوں کا شور شروع ہوگیا۔ بادام مصری چھوہارے برسائے گئے اور سہرا گو شاعر لوگوں کے ہجوم میں سہرا پڑھنے لگا

دیتے ہیں شبیر محمد کو مبارک پیہم
گا رہے ہیں جو گلستاں میں عنادل سہرا

شبیر محمد!

سردار محمد نہیں شبیر محمد۔

رجمنٹ بازار والا سردار محمد نہیں۔ بلکہ اسٹاف روڈ والا۔

شبیر محمد۔

فاخراں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاکراں اس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے دلاسہ دینے لگی۔ بیٹی۔ نہ رو میری بچی۔ تو کہیں اور گھر تھوڑے ہی جا رہی ہے۔ تو تو یہیں رہے گی میری بچی۔ اسی گھر میں۔ تو اور تیرا شوہر دونوں یہیں رہیں گے۔ یہ گھر اب تم دونوں کا ہے بیٹی۔

فاخراں روتی رہی۔ ان گنت بے زبان لڑکیوں کے اس وسیع و عریض ملک کے ایک اور گھر میں ایک اور لڑکی اس کے گھر میں سردار محمد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپا کر شبیر محمد کے آگے بے نقاب ہوگئی۔

شادی خانہ آبادی کی مبارکبادی دینے کے لئے بہت سے لوگ آئے تھے۔ مگر سردار محمد نہیں آیا۔ اور وہ کیسے آسکتا تھا۔ فاخراں اسے اپنے دل میں سے باہر نکلنے بھی تو دے!

——— (۲) ———

نئے مکان میں آکر بابو دین محمد اور اس کی زوجہ کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ دونوں ہر لمحہ یہ محسوس کرتے تھے جیسے ان کی زندگی اصلی معنوں میں ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف فرصت ہی فرصت ہے موت کے دروازے پر پہنچنے تک کوئی کام ہی نہیں۔ کوئی مشغلہ نہیں سارے کام ختم ہو چکے تھے۔ گھر بن چکا تھا۔ شادی خانہ آبادی ہو چکی تھی۔ گھر داماد بھی مل گیا تھا۔

دن سپاٹ گزر رہے تھے۔ لمبے دن اور لمبی راتیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سورج دیر سے ڈوبتا ہے۔ اور دیر سے طلوع ہوتا ہے۔ بابو دین محمد کا خیال تھا کہ اب وہ پنشن لے لے۔ پچپن برس کی عمر میں بھلا روز روز کہاں دفتر گھسٹتا پھرے۔ اور پھر شبیر محمد بڑا کماؤ لڑکا تھا۔ سیٹھ پریم ناتھ جی اینڈ سنز پروپرائیٹر پنجاب موٹر ورکس میں منیجر تھا۔ ماہانہ ڈھائی سو روپے تنخواہ تھی۔ اور بزنس کے لئے دور دور شہروں دہلی، کلکتہ، مدراس، بمبئی وغیرہ گھوما کرتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ اپنی فاخراں کو بھی بڑے بڑے شہروں کی سیر کراتا تھا مگر اب کے وہ کلکتہ گیا تو فاخراں کو کسی وجہ سے ساتھ نہ لے جا سکا۔ وہ کلکتہ گیا اور خلاف توقع پانچویں دن ہی لوٹ آیا۔ اور شاکراں سے بولا۔

اماں جی ——— اچھا ہی ہوا کہ میں فاخراں کو ساتھ نہ لے جا سکا۔ شہر میں فساد ہو گیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی بڑی زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ میں مانک ٹولہ سٹریٹ پر ٹھہرا تھا۔ مگر وہاں بھی فساد شروع ہوگیا۔ واپس اسٹیشن بھاگتے وقت میں نے خود اپنی آنکھوں سے فٹ پاتھ پر تین لاشیں پڑی دیکھیں۔ ۔ ۔ ۔

اور ——— اور میں بھی بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔"

شبیر محمد کلکتہ سے تو جان بچا کر واپس آگیا۔ لیکن مانک ٹولہ سٹریٹ جیسے اس کے تعاقب میں چپ چاپ چلی آرہی تھی۔ کلکتہ سے باہر نکل آئی تھی۔ انسانی لہو میں نہائی ہوئی اپنی پیٹھ پر لاشوں کو لادے ہوئے

عصمتوں کے انبار اُٹھائے نواکھالی پہنچی، نواکھالی سے بہار آئی اور بہار کی بھری پُری آبادیوں کو ڈستی نگلتی دہلی پہنچی۔ دہلی جہاں سے انبالہ اتنا قریب ہے کہ فرانٹیر میل رات کو نو بجے چل کر صبح چار بجے وہاں پہنچ جاتی ہے۔

اور صبح کے چار بجے انبالہ میں بھی دہشت، ہنگامہ اور بھاگ دوڑ مچ گئی۔ نانک ٹولہ سٹریٹ کلکتہ سے نکل کر انبالہ بھی پہنچ گئی تھی۔ کوتوالی بازار، قاضی واڑہ اور تندوروں والے بازار میں گھومتی پھرتی۔ اُدھر چھاؤنی میں درگا چرن روڈ سے لال کرتی بازار کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں فاخرہ منزل میں شیر محمد گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنی ساس اور فاخرہ سے کہہ رہا تھا۔

"ہمیں جلد ہی یہ مکان چھوڑ دینا چاہیئے۔ سب مسلمان پاکستان بھاگ رہے ہیں۔ ہم بھی یہاں نہیں رہ سکتے چلو۔ سامان اٹھاؤ۔"

بوڑھی ساس دیوانی عورت کی طرح شیر محمد کو گھور رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔

نہیں ہرگز نہیں —— یہ مکان میرا ہے اٹھارہ سال تک اس کی ایک ایک اینٹ جوڑ کر میں نے یہ مکان بنایا ہے میں نہیں جاؤں گی —— تم جاؤ۔ مگر۔ . . مگر تم کیسے جا سکتے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے —— رسول اللہ کی قسم میں اپنی بیٹی کو تو نہ جانے دوں گی۔ تم جاؤ —— تم مُنہ کالا کرو۔

شیر محمد پریشان ہو گیا تھا۔

اماں جی —— میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں وقت گزر جائے گا۔ تو پھر جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے

اتنے میں بابو دین محمد بھی ہانپتا کانپتا پریشان گھر پہنچا۔ اور گھبرائے ہوئے، سہمے ہوئے لہجے میں بولنے لگا۔

چلو جلدی جلدی اسباب باندھو۔ صرف ضرورت کی چیزیں ساتھ رکھو۔ باقی سب یہیں چھوڑ دو —— چلو جلدی کرو۔"

شاکراں جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ پھر چیخنے لگی۔

چپ رہو۔ تمہاری عقل بھی ماری گئی ہے کیا۔ ایں یہ مکان نہیں چھوڑوں گی —— اٹھارہ سال تک اس مکان کی ایک ایک اینٹ جمع کی ہے۔ تم جاؤ میں یہ مکان ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔ یہ میرا مکان ہے۔ یہ میرا مکان ہے!!"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی، بابو دین محمد نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ کرتار سنگھ دروازے پر کھڑا تھا۔ شراب کے نشے میں دُھت بابو دین محمد کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ مگر اچانک سنجیدہ ہو کر اس نے کہا:۔

بابو شاب۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں مارنے نہیں آیا ہوں ہی ہی ہک . . . . . ہاں وہ جوگندر سنگھ اور موہن لال تمہیں مارنا چاہتے ہیں —— میں پالا دوشت ہوں نا تمہارا بھائی . . . . . ہی ہک . . . . . اشی لئے تمہارے پاش آیا ہوں —— ہو شکے تو کشی طرح بھاگ جاؤ —— ہور . . . . . ہی ہک . . . . . میرا کہا شنا شوب معاف کر دینا . . . . . ہی۔

بابو دین محمد نے سڑک کو گہرے اندھیرے میں ڈوبا دیکھ کر بھرائی آواز میں پوچھا۔

کدھر جاؤں کرتار —— کدھر جاؤں یار؟

کرتار سنگھ نشے میں جھوم جھوم کر ہنسنے لگا۔

"اُدھر۔ تمہارے پاکستان کو جاؤ بابو شاب۔ ہی ہی ہی . . . . . وہ بھی تو رشوت کل ہے بابو شاب ہی ہی ہی ہک . . . . . "

بابو دین محمد پاکستان کی یہ بے عزتی کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس نے پاکستان کے لئے کئی بار حسب حیثیت چھوٹے موٹے چندے دئے تھے۔ اس کے لئے نمازیں پڑھی تھیں۔ دعائیں مانگی

تھیں۔ لیکن اس وقت چونکہ کرتار سنگھ نشے میں تھا اور اس کی بغل میں کرپان تھی۔ اور مانک ٹولہ اسٹریٹ لال کرتی بازار میں داخل ہو رہی تھی۔ اس لئے بابو دین محمد چپ چاپ اندر چلا آیا۔

—— (۳) ——

بابو دین محمد اور اس کا کنبہ محبت کی کھڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر کے نئے وطن کی طرف چلا۔ ریلوے اسٹیشن پر پاکستان سپیشل تیار کھڑی تھی۔ اور ادھر ایک غریب ہیڈ کلرک کی اٹھارہ سالہ مصیبتوں کی بنائی ہوئی دنیا لال کرتی بازار میں جل رہی تھی شعلے اڑا رہی تھی اور انیٹیں گرا رہی تھی۔ اور اوپر فضا میں ہوائی جہاز اڑ رہے تھے۔ دلی سے لاہور اور کراچی جانے والے ہوائی جہاز، لیاقت علی خاں کا ہوائی جہاز، غلام محمد کا ہوائی جہاز۔ چودھری خلیق الزماں کا ہوائی جہاز

. . . .

اور نیچے زمین پر پاکستان سپیشل انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم سے رینگتی ہوئی نکل رہی تھی۔ پاکستان سپیشل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے، بوریاں، بستر، صندوقیں، بالٹیاں، حقے —— آدمی پہ آدمی سوار تھے حبس، گھٹن، پسینہ اور سانسوں کا تعفن موت کا خوف، جینے کی خواہش —— فضا میں گولیوں کی سنسناہٹ، گرتے ہوئے مکانوں کے دھماکے مرتے ہوئے انسانوں کی چیخیں —— یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پاکستان سپیشل موت کے پل پر سے گزر رہی ہے۔

چار میل آگے سے ریاست پٹیالہ کی سرحد شروع ہوئی۔ چار میل آگے سے موت کی سرحد شروع ہوئی۔ پٹیالہ کے میدانوں میں جیپ کاریں اور ملٹری کے ٹرک دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے تلواروں اور کرپانوں کی تیز زبانیں جھانک رہی تھیں۔ بھری پُری آبادیوں میں موت کی گولیاں بکھیرتی، لہلہاتی کھیتوں کو روندتی، موت کا راگ گاتی شور مچاتی جیپ کاریں سرہند کے سٹیشن کی طرف بڑھ رہی تھیں جہاں پاکستان سپیشل ریاست پٹیالہ کے مہاجرین کے لئے کچھ دیر رکنے والی تھی۔

حبس، گھٹن اور گرمی سے نازک بدن فخر جہاں کا حلق سوکھ گیا تھا۔ زبان پر کانٹے اُگ آئے تھے۔ اور سرخ سرخ ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دھیمی دھیمی آواز میں پکار رہی تھی۔ پانی —— پانی۔

پانی کہاں تھا —— ہندوستان اور پاکستان کی سرزمینوں پہ پانی کی ساری ندیاں اور دریا اور چشمے سوکھ گئے تھے۔ صرف لہو کی ندیاں اور لہو کے دریا بہہ رہے تھے۔ صرف لہو کے چشمے ابل رہے تھے۔

سرہند کا سٹیشن آگیا۔ شیر محمد بالٹی لے کر اترنے لگا۔ لوگ منع کرنے لگے۔

"گاڑی سے مت اترو۔ آرڈر نہیں ہے"

"آرڈر کی ایسی تیسی۔ میں ضرور اتروں گا"۔

"پانی —— پانی!!"

"مت اترو"

"میں ضرور اتروں گا"

شیر محمد گاڑی سے اتر گیا۔ ٹھائیں سے ایک گولی چلی۔ شیر محمد زندگی کی گاڑی سے بھی اتر گیا۔ شیر محمد پلیٹ فارم پہ لوٹنے لگا اور پکارنے لگا۔

پانی —— پانی!

اسٹین گن کی گولی جیسے ہی جسم میں داخل ہوتی ہے۔ پیاس اچانک اور بے تحاشا بڑھ جاتی ہے۔ شیر محمد کا تھوڑا سا خون بالٹی میں گرا ہوا تھا۔ شیر محمد پاکستان سپیشل کے پائیدان کی طرف رینگنے لگا مگر پاکستان سپیشل بھی رینگ رہی تھی۔ شیر محمد کو سرہند کے سٹیشن پہ اتار کر موت کے اسٹیشن پر چھوڑ کر روانہ ہوگئی۔

بابو دین محمد پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

شیر محمد!

شیرے!!

ہو شیرے!!!

ایک آدمی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

بیٹھ جا بھائی۔ اب کسے پکارتا ہے؟ جو نظروں سے

ادجھل ہو گیا ہے وہ تیری آواز نہیں سن سکتا - اب وہ کوئی جواب نہیں دے سکتا - بیچارا"

چلتی گاڑی میں اچانک بیوگی داخل ہوئی اور فاخراں پر حملہ آور ہوئی - فاخراں کے بال نوچ ڈالے چھاتیوں پر سے اس کی قمیض پھاڑ دی - اس کے گالوں پر، پیشانی پر اور چھاتیوں پر ناخن گاڑنے اور تھپڑ لگانے شروع کر دیئے - کسی نے بھی بیچ بچاؤ نہیں کیا - فاخراں کا باپ اور فاخراں کی ماں نے بھی نہیں - حتیٰ کہ بیوگی نے فاخراں کو پچھاڑ کر بیہوش کر دیا -

جالندھر سٹیشن آیا -

شیر محمد پاکستان سپیشل میں نہیں تھا

امرتسر سٹیشن آیا -

شیر محمد سرہند کے سٹیشن پہ اترا تھا -

لاہور سٹیشن آیا -

شیر محمد تو موت کے سٹیشن پہ ہی رہ گیا تھا -

—— (۴) ——

لاہور والٹن کیمپ میں دو ہفتے رہنے کے بعد بابو دین محمد کو محلہ سنت نگر میں کسی بھاگے ہوئے یا مقتول نریندر سنگھ کے خالی مکان پر قبضہ ملا - بابو دین محمد تین تانگے نہیں صرف ایک ہی تانگہ لایا - اب اتنا اسباب ہی کہاں تھا ؟ اور معرور یا مقتول نریندر سنگھ نے بھاگتے وقت اپنی بیوی سے یہی تو کہا ہوگا کہ چلو جلدی کرو - فوراً اسباب باندھو - یہ سب نہیں صرف ضرورت کی چیزیں ساتھ رکھو - باقی سب یہیں چھوڑ دو چلو جلدی کرو . . . . . .

جب بابو دین محمد - اس کی زوجہ، فاخراں اور بیوگی چاروں اس مکان میں داخل ہوئے - تو اس گھر میں کوئی انسان نہیں تھا - باقی سب کچھ تھا - جیسے الف لیلے کے جنگلوں کا پُر اسرار مکان جس میں کہانیوں کا ہیرو - بھوک اور پیاس کا مارا - تھکا ہارا اندر گھس پڑا ہو اور اس کے لئے مکان بالکل سج سجایا ہو - کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چنے ہوئے ہوں مگر نہ کوئی آدمی ہو - اور نہ آدم زاد -

بابو دین محمد سمجھ رہا تھا کہ چلو اس کی بیوی اور اس کی بیٹی یہ مکان پاکر خوش ہو جائیں گی - اپنے ذاتی مکان کے چھوٹ جانے کا غم معدوم ہو جائے گا لیکن شاکراں نے جیسے مکان دیکھا ہی نہ ہو - مکان میں داخل ہونے کے بعد بھی اور شاید نریندر سنگھ کی بیوی کی چارپائی پر لیٹ کر بھی وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں اکیلی [illegible] محسوس کر رہی تھی - منحوس عورت . . . . . . جیسے وہ ابھی پاکستان پہنچی ہی نہ ہو -

اور فاخراں سوچ رہی تھی کہ یہ دوسرا نیا مکان —— ! ان نئے مکانوں کے مقابلے میں انبالہ چھاؤنی کے رجمنٹ بازار والا پرانا بوسیدہ اور کرائے کا مکان گویا جنت تھا جنت - لیکن یہ نئے مکان —— !!

پہلے نئے مکان میں داخل ہوتے وقت اس کا محبوب بچھڑ گیا تھا اور اس کا دل اُجڑ گیا تھا - دوسرے نئے مکان میں داخل ہوتے وقت اس کا شوہر بچھڑ گیا تھا - اور اس کا جسم اُجڑ گیا تھا - فاخراں رو رہی تھی - فاخراں عورت تھی نا - اسی لئے وہ ان مکانوں کو منحوس سمجھ رہی تھی وہ بیچاری کیا جانے کہ یہ مکان منحوس نہیں بلکہ نحوست کے ذمہ دار وہ بڑھے لوگ ہیں وہ رہنما ہیں - جنہوں نے ان مکانوں میں آگ لگائی ہے - جنہوں نے ان مکانوں سے انسان اور انسانیت کو بے آبرو کر کے لوٹ کھسوٹ کر نکال کر، بیوگی، یتیمی، رنڈاپا اور موت کو آباد کیا ہے

—— (۵) ——

دوسرے نئے مکان میں اوپر نیچے سات کمرے تھے - ایک باورچی خانہ، ایک حمام، اوپر کھلی چھت —— گھر کے ہر کمرے میں ضرورت کا پورا فرنیچر تھا چارپائیاں، کرسیاں، میزیں، ڈریسنگ ٹیبل الماریاں . . . . . ایک وارڈروب میں کچھ زنانی شلواریں، زنانی قمیصیں، ایک لیڈیز گرم کوٹ - دو پتلونیں، ایک کوٹ ——

دیوار پر ایک کیل میں ٹنگی ہوئی چار سرخ چوڑیاں، مینٹل پیس پر رکھا ہوا ایک پیتل کا اونٹ، ایک کھلونا موٹر، ایک ٹی سیٹ اور ایک نوجوان لڑکی کی تصویر جس میں وہ سیاہ گاؤن اوڑھے، ہاتھ میں بی اے یا ایم اے کی ڈگری لپیٹے کھڑی تھی - ایک الماری میں کتابیں بھری پڑی تھیں اور ہر کتاب کے پہلے سادہ صفحے پر "الیشر کور" کے

انگریزی دستخط اور تاریخ ثبت تھی ———— اس تصویر کے اوپر سفید دیوار پر جیسے انگلی کو لہو میں ڈبو کر لکھا تھا۔

پیارے نریندر

تیرے بعد اس دنیا میں میرے لئے کیا رہ گیا ہے میں بھی تیرے پاس آ رہی ہوں۔

صرف تیری "ایشر کور"

فاخراں بڑی دیر سے بلکہ جب سے گھر میں داخل ہوئی تھی صرف یہی خونی تحریر پڑھ رہی تھی۔ جیسے یہ اسی نے لکھی ہو جیسے وہی ایشر کور ہے۔ جیسے کیل پر ٹنگی ہوئی چار دل سُرخ چوڑیاں اس کے سہاگ کی چوڑیاں ہیں۔ یہ سہاگ کی سُرخ سُرخ چوڑیاں جو قومی رہنماؤں نے اس کی نازک اور کومل کلائیوں سے زبردستی اتار لی تھیں۔ تاکہ عورت کی کلائیاں ننگی ہو جائیں اور ملک آزاد ہوں۔ تاکہ انسان مر جائے اور حکومت قائم ہو جائے۔

بیوگی، آتشک، یتیمی، اجڑی گودیوں، سر بریدہ بچوں، پستان دریدہ ماؤں، بے حیا بہنوں، بے غیرت شوہروں، بے شرم بابوں اور جلے ہوئے مسمار مکانوں کو اپنی اپنی پیٹھ پر ڈھو کر یہ ہندوستان اور یہ پاکستان آزاد ہو چکے تھے۔ سامراج کی غلامی سے آزاد ہوئے تھے۔ یا سامراج کی غلامی کے لئے آزاد ہوئے تھے۔

قومی رہنما ریڈیو پر تقریریں کر رہے تھے۔ قومی فوجوں کی سلامیاں لے رہے تھے۔ حکومت کی کرسیوں پر بیٹھے دربار کر رہے تھے۔ انگریزی اور امریکی فلم ساز کمپنیاں ان کے لئے نیوز ریل بنا رہی تھیں۔ ریگل، پلازا، ڈریم لینڈ۔ اوڈین کے پردہ سیمیں پر پنڈت نہرو لال قلعے پر جھنڈا لہرا رہے تھے۔ لیاقت علی خاں پاکستان کی بحری افواج کی سلامی لے رہے تھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرلی کے عہدے کا حلف اٹھا رہے ہیں۔

لیکن پردۂ سیمیں پر وہ مناظر کہیں نہیں تھے جن میں بے آبرو ہو کر ننگی بھاگتی ہوئی ایشر کور کا سبز دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ فاخرہ منزل جل رہی تھی شبیر محمد پلیٹ فارم پر تڑپ رہا تھا۔ پاکستان پارلیمنٹ اور ہندوستان پارلیمنٹ کے اجلاس کی کارروائیاں اور بڑے بڑے رہنماؤں کے مجسمے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر فاخرہ منزل کے شعلے اور ایشر کور کی لہو میں ڈوبی ہوئی انگلی سے لکھے ہوئے حروف کیمرے کی نظر سے رہنماؤں کی نظر سے۔ دنیا کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اگر کچھ لکھا ہوا تھا تو صرف یہی لکھا ہوا باقی تھا۔

ہندوستان زندہ باد

پاکستان زندہ باد

ہندوستان زندہ تھا اور لاکھوں ہندوستانی مر چکے تھے۔ پاکستان زندہ تھا۔ اور لاکھوں پاکستانی اپنی آنکھوں سے پاکستان کو دیکھ سکتے تھے جنہوں نے پاکستان کے لئے حسب حیثیت چندے دئے تھے۔ لہو دیا تھا، نمازیں پڑھی تھیں۔ دعائیں مانگی تھیں۔ اپنی عورتوں کی عصمت دی تھی۔ اپنی عورتوں کا سہاگ دیا تھا۔ برسوں سے اکٹھی کی ہوئی مکان کی اینٹیں دی تھیں۔ دودھ بھری چھاتیاں کاٹ کاٹ کر دی تھیں۔ اور جو اپنی آنکھوں سے پاکستان کو دیکھ رہے تھے وہ پاکستان کو نہیں بلکہ شبیر محمد کو ڈھونڈ رہے تھے۔ سہاگ کو ڈھونڈ رہے تھے سر چھپانے کے لئے مکان ڈھونڈ رہے تھے۔ ننگی چھاتیاں چھپانے کے لئے دوپٹے ڈھونڈ رہے تھے۔ روٹی ڈھونڈ رہے تھے۔ پانی ڈھونڈ رہے تھے۔ پیسہ ڈھونڈ رہے تھے۔ زندگی ڈھونڈ رہے تھے۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے بابو دین محمد کو بڑے ڈاک خانہ میں ڈاکیہ کی نوکری مل گئی۔ پینتیس سال تک ڈسٹرکٹ کمشنر آفس میں ہیڈ کلرکی کرتے کرتے بابو دین محمد کو ترقی ملی تو وہ ڈاکیہ بن گیا۔ اور ڈاکیہ بنتے ہی بابو دین محمد نے پنشن حاصل کرنے کے خیال کو دل سے ایسے ہی نکال دیا تھا۔ جیسے آزادی نے اسے اپنے ذاتی مکان فاخرہ منزل سے باہر نکال دیا تھا۔ بابو دین محمد کی عمر اب پینسٹھ سال کے قریب تھی۔ اور غلامی کا عشق جیسے اس کے لہو کی بوند بوند میں رچا ہوا تھا۔ اسی لئے تو وہ ڈاکیہ بن گیا۔ اور اب پینسٹھ سال کی عمر میں گویا اس کی زندگی از سر نو شروع ہوئی ہو۔ جیسے اسے ایک بار پھر پیسہ پیسہ جوڑ کر اٹھارہ سال کے بعد ایک نیا اور ذاتی مکان تعمیر کرنا ہو۔ جیسے فاخراں کی ایک اور شادی کرنی ہو۔ جیسے ابھی اور پینسٹھ سال تک اسے جینا ہو۔ جیسے زندگی تو ابھی شروع ہوئی ہو

آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے کے بعد، کڑھائی سے نکل کر چولہے میں گرنے کے بعد زندگی دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ

لا متناہی چکر۔ . . . . . .

شاکراں فکر مند نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا کرتی اور رو دیتی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد بھی وہ کوئی حل تلاش نہ کر سکی کہ فاخراں کو اس کی نئی سہیلی بیوگی یا پرانی سہیلی ٹیشر گھر سے کس طرح الگ رکھا جائے۔ آخر کس طرح —— !!

ایک رات عام ماؤں کی طرح اس نے بابو دین محمد سے یہ ذکر چھیڑ ہی دیا کہ خدا کے لئے کچھ کرو۔ مجھ سے میری بیٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ مر جائے گی —— خدا اسے بچاؤ۔ کچھ کرو۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔

ایک دن بابو دین محمد تانگے پر گھر لوٹا۔

ساتھ سردار محمد نہیں تھا۔ ساتھ شیر محمد نہیں تھا بلکہ ساتھ ایک سیکنڈ ہینڈ "سنگر مشین" تھی۔ بابو دین محمد نے اپنی بیوی کے طلائی کنگن اور بیٹی کے زمرد بیں، بندے بیچ کر ایک کباڑیے سے ڈیڑھ سو روپے میں یہ سنگر مشین خریدی تھی۔ تاکہ فاخراں دن بھر مشین چلاتی رہے۔ سینے پرونے کے کاموں میں اپنا دکھ بھلا دے۔ ایک مشین کو دوسری مشین کا سہارا مل جائے۔ کپڑے اور دکھ دونوں سلتے ہیں۔ یہ مشین بھی جیسے بیوہ تھی کیونکہ اس پر سفید سے انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا ——

"سیتا رام ٹیلر ماسٹر"

یہ دونوں بیوائیں!

یہ دونوں مشینیں!!

مشین چلنے لگی۔ محلے کے سارے لوگ بابو دین محمد کے گھر سے واقف ہونے لگے۔ کیونکہ بابو دین محمد گھر گھر کی خیر خبر پہنچانے والا ڈکیہ تھا اور اس کی بیوی اور بیٹی بڑی ملنسار، محلے بھر کی عورتوں کی خدمت گزار ہونے کے علاوہ نہایت سستے داموں پر بچوں اور عورتوں کے کپڑے سی دیا کرتی تھیں۔

لیکن پڑوس کے نواب زادہ عبدالستار کی چرخ بیوی بڑی نخ نخی۔ اس کو نہ فاخراں سے کپڑے سلوانے تھے کی ضرورت تھی پھر بھی وہ فاخراں کے گھر چلی آئی۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ اس مکان میں کتنے کمرے ہیں اور سکھ مالک مکان کا کتنا سامان ہے اور جب اسے پتہ چلا کہ اس گھر میں سات کمرے ہیں۔ اور سکھ مالک مکان کا سارا فرنیچر جوں کا توں موجود ہے۔ ریڈیو سیٹ سے لے کر سنگر مشین تک سبھی کچھ ہے اور بابو دین محمد صرف ایک ڈاکیہ ہے۔ تو سے محکمہ آبادکاری کے سارے افسروں پر غصہ آنے لگا کہ وہ کیسے اندھے ہیں۔ ایک ادنیٰ ڈاکیے کو اتنا بڑا سجا سجایا مکان دے دیا۔ نواب زادہ عبدالستار نے صرف ڈی سی آفس کا گزیٹڈ افسر تھا۔ بلکہ ایک۔ ایم۔ ایل۔ اے کا سگا بھائی اور محکمہ آبادکاری کے ایک بڑے افسر کا ہم زلف بھی تھا۔ اسی لئے ایک رات نواب زادہ عبدالستار کے گھر بڑے بڑے افسروں کی بیویاں دعوت کھانے لگیں اور بڑے لوگوں اور شریف لوگوں کی حق تلفی پر بڑی دیر تک بحث کرتی رہیں۔ کیونکہ پاکستان میں تو پہلے بڑے لوگ اور شریف لوگ ہی داخل ہوئے تھے۔ وہ پاکستان سپیشل میں بیٹھ کر نہیں بلکہ ہوائی جہازوں میں اڑ کر پاکستان میں سب سے پہلے داخل ہوئے تھے اس لئے پاکستان کی ہر چیز پر پہلے انہی کا حق تھا۔

چنانچہ دوسرے ہی دن محکمہ آبادکاری کا ایک نوٹس بابو دین محمد کے دروازے پر لگ گیا کہ تین دن کے اندر مکان خالی کر دو۔ ورنہ تحت قانون فلاں نمبر یہ محکمہ آبادکاری حکومت پاکستان بذریعہ پولیس مکان خالی کرا دیا جائے گا۔"

تین دن تک بابو دین محمد دفتروں اور صاحب لوگوں کی کوٹھیوں کے درمیان بھاگتا رہا۔ مگر وہ ایک ادنیٰ ڈاکیہ تھا۔ یوں ہی بکتا تھا کہ وہ انبالے میں ڈسٹرکٹ کمشنر آفس کا ہیڈ کلرک تھا۔

بھاگو یہاں سے ——— بابو دین محمد بھاگا اور بھاگتا

——— (۶) ———

اور چوتھے دن محکمہ آبادکاری کے ایک انسپکٹر کے ساتھ پولیس کے چار سپاہی بھی اس کے گھر گھس آئے۔ اور شاکراں اور فاخراں بہتے آنسو کے باہر سڑک پر آ گئیں۔ بابو دین محمد نے جب ڈیڑھ سو روپے میں خریدی ہوئی سنگر مشین اٹھانی چاہی تو پولیس کے سپاہی نے اسے ڈانٹا۔

" اے۔ رکھ دے اسے یہ کہاں اٹھائے جا رہا ہے؟"

بابو دین محمد نے کہا۔

" یہ میری ہے صاحب۔ یہ میں نے یہاں آ کر خریدی ہے اپنی بیٹی کی بیوگی کا دکھ دور کرنے کے لئے ڈیڑھ سو

میں خریدی ہے — اپنی بیوی کے کنگن اور بیٹی کے
بندے بیچ کر خریدی ہے۔
محکمہ آبادکاری کے انسپکٹر نے پوچھا۔
"اس کی خریدی کی رسید کہاں ہے؟"
دین محمد نے کہا:۔
رسید! رسید کہاں ہے!! رسید تو نہیں ہے!!!
انسپکٹر نے کہا۔
تو پھر رکھ اسے۔ یہ ہندوؤں سے لوٹی ہوئی مشین
معلوم ہوتی ہے۔
نواب زادہ عبدالستار محکمہ آبادکاری کے افسر کو پانچ سو پچپن کا
سگرٹ آفر کرتے ہوئے بولا۔
اُدر — اُدر جی ایک ڈاکیہ بھلا ڈیڑھ سو روپے
کی مشین خرید سکتا ہے۔ جھوٹ بکتا ہے سالا۔
دین محمد گڑگڑانے لگا۔
خدا کی قسم۔ قرآن مجید کی قسم، رسول اللہ کی قسم۔ یہ میری
ہے۔ میں نے اسے خریدا ہے۔ انسپکٹر صاحب للہ میری
بیٹی کی بیوگی پر رحم کرو۔ اے حوالدار صاحب۔ خدا کے
لئے، رسول کے لئے۔
مملکتِ خداداد کے محکمہ آبادکاری کے انسپکٹر صاحب تانگے پر
بیٹھ گئے۔ اور پولیس کے سپاہی سائیکلوں پر سوار ہو گئے — خدا کی
قسم، رسول اللہ کی قسم ......
دین محمد گڑگڑاتا ہوا پیچھے بھاگ رہا تھا اور رشاگراں اور فاخراں
اس کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔
گول باغ کے پنج راہے پر پہنچ کر رشاگراں اور فاخراں محکمہ آبادکاری
کے اس بورڈ کے پاس تھک کر بیٹھ گئیں جس پہ ایک خانماں برباد مرد
اور عورت کی تصویریں تھیں۔ اور نیچے موٹے حروف میں لکھا تھا۔
"ان کو آباد کرنا آپ کا قومی فرض ہے"۔
اور یہ بورڈ گول باغ کے پنج راہے پر لگا ہوا تھا جہاں ایک سڑک
بھاٹی گیٹ کو جاتی ہے۔ دوسری گورنمنٹ کالج کو جاتی ہے۔ تیسری مال روڈ
کو جاتی ہے۔ چوتھی گوجرانوالے کی طرف جاتی ہے۔ پانچویں لاٹ صاحب کے
دفتر کو جاتی ہے۔ اور چھٹی سڑک ....
بابو دین محمد پاکستان کی تلاش میں شائد چھٹی سڑک پر چلا گیا
تھا۔ کیونکہ اس نے پاکستان کو چندے دئیے تھے۔ اٹھارہ سال سے جمع
کی ہوئی مکان کی اینٹیں دی تھیں۔ بیٹی کا سہاگ دیا تھا۔ ایک سنگر مشین
دی تھی۔ اب اسے پاکستان سے سنگر مشین کی رسید وصول کرنی تھی۔ محکمہ
آبادکاری کے سب سے بڑے افسر سے ملنا تھا۔ کیونکہ گول باغ کے پنج
راہے پر دو بیوہ عورتیں ......
گول باغ کے پنج راہے پر دو بیوہ عورتیں بھیک مانگنے کے جرم
میں دھرلی گئیں۔ اور ایک بیوہ رو رو کر چیخ چیخ کر بابو دین محمد کو پکارنے
لگی — آؤ۔ لوٹ آؤ۔ ہمیں بچاؤ۔ ہمیں چھڑاؤ ...
بیوقوف عورت۔ آزاد ملک میں مملکتِ خداداد پاکستان میں
بھیک مانگنا جرم ہے۔ اور دین محمد — ! وہ تو محکمہ آبادکاری کے
سب سے بڑے افسر کے پاس گیا ہوا ہے۔ اُس کا دفتر بہت دور ہے
چھٹی سڑک کی سب سے آخری منزل پر واقع ہے۔ چیخنا چلانا بیکار
ہے۔ تیری آواز اور کسی کی بھی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی —
صرف چیخنے اور چلانے سے پاکستان کا دروازہ نہیں کھلے گا۔
اور کیا کسی غریب بھکاری کی دستک پر کسی عالیشان محل کا دروازہ
کبھی کھلا ہے اور کبھی کھل سکتا ہے — ؟؟

مہندر ناتھ

صبح، دوپہر، شام

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے۔ کہ جب کبھی میں اُس بازار سے گذرتا ہوں وہ عورت مجھے اس بازار میں چکر کاٹتے ضرور ملتی ہے۔ یوں عورتیں دیکھنا کوئی گناہ نہیں۔ خاص کر خوبصورت عورتیں۔ بھلا عورتیں ہی کیوں۔ مرد بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ اور ذہن میں اچھی اچھی چیزیں ابھرتی ہیں۔ حسین عورتوں کو دیکھ کر خوبصورت چیزوں کا خیال آتا ہے۔ مثلاً ریشمی کپڑے۔ سنہری بال۔ دھان کے کھیت، ناریل کے درخت کے پیچھے ابھرتا ہوا چاند۔ دلآویز مسکراہٹ۔ گنگناتا ہوا آبشار، شرماتی ہوئی آنکھیں۔ نیلا آکاش، پھیلی ہوئی شفق۔ شانوں پر بکھرے ہوئے بال، ہنستا ہوا چہرہ، معصوم نگاہیں۔ چوڑا چکلا سینہ۔ عشق اور ہجر و وصال کی باتیں۔ اور اس طرح مختلف اقسام کی رنگا رنگ کی تصویریں ذہن کے پردے پر ابھر آتی ہیں۔ اور پل بھر کے لئے ذہن کے تاریک گوشوں کو منوّر کر جاتی ہیں۔ لیکن اس عورت کو دیکھ کر مجھے عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل جب میں اسے اس حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ عورت نہیں ہے۔ بلکہ کچھ اور شئے ہے۔ عجیب حسرتناک بھوت لئے ہوئے ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔

ایک دن دوپہر کے وقت مجھے ٹرام کے اڈے پر دکھائی دی تھی۔ میرا اندازہ ہے۔ کہ آپ بھی اس بازار میں سے کئی بار گذرے ہوں گے۔ اور شاید آپ کی نگاہ اس عورت پر پڑی ہو۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ نگاہ نگاہ کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے نہ پڑی ہو بہر حال یہ بازار اس شہر کا سب سے بارونق اور مشہور بازار ہے۔ یہاں بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ فلک بوس عمارتیں ہیں۔ اور بڑے بڑے بیوپاریوں کی نفیس اور آراستہ دوکانیں۔ یہاں دوکاندار اپنی چیزوں کو نمائشی بکسوں میں سجا کر رکھتے ہیں۔ تاکہ گاہک کی نظر ان چیزوں پر پڑے اور وہ خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ میں اس بازار میں صرف اس لئے آتا ہوں۔ کہ ان خوبصورت چیزوں کو دیکھ سکوں۔ میری جیب میں اتنے روپے نہیں ہوتے۔ کہ ان چیزوں کو خرید کر پہن سکوں۔ یا ان چیزوں کو خرید کر گھر کو سجا سکوں۔ صرف دل بہلانے کے لئے ادھر آ جاتا ہوں۔ پل بھر کے لئے ٹھیرتا ہوں اور چھلکتی ہوئی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہوں زندگی میں بہت سی تمنائیں۔ خواہشیں اور آرزوئیں اسی طرح سینے میں دفن ہو جاتی ہیں۔ اور گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ پھر بھی دل بہلانے میں کیا حرج ہے اگر آپ ادھر سے آئیں۔ تو دائیں ہاتھ کی جانب ایک عالی شان عمارت آپ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اس دوکان کے باہر کے حصے میں بڑے بڑے نمائشی بکس لگائے گئے ہیں۔ اور مختلف چیزوں کی بڑے سلیقے سے نمائش کی گئی ہے۔ ایک طرف عورتوں کے پہننے کی چیزیں ہیں اور دوسری طرف مردوں کی۔ میں دونوں کو دیکھ لیتا ہوں۔ ان چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ کم از کم میں تو خریدنے سے رہا۔ باقی رہا آپ کا معاملہ آپ اس دوکان پر جا کر چیزوں کی قیمتیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور اگر بلیک مارکیٹ سے آپ نے روپے کمائے ہیں تو یقیناً آپ ان چیزوں کو خرید سکیں گے

تو ہاں۔ اس دن دھوپ بہت تیز تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور میں بازار میں پیدل جا رہا تھا۔ یوں تو اس بازار میں ٹراموں، بسوں اور کاروں کی گہما گہمی رہتی ہے۔ امیر آدمی کاروں میں سیر کرتے ہیں۔ اور غریب ٹراموں اور بسوں میں۔ اور مجھ ایسے لوگ صرف پیدل چلتے ہیں اس دن مجھے ضروری کام تھا۔ اس لئے تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جلدی جلدی اُن لال پیلے کپڑوں پر نظر پھینکتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ کہ میں ٹرام کے اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں ٹرامیں آ کر رُکتی ہیں۔ اور آرام کرتی ہیں مسافر اترتے ہیں۔ اور چڑھتے ہیں۔ میں پیدل چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ خیال آیا۔ کہ ٹرام میں بیٹھ جاؤں۔ ٹرام میں بیٹھنے لگا تھا۔ کہ میری نگاہ اس عورت پر پڑی۔ میں نے اس عورت کو دیکھا۔ اور

عورت نے میری طرف دیکھا اُسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہُوا۔ کہ میں
اس عورت کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ اس عورت کو دیکھ کر میرے ذہن
میں عجیب قسم کے خیالات آئے۔ وہ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔
مسافر آتے رہے اور جاتے رہے۔ کوئی ٹرام میں بیٹھتا۔ اور کوئی اُترتا
لیکن عورت اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ اور پھر ہجوم میں غائب ہو گئی۔ اس
عورت کی تصویر اگر میں کھینچ دوں۔ تو شاید آپ کے ذہن میں خدوخال
ابھر آئیں۔ اگر عورت خوبصورت ہوتی۔ تو میں اُسے قوسِ قزح سے تشبیہ
دیتا۔ اس کی آنکھوں کو کنول کے پھولوں کی طرح بتاتا۔ اس کے رخساروں
کو پھول کی پتیوں کی طرح سرخ کر دیتا۔ اس کی نگاہوں میں بجلی کی تابناکی بھر
دیتا۔ اُس کے سینے میں سمندر کا سارا مدوجزر بھر دیتا۔ اور اس کے
کولھے ڈورتھی لیمار سے زیادہ خوبصورت دکھاتا۔ اور اس کے جسم
کی رنگت برف کی طرح سپید بتاتا۔ لیکن میرے سامنے ایک دُبلی پتلی سی
عورت کھڑی تھی جس نے ایک پھولوں والی دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ چہرے
کی رنگت غالباً گندمی ہونی چاہیے۔ لیکن جوں جوں اس عورت کی
عمر بڑھتی گئی۔ تو اس کی رنگت سیاہ ہوتی گئی۔ گال پچک گئے تھے اور
اُن پر سیاہ چھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ بالوں میں چمک کی بجائے روکھا پن
تھا۔ اور آنکھوں سے حزن و ملال کی جھلک نمایاں تھی۔ اور چال میں
نقاہت اور کمزوری آ چکی تھی۔ اگر اس عورت کا سر سے لے کر پاؤں
تک جائزہ لیا جائے۔ تو اس سے صاف ظاہر ہوگا۔ کہ کافی عرصے
سے اس عورت نے اچھی غذا نہ کھائی ہوگی۔ غذا کی کمی کی وجہ سے جسمانی
دلکشی غائب ہو چکی تھی۔ ایک بات جو قابلِ غور تھی۔ وہ تھی اُس کے
ہونٹوں کی لپ سٹک۔ جو بے حد سُرخ تھی۔ سارے جسم میں صرف
یہی جگہ تھی۔ جہاں خون کا گمان ہو سکتا تھا۔ رخساروں پر۔ اگر انہیں
رُخسار کہا جا سکے، پوڈر چھڑکا ہُوا تھا۔ اور ہلکی سی سُرخی بھی ملی ہوئی
تھی۔ لیکن دھوپ میں چلنے پھرنے کی وجہ سے پوڈر اور سُرخی اس
طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ کہ چہرے پر عجیب قسم کی اشکال نمودار
ہو رہی تھیں۔ وہ اس وقت بالکل ایک پُرانی کار کی طرح دکھائی دیتی
تھی جو متواتر استعمال سے اپنا رنگ روپ کھو بیٹھی ہو — میں
یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ ٹرام مسافروں سے کھچا کھچ بھر گئی۔ اور
چل پڑی۔

کئی دِن گذر گئے۔ میں اُس طرف نہ گیا — عورت کی یاد
میرے دِل سے اتر چکی تھی۔ اُس کے نقش آہستہ آہستہ میرے ذہن کی
چادر پر مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ آخر میرا اور اس کا کیا رشتہ تھا
میں کیوں اُس عورت کے متعلق سوچتا۔ اگر وہ کمزور ہے، بدصورت
ہے۔ اُسے روٹی نہیں ملتی۔ تو میں کیا کروں۔ اگر وہ غریب ہے
تو میں اُسے امیر کس طرح بنا سکتا ہوں۔ میں خود بھی غریب ہوں،
میں ہی کیا۔ اس دُنیا میں لاکھوں کروڑوں آدمی غریب ہیں۔
ناتواں ہیں۔ بدصورت ہیں۔ بھوکے رہتے ہیں۔ ننگے رہتے ہیں۔
بھلا میں اُن کی بھوک اور ناداری کس طرح دور کر سکتا ہوں جو اس دنیا
میں کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ جو امیر ہیں، جو اچھا کھانا کھاتے ہیں۔
اور نفیس کپڑے پہنتے ہیں۔ عالی شان کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ اور
ریس کھیلتے ہیں — بھلا ان باتوں کا میرے پاس کیا علاج ہے؟

اُس دن جب میں گھر سے نکلا۔ تو آسمان نیلا اور شفاف تھا۔
اور ہلکی ہلکی سی دھوپ تھی۔ اور دسمبر کا مہینہ۔ یہی جی میں آئی کہ گھر
سے نکلو۔ ٹہلتا ٹہلتا بازار چلوں آج بازار میں کافی رونق تھی
ضرورت سے زیادہ۔ پوچھنے پر معلوم ہُوا۔ کہ آج کرسمس ہے جبھی لوگ
خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ لوگوں کے
ساتھ ان کی بیویاں تھیں۔ جو بن ٹھن کر نکلی تھیں۔ اور اپنے بچّوں کو بھی
ساتھ لائی تھیں۔ لال پیلے غبارے پکڑے ہوئے ہنستے کھیلتے ہوئے
یہ لوگ دوکانوں سے نکل رہے تھے۔ چیزیں خرید رہے تھے۔ اور اپنی
اپنی موٹروں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ میں نے اپنے
کپڑوں پر نگاہ ڈالی قمیص کافی گندی اور میلی تھی۔ کالر پھٹ چکے تھے
اور بوٹوں پر کئی ہفتوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اُس دن مجھے اپنے گندے
اور میلے کپڑوں پر سخت غصّہ آیا۔ میرے قدم یکایک اس عالی شان
دوکان کی طرف اُٹھ گئے (عائشی مکس) میں کپڑے بڑی شان
سے سجائے گئے تھے۔ اِدھر اُدھر عورتوں کے کپڑے تھے۔ خوبصورت مجسموں
کو رنگ برنگ ساڑھیاں پہنائی گئی تھیں۔ ایک دو مجسموں کو فراک

اور بلاؤز پہنائے گئے تھے اور مجسّموں میں ان تمام نقوش کو واضح کیا کیا گیا تھا جس سے عورت کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاتھ کی انگلیاں مخروطی اور ناخنوں پر بلا کی سُرخی۔ سپید رنگت پر سیاہ بلاؤز آویزاں تھا اُن میں سے بازو سیب کی شاخوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ آنکھوں میں بجلی تھی۔ برف تھی اور بھویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ہار سنگار کا ساز و سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ سبز سبز منکوں کی مالا تھی۔ جو کسی حسین عورت کی گردن میں حمایل ہو کر ایک عجیب اثر پیدا کر سکتی ہے میں زیادہ عرصہ ادھر نہ ٹھیر سکا۔ اور مردوں کی طرف چلا گیا سامنے ایک سپید قمیص نظر آئی۔ اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ قیمت ۲۵ روپے تھی اور مجھے جھٹکا لگا۔ اور میری نگاہ مفلر پر جمی۔ ہلکا آسمانی رنگ تھا اس مفلر کا۔ میری گردن کے گرد ایک جھرجھری سی آگئی۔ اور گردن کے ارد گرد ایک ملائم سی حرارت عود کر آئی۔ قیمت ۳۵ روپے چودہ آنے۔ قیمت پڑھتے ہی گردن اکڑ گئی۔ میں تھوڑا آگے بڑھا۔ قریب ہی ایک جراب میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور پھر اس نے شرم سے گردن جھکا لی۔ قیمت صرف آٹھ روپے پندرہ آنے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا ہو۔ ساتھ ہی فیلٹ ہیٹ نے چھینک ماری اور کہنے لگی "کیا مجھے نہ خریدو گے" اور میرا ہاتھ یکایک اپنے بالوں پر جا لگا۔ بال سخت اور کھردرے تھے۔ ہاتھ اپنی جگہ پر آ گیا۔ اور ماتھے پر ایک ہلکا سا پسینہ آ گیا۔ اتنے میں ایک آدمی نے آ کر کہا۔ "Please to this side" اور میں بالکل ایک طرف ہو گیا۔ اور دوکان کو چھوڑ کر آگے چل دیا۔ لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ چیزیں خرید رہے تھے۔ اور کاروں میں بیٹھ کر جا رہے تھے اور میں پیدل چلتا ہوا ٹرام کے اڈے پر آ گیا۔ اور جونہی ٹرام پر چڑھنے لگا تھا۔ کہ وہ عورت نظر آئی۔ وہی پھولوں والی دھوتی۔ چلنے پھرنے کا وہی انداز۔ نگاہوں میں ناامیدی۔ اور چال میں تھکاوٹ اور کمزوری ــــــ آنکھیں پھٹی پھٹی۔ کسی کی متلاشی لوگوں کو دیکھتی ہوئی پل بھر کے لئے جائزہ لیتی ہوئی۔ کبھی کبھی امید سے وابستہ ہو کر۔ اور آخر کار ناامیدی کے گڑھے میں گر کر نیچے جھک جاتیں۔ لوگ ٹراموں پر چڑھ رہے تھے۔ اُتر رہے تھے۔ اور اُس کی نگاہیں مسافروں کو ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ اس وقت میرے دل میں یہ آیا۔ کہ آگے بڑھ کر اس عورت سے بات کروں۔ پوچھوں کہ وہ یہاں کیوں آتی ہے۔ اُسے یہاں کیا کام ہے اس کا رنگ کیوں پیلا ہے۔ اُس کی آنکھیں اندر کیوں دھنسی ہوئی ہیں اور وہ کیوں بار بار مسافروں کی طرف دیکھتی ہے۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ کہ عورت میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اُسے نہ پا کر میرے دل میں یاس اور غم کے بادل اُمڈ آئے اور زندگی کی بیچی اور بے بسی پر سخت غصّہ آیا۔

وہ صبح بہت ہی خوبصورت تھی۔ دلکش تھی۔ آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ اور لوگ جوق در جوق اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اُس وقت صرف میں اُداس تھا اور وہ عورت اداس تھی۔ دن بھر اس عورت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اور اسی دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر دوبارہ یہ عورت مجھے ملی۔ تو میں ضرور اس سے باتیں کروں گا۔ اس کی مدد کروں گا۔ اُس سے پوچھوں گا۔ وہ کیا کرتی ہے اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس کا گھر کہاں ہے

اسی سوچ بچار میں کئی دن گذر گئے۔ اور میں اُس طرف نہ جا سکا اُس عورت کی یاد دل سے نکل چکی تھی۔ بھلا ایسی تصویریں کب تک ذہن میں رہتی ہیں۔ یہ تصویریں سمندر کی لہروں کی طرح ہوتی ہیں۔ جو آنِ واحد میں ذہن کے سامنے آتی ہیں۔ اور ذہن کے پردے سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ اور ذہن پر ایک خفیف جھٹکا چھوڑ جاتی ہیں۔ لیکن یہ جھٹکے اتنے خفیف ہوتے ہیں۔ اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ کہ کوئی داغ نہیں چھوڑتے۔ صرف ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھتی ہیں جو لمحہ بھر کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور پھر انسان کا ذہن دوسری طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا۔ کئی دن گذر گئے، راتیں گذر گئیں۔ خوابناک راتیں، اور کئی حسین دن آئے اور چلے گئے۔ اندھیری راتیں آئیں اور دلوں میں پُرانی یادوں کو اُجاگر کر چلی گئیں۔ اور پھر ایک شام میں اسی طرف سے گذرا اس دن میری جیب میں کچھ روپے تھے۔ اسی لئے میری چال میں

خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ شام کے وقت اس بازار میں بہت کم بھیڑ ہوتی ہے۔ یہاں کے دوکان دار لاکھوں روپیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے شام ہوتے ہی وہ دوکانیں بند کر لیتے ہیں اور اپنی اپنی عشرت گاہوں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ وہاں شراب ہوتی ہے۔ مرغن کھانا ہوتا ہے اور ان کی گوری گوری۔ خوبرو محبوبائیں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اُن سے ہنستے ہیں کھیلتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ پھر عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ وفا اور بے وفائی کے چرچے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی بیویوں کے کرخت سلوک کا رونا روتے ہیں۔ اور اپنی محبوباؤں کے کندھوں پر سر رکھ کر اپنے زائد سرمائے کا چرچا کرتے ہیں۔

آج جب میں اس عالی شان دوکان کی طرف نکلا۔ تو ان شیشے کی الماریوں میں سے چند آدمی کپڑے نکال رہے تھے۔ میرے سامنے سب شیشے کی الماریاں خالی ہوئیں۔ صرف Hangers باقی رہ گئے تھے۔ کئی بار میرے دل میں آیا۔ کہ کسی رات ادھر آؤں گا۔ اور ان شیشے کی الماریوں کو توڑ کر اپنے لئے کپڑے لے جاؤں گا لیکن آج معلوم ہوا۔ کہ رات کے وقت یہ کپڑے ان آہنی بکسوں میں نہیں رکھے جاتے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں کچھ اُداس سا ہو گیا۔ اور آگے بڑھا۔ تاریکی کافی بڑھ چکی تھی۔ اور راستہ آوارہ اور اکیلا دکھائی دیتا تھا۔ ٹرام میں مسافر کم تھے۔ دوکانوں کے قریب مسلح چوکیدار نظر آ رہے تھے۔ یہ چوکیدار میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ میں اُن کی نگاہوں سے بچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آج مجھے پورا یقین تھا۔ کہ وہ عورت نظر نہ آئے گی۔ بھلا اس وقت وہ کیا کرے گی آکر۔ ایک دن وہ مجھے دوپہر کو ملی تھی۔ اور پھر ایک صبح ملی تھی۔ وہ شام کو یہاں کس طرح آ سکتی تھی۔ میں چلتا چلتا اسی اڈّے کے قریب پہنچ گیا۔ ٹرامیں کھڑی تھیں۔ مسافر بہت کم تھے میں نے چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے قدم پھر رُک سے گئے۔ یونہی خیال آیا۔ کہ وہ عورت کہاں ہو گی اور میں نے پھر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کوئی کسی گم شدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ یکایک میری نگاہیں بجلی کے کھمبے کے قریب جا کر اٹک گئیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ عورت اُسی کھمبے کے قریب کھڑی تھی۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا۔ اور عورت نے میری طرف

عورت کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ایک شعلہ بلند ہوا۔ جیسے چقماق کے دو پتھروں کے ٹکرا جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور میں جلدی سے ایک طرف کو ہو گیا۔ میں نے دیکھا عورت کی نگاہوں میں اُداسی آگئی تھی وہ چمک غائب ہو گئی تھی۔ اور وہ مری ہوئی نگاہوں سے مسافروں کو دیکھنے لگی۔ مسافر اتر رہے تھے اور چڑھ رہے تھے۔ اس وقت مسافر بہت کم تھے۔ اور خاص کر اس حلقے میں روشنی بہت کم تھی۔ تاریکی زیادہ تھی۔ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ لیکن عورت مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ میرے دل میں خیال آیا۔ کہ اُس سے جا کر ملوں، باتیں کروں اور پوچھوں۔ کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ اتنی اُداس کیوں رہتی ہے۔ آج میری جیب میں روپے تھے۔ اور میں نے سوچا۔ کہ یہ روپے اُسے جا کر دے دوں اور کہوں۔ کہ آج رات گھر جا کر چپکے سے سو جاؤ۔ کسی گاہک کا انتظار نہ کرو۔ کسی مرد کا انتظار نہ کرو۔ عورت کھمبے کے قریب اکیلی کھڑی تھی۔ اب اس نے اپنی پیٹھ میری طرف کر لی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ اُس کی نگاہوں میں کیا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ وہ کیوں لوگوں کی طرف بار بار دیکھتی ہے۔ اُس کا جسم کیوں پتلا اور دُبلا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں چمک کیوں نہیں۔ اُس کی چال میں توانائی کیوں نہیں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کیوں نہیں۔ وہ کیوں ہر صبح، ہر دوپہر، ہر شام۔ اس شہر کے سب سے بڑے بارونق بازار میں آتی ہے۔ جہاں صرف شرفا کا گزر ہوتا ہے جہاں صرف امیروں کا گزر ہوتا ہے۔ جہاں عالی شان عمارتیں ہوتی ہیں۔ شاندار ہوٹل ہوتے ہیں۔ جہاں لوگ کاروں میں بیٹھ کر بازار کی رونق دیکھتے ہیں۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا۔ کہ یہ چند سکّے اُسے جا کر دے دوں۔ اور اسے کہوں کہ آج رات آرام اور چین سے گزارو۔ اور خاموشی سے اپنے کمرے میں سو جاؤ۔ اس کا کمرہ کہاں ہو گا۔ وہ سوتی کہاں ہو گی۔ میں نے سوچا۔ اور یکایک یہ خیال میرے ذہن میں کوندا۔ کہ اگر آج میں نے اسے روپے دے دیئے۔ تو وہ کل کیا کرے گی۔ پرسوں کیا کرے گی۔ اترسوں کیا کرے گی۔ میری ایک دن کی خیرات سے اُسے کیا فائدہ پہنچے گا۔ یہ اس مسئلے کا حل نہ تھا۔ اُسے پھر اسی بازار میں آنا ہو گا۔ اور اپنے جسم کو فروخت کرنا ہو گا

اس خیال کے آتے ہی میری گرفت روپوں پر سخت ہو گئی۔ اور مجھے اپنی غربت کا احساس ہونے لگا۔ اور میں نے نگاہیں موڑ لیں۔ لیکن نگاہیں پھر اُسی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ گھر کیوں نہیں جاتی۔ وہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ کبھی بار بار مسافروں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھے اس عورت کو اس حالت میں دیکھ کر غصّہ آ رہا تھا۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا۔ کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ عجیب قسم کی بدکار عورت ہے جسے روپوں کے لئے اپنا جسم بیچنا پڑتا ہے۔ اور رتی بھر شرم محسوس نہیں کرتی۔ اور پھر مجھے اس بات کا خیال آیا۔ کیا اس کرّہ ارض پر کوئی ایسا ملک ہے۔ جہاں عورتوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا جسم بیچنا نہیں پڑتا۔ اور ذہن پر دباؤ ڈالنے کے بعد مجھے خیال کہ ہاں ہے، واقعی ہے۔ مَیں نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ کہ اس ملک سے بہت دُور ایک اور دیس ہے۔ جہاں خوب برف پڑتی ہے۔ اور سردی ہوتی ہے۔ جہاں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہے۔ سُنا ہے۔ کہ اُس دیس میں عورتوں کو اپنا جسم بیچنا نہیں پڑتا۔ جہاں عورتیں اَن پڑھ نہیں ہوتیں مردوں کی غلام نہیں ہوتیں۔ جہاں وہ دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ ہوائی جہاز چلاتی ہیں۔ فوج میں کام کرتی ہیں۔ اُن کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ محبت کرتی ہیں۔ شادی کرتی ہیں۔ بچے پیدا کرتی ہیں اور بڑے مزے سے زندگی بسر کرتی ہیں — وہ دیس یہاں سے کتنا دُور ہے۔ کیا وہ نظام یہاں نہیں آ سکتا۔ اور یکایک مجھے یہ خیال آیا۔ کہ میں جا کر اس عورت سے کہوں "کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں! وہ دن دُور نہیں۔ جب تمہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اس اڈے پر نہ آنا ہو گا۔ اپنا جسم نہ بیچنا پڑے گا۔ اور دیس والے تمہاری عزت کریں گے۔ تمہیں کام دیں گے۔ تمہیں روٹی دیں گے۔ تمہارے بچّوں کو دودھ دیں گے۔ وہ دن آئیں گے۔ رحمت میری بہن۔ وہ دن ضرور آئیں گے۔ جب تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے۔ جب تمہارے رخساروں پر چھائیاں نہ ہوں گی۔ بلکہ شفق کی لالی ہو گی جب تیرے ہونٹوں پر سُرخی کی جگہ اصل خون دوڑے گا۔ جب تیرا سینہ گوشت سے بھرا ہوا ہو گا۔ جب تیرے کولھوں میں کشش ہو گی اور جب تیری آنکھوں میں یاسیت کی جگہ امید کے چراغ جھلملائیں گے۔ جب لوگوں میں اتنی طاقت آ جائے گی۔ کہ وہ نفع خوروں اور بلیک مارکٹوں کے ہاتھوں سے طاقت چھین لیں گے۔ اور اُس دور والے دیس کی طرح نظام حکومت قائم کریں گے رحمت میری بہن۔ اس اکیلی رات میں اکیلی نہ رو ——

اور میں یہ سوچتا ہوا خاموش ہو گیا۔ کیونکہ ذہن میں یہ خیال بھی آ رہا تھا۔ کہ جب تک وہ نظام نہیں آتا۔ تب تک وہ کیا کرے — تب تک وہ کیا کرے۔ یہ سوچ کر میں ٹرام میں بیٹھ گیا۔ اور ٹرام اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھی۔ میں نے پیچھے کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ کھمبا اکیلا کھڑا تھا۔ اور عورت وہاں سے جا چکی تھی ——

ممتاز مفتی

احمق

"رفی"۔ احمد نے مبہم آہ بھر کر کہا۔ "بہت خاموش ہو تم؟"

"ہوں؟" احمد نے اسے اپنے قریب تو کھینچ لیا۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے لگا۔ "نہیں تو" وہ مسکرائی۔ "دیکھو نا وہ اپنی ہی دھن میں بولتا گیا "میں نے تمہیں کس قدر افسردہ کر رکھا ہے۔ یاد ہے جب میں پہلے روز تمہارے پاس آیا تھا"۔ "ہاں" وہ بولی "کتنی شوخی تھی تم میں دبی دبی شوخی اور اب جیسے ڈال جھک کر پھول کو سرنگوں کر دیتی ہے۔ سمجھتی ہو نا؟"

رفی نے نیم نگاہ سے اُسے دیکھا اور اس کی مژگاں ڈھلک گئیں۔ "لیکن فکر نہ کرو۔ اب تو قصہ ختم ہو گیا۔ آج میرا آخری دن ہے کل میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ [illegible] پھر وہی رفعت بائی بن جاؤں گی۔ وہی [illegible]۔ وہی گھنگھرو۔ وہی" اکیلی [illegible] گے"۔ "فکر نہ کرو"۔ احمد نے آہ بھری۔

رفی نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا۔

"کاش! میرے پاس روپیہ ہوتا۔ صرف پانچ سو۔ ہاں ایک مہینہ اور"

رفی نے گھبرا کر آنکھیں اٹھائیں۔ اس کے انداز سے عجیب سی گھبراہٹ ہویدا تھی۔ پھر وہ صندوق پر پڑے ہوئے سبز رومال کی طرف دیکھنے لگی جس میں کوئی چیز لپیٹی ہوئی تھی۔

"لیکن بے کار ہے۔ ایک مہینہ اور بھی کیا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ پانچ سو کا بالائی کا برف کھا کر ٹھٹھر کر یخ بستہ ہو جاؤں۔ جیسے برف کا ڈھلا۔ بے حس و حرکت ڈلا۔ جیسے تم ہو۔ تم"۔

"میں؟" وہ مسکرائی۔

"جیسے ناچنے والیاں ہوتی ہیں۔ نہیں ہوتیں کیا؟"

اُس نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں "شاید" پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہائیں" اس نے حیرانی سے رفی کی طرف دیکھا "کہاں چل دی؟"

"ابھی آئی" وہ رومال اٹھاتے ہوئے بولی۔ اور باہر نکل گئی۔

"ہوں" احمد نے جھرجھری لی۔ اور اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔

احمد کو تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ صبح سکرٹیریٹ کو جاتے ہوئے یا پانچ بجے کے قریب وہاں سے لوٹتے ہوئے یا شام کے وقت کسی ہوٹل کے کسی ایک کونے میں چائے کے پیالے کو گھورتے ہوئے یا دیوار کے پار دیکھنے میں کھوئے ہوئے دفتر سے نکلتے وقت بھی اس کا انداز عام کلرکوں سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ چپ چاپ۔ اکیلا۔ جھاتی ابھارے۔ گرد و پیش کو گھورتے ہوئے۔ وہ کھوئے ہوئے انداز سے چلے جاتے ہیں۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ ایک مختصر سا مکان اس محلے کے قریب اسے الاٹ ہو گیا تھا جہاں رقاصہ رہتی تھی۔ ورنہ وہ تو شاید کبھی بھی اس محلے کی راہ نہ جانتا اگر رفعت بائی کا مکان اس کی راہ میں نہ پڑتا تو وہ کبھی رفعت سے روشناس بھی نہ ہوتا۔ یا اگر رفعت عام رقاصہ ہوتی جب بھی اُسے رفعت سے ملنے کا خیال نہ آتا۔ مگر رفعت تو رقاصہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ رقص کا لباس پہننے اور ساز کے ساتھ گانے کے باوجود اس کے چہرے کے خطوط میں احمد کو غم کی مبہم سی جھلک محسوس ہوتی۔ اس کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی دکھائی دیتی۔ قریب ہونے کے باوجود وہ دور نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی نظر آتی۔ اس کا مکان اگر محلے کے وسط میں ہوتا یا اس کوچے کی بڑی گلی کی طرف ہوتا جہاں لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ جب بھی وہ وہاں جانے کی جرأت نہ کرتا۔ مگر وہ مکان بھی تو گویا رفی کی طرح چپ چاپ خاموش اور کھویا کھویا سا تھا محلے سے دور۔ تماش بینوں کی نگاہوں سے دور، اُن کے قہقہوں سے دور۔

اسی وجہ سے یا شاید اسے احمد کے شدید احساس تنہائی سے

بھی تعلق ہو۔ ایک دفعہ وہ ان جانے میں غلطی سے ادھر مڑ گیا اور دروازے پر جاکر پریشان ہو کر رک گیا۔

"آیئے" رفی نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا "اندر تشریف ——"

"نہیں نہیں" وہ بڑبڑانے لگا۔ "میرا مطلب ہے ——"

"بات تو سنئے" وہ یوں بولی جیسے کوئی گھنگھرو بجا رہا ہے۔

وہ رُک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ باہر آگئی "آیئے نا" وہ بولی اور وہ دونوں اندر چلے گئے

"بسم اللہ" اندر میراثی اُسے دیکھ کر بڑبڑایا گانا سننے گا۔ اور وہ سارنگی بجانے لگا۔

"نہیں۔ نہیں" وہ زیرِ لب بولا "میں تو ——" اور اُس نے ایک بیکسانہ نظر سے رفی کی طرف دیکھا۔

"آپ ٹھہریں گے؟" وہ بولی۔

احمد نے کونے میں بیٹھے ہوئے میراثیوں کی طرف دیکھا۔

"آیئے اُدھر چلیں" اور وہ اُسے کوٹھے پر لے گئی۔

کچھ دیر تک تو وہ اُس کی باتیں سنتی رہی عجیب باتیں تھیں اُن کی جن سے وہ بالکل واقف نہ تھی۔ رفی کے ہونٹوں میں تمسخر انگیز مسکراہٹ دبی تھی اس کی متبسم آنکھیں گویا رقص کر رہی تھیں اُس کے ہونٹ اشارے کر رہے تھے۔ مگر وہ ان باتوں سے بے خبر احمد کی کمر میں ہاتھ دئے باتیں کئے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے جھول رہا تھا۔

"لیکن آپ تو ٹھہرنے کے لئے آئے ہیں نا" وہ اکتا کر بولی۔

"ہاں" وہ مسکرایا "ٹھہرا تو ہوں۔ یہ جھولنا پسند نہیں آپ کو تو نہ سہی" اس نے جھولنا بند کر کے پلنگ سے لٹکتی ہوئی ٹانگوں کو جھلانا شروع کر دیا۔

"لیکن آپ تو یہ باتیں کر رہے ہیں؟" اس نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں" "مثلاً آپ کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی سی کیوں ہوتی ہے۔ آپ کے رقص میں غم کی لہریں کیوں ہیں۔ آپ کے ہونٹوں میں گرہ سی کیوں دبی رہتی ہے؟"

دفعتاً رفی کی آنکھیں ساکن ہو گئیں۔ تو کیا اس نے چتون چڑھا کر کہا۔

"آپ رات بھر ٹھہریں گے؟"

"تو کیا ابھی چلا جاؤں" وہ بولا۔

"چالیس روپیہ ہوں گے" وہ بے رُخی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ" وہ بولا "ٹھیک تو ہے تمہارے لئے تو میں چالیس روپے کی تھیلی ہوں۔ اور بس"۔

وہ تڑپ کر مڑی۔ اس نے یہ بات اس سے پہلے کبھی نہ سُنی تھی لیکن وہ نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ تیس۔ چالیس۔ اس نے چار نوٹ میز پر پھینک دئے۔

وہ پھر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ تم رقاصہ ہو" اس نے ہنسنے کی کوشش کی "کیسا بے وقوف ہوں میں"

"اب چھوڑئیے بھی" رفی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دئیے۔

"لیکن میں بھی کیا کروں۔ تم رقاصہ دکھتی نظر بھی تو نہیں آتیں۔ جیسے رقص کے آسمان پر چاندنی میں ایک بادل کھویا ہوا تیر رہا ہو"

وہ اُسی طرح چارپائی تلے پاؤں لٹکائے۔ رفی کی کمر میں ہاتھ دئے جھولتا ہوا باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرتا رہا اور وہ ہنستی رہی۔ اُس کے ساتھ سمٹی ہوئی جھکی ہوئی سنتی رہی۔ اُس کے لئے یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ پہلے تو وہ اکتا سی گئی تھی۔ لیکن پھر اُس مسلسل پیار بھری گرفت نے نہ جانے اُسے کیا کر دیا۔ یہ تسلسل اس کے لئے ایک انوکھی چیز تھی۔ وہ تو صرف شدید جذبے سے واقف تھی۔ شدید لمس اور بے رُخی اس کے لئے یہ تسلسل بھری مٹھاس انوکھی تھی۔ اُس نے محسوس کیا۔ جیسے اس کی زندگی کے بکھرے ہوئے پھول ایک دھاگے میں پروئے جا رہے تھے۔ جیسے اندھیرے اور اجالے کے دھبے مل کر ایک دھیمی سحر کی تعمیر کر رہے تھے۔ اُس نے حیرانی سے اُس خبطی کی طرف دیکھا۔ جو اُسے پہلو سے بھینچے رکھنے کے باوجود دُور نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

"یہ خوشبو بہت تیز ہے۔ یہ تمہارے جسم سے ہم آہنگ نہیں ہو گی" اور یہ سرخی۔ اونہوں اُسے تمہارا جزوِ بدن ہونا چاہئے۔ اور یہ انداز تمہاری طبیعت کے موافق نہیں ہے۔

اور یہ ——

رفی نے جمائی لی "ہمیں نیند آئی ہے" وہ بولی۔

تو سو جاؤ۔ احمد نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ تمہارے جسم میں رقص ہے۔ لیکن وہ اُسے تھپکتے ہوئے بولا۔ تم نے اسے اپنے اعضا،

میں سمجھ گیا کہ تمہارے انداز میں رقص نہیں روانی نہیں جیسے تم نے اُسے زبردستی روک رکھا ہو۔

جب وہ جاگی تو اس نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر اکیلی پڑی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ معاً اُسے یاد آیا۔ ہاں وہ آیا تھا وہ اُسے جھلا رہا تھا۔ تمہارے جسم میں رقص ہے۔ یہ سرخی اور یہ وہ جب اُسے معلوم ہوا کہ احمد جا چکا تھا۔ تو اسے ہلکا سا صدمہ ہوا۔ اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ہائیں صرف ساڑھے بارہ۔ مایوسی میں یوں بیٹھ گئی گویا کسی نے ہار سے تاگا کھینچ لیا تھا اور پھول یہاں وہاں بکھر گئے تھے۔ اُس کی نگاہوں تلے کمرے میں یہاں کالے دھبے تیرنے لگے۔ دور کوئی رک رک کر گا رہا تھا۔ رو رہا تھا۔

اگلے دن جب وہ ہونٹوں پر سرخی لگا رہی تھی کسی نے چپکے سے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ رفی۔ یہ تمہارے جزوِ بدن نہیں ہوگی۔ وہ رک گئی اور لپ سٹک میز پر رکھ دی۔ رات کو جب وہ پلنگ پر بیٹھی تو یوں جھولنے لگی جیسے کوئی اُسے جھلا رہا ہو۔ میز پر بکھرے ہوئے پھولوں کو وہ انجانے میں۔ دائرے میں چننے لگی۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑی۔

آپ کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی سی ہے۔

وہ لیٹ گئی۔ سرہانہ کھسک کر اس کی بغل میں پھنس گیا۔ اُس نے اپنا منہ سرہانے میں گاڑ دیا۔ کوئی اسے تھپکنے لگا۔

پھر ایک شام کے جھٹپٹے میں وہ کھڑکی میں کھڑی اردگرد پھیلے ہوئے مکانوں کو دیکھ رہی تھی۔

ایک دوسرے سے کس قدر دُور تھے وہ۔

رفی۔ اندھیرے میں سے اس کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

پچھلے چند ایک دنوں میں اُس نے وہ آواز کئی مرتبہ سنی تھی۔ وہ گھبرا گئی کیا وہ آواز اُس کے ذہن پر اس قدر مسلط ہو چکی تھی۔ سان جانے میں اس نے ہونٹ نکال کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ نہیں آج اُس نے سرخی تو نہ لگائی تھی

رفی رسایہ اس کے قریب آگیا۔

کہیئے وہ بولی۔

میں سوچ رہا تھا۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ ایک مہینہ ٹھہرنا چاہئے تو ایک مہینہ۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

کیوں ساس میں کیا برائی ہے وہ بولا

آپ اندر آئیے نا۔ وہ بولی۔

میرے پاس صرف پانچسو روپیہ ہے۔ صرف پانچسو۔

اندر تو آئیے آپ۔

بسم اللہ۔ بسم اللہ میراثی پانچسو کا نام سن کر چلانے لگا۔

نہ جانے کیوں رفی کے دل پر ٹھیس لگی۔ آپ آئیں بھی تو وہ بولی لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ کھڑکی سے کود کر اُسے ڈھونڈے مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ کھڑی ہی رہی حتٰی کہ بتیاں روشن ہو گئیں۔ اور بڑے کوچے سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دفعتاً اسکا سر چکرانے لگا۔ اور وہ سر درد کا بہانہ بنا کر اوپر چلی گئی۔ مجھے بے حد افسوس ہے پاس ہی کوئی بڑبڑایا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

آپ ہیں۔

نہیں نہیں آپ آرام کیجئے۔ میں پھر آجاؤں گا۔

آئیے نا۔ اس نے لپک کر احمد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اچھا وہ چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ اور پھر جیب سے نوٹ نکال کر چارپائی پر رکھتے ہوئے کہنے لگا صرف پانچسو ہیں۔ بس یہی ہیں۔

اور آج اُس کا آخری دن تھا۔

سارا مہینہ اُس نے رفی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے میں بسر کر دیا تھا۔ وہ اُس کے بازو سے کپڑا سرکا کر اُسے چھوتا۔ کتنی ملائم اور کس قدر شفاف۔ خون کی جھلک صاف نظر آ رہی ہے۔ اور گوشت کس قدر جاندار ہے۔ کتنی گرفت ہے اس میں۔ وہ مسلسل باتیں کرتا رہا تھا۔ رفی کی باتیں۔ اپنی باتیں۔ زندگی۔ خوشی اور غم کی باتیں۔ شاید رفی اس کی بے تکی باتوں سے اکتا جاتی۔ لیکن اس کا بازو رفی کو کمر سے تھامے ہوئے اُسے اپنے پہلو سے چمٹائے رکھتا یا اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ کر اس کا گال تھپکتا رہتا۔ سمجھتی ہو رفی ——— وہ اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے پوچھتا۔ لیکن تم کیسے سمجھ سکتی ہو۔ کیسے سمجھ سکتی ہو۔ یہ زندگی بھرا جسم — تم اس کی گرفت میں ہو۔ تمہیں کیا پڑی کہ سمجھو۔ سمجھنے کی لذت سے جینے کی لذت کہیں زیادہ ہے۔

یونہی اس نے ایک مہینہ بسر کر دیا تھا۔ اور آج اس

کا آخری دن تھا۔

رنی وہ چلایا۔ کہاں چلی گئی ہو۔

آ گئی ہیں۔ رنی چائے کا ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

چائے؟

وقت ہو گیا ہے نا۔

اوہ۔ وہ ہنسا۔ تم نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ بیٹھو۔ یہاں مجھے پریشان کرنے کے لئے تم میری عادتیں بگاڑ رہی ہو۔ احمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ یہ چائے ہے۔ اب کھانا ہے۔ یہ مخملیں شبنم ہے۔ یہ بجروٹی اُبھاریں۔ یہ سب میری عادتیں بگاڑنے کا سامان ہے۔ تمہیں معلوم نہیں وہ ہنسنے لگا۔ تمہیں معلوم نہیں۔ اور اور تمہارے پاس ٹھہرنے کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ تھی۔ اس لئے میں یہاں آیا تھا۔ اور وہی بات میں نے تم سے آج تک نہیں کی۔ کوئی انتہا ہے حماقت کی ——————

جانتی ہو وہ کیا بات ہے۔ اس نے آہ بھری۔ آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی۔ کسی نے بھی نہیں۔ مجھ میں وہ بات نہیں جو لڑکیوں کو مائل کر دیتی ہے۔ وہ جوہر نہیں۔ وہ چمک نہیں۔ اُسے جو چاہے کہہ لو۔ وہ مجھ میں نہیں۔ میری خالہ زاد تھی۔ اگرچہ وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اس میں کوئی بات ہی نہ تھی۔ سارا دن چوکی پر بیٹھ کر سویٹر بننے میں لگی رہتی تھی اور میں پاس چلا جاتا۔ تو بالکل ہی نگاہیں سویٹر میں گاڑ لیتی۔ کمبخت کو سر اٹھانا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک دن میں نے اسے کہہ دیا۔ میں نے کہا۔ ثریا تمہارا جسم کس قدر خوبصورت ہے جیسے بیر بہوٹیاں رینگ رہی ہوں۔" وہ سمٹ گئی۔ اور پھر گھور کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے نہ جانے کیا گناہ کر دیا ہو۔ اس کے بعد وہ میرے پاس کبھی نہ بیٹھی۔ کبھی نہیں۔ اور پھر سعید آ گیا۔ سعید میرا ماموں زاد تھا۔ اور دو ہی دن میں نہ جانے اس نے کیا کر دیا۔ کہ وہ دونوں الگ بیٹھ کر کھسر پھسر کرنے لگے۔ نہ جانے سعید میں کیا ہے۔ اُسے لڑکیوں کو راغب کر لینے میں کمال حاصل ہے۔ اس میں وہ چیز ہے جس سے میں بالکل محروم ہوں۔ اگرچہ دیکھنے میں اس کی شکل بے حد عامیانہ ہے۔ بے حد عامیانہ۔ کبھی کبھی تو گھن آنے لگتی ہے۔ اسے دیکھ کر پھر وہ کالج میں مس اختر تھی۔ اُسے تو مجھ سے چڑ ہو گئی تھی۔

نہ جانے کیوں میں نے چار ایک مرتبہ اُسے غور سے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کا مُنہ سُرخی سے چھلک پڑتا۔ پھر وہ مُنہ موڑ لیتی۔ اور رہا آخر اس نے میری طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ اور آخری دنوں میں تو وہ کسی دوسرے لڑکے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے نیچی نظر سے میری طرف دیکھتی جیسے مجھے جلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ ہنسنے لگا

عجیب ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ نفرت جتانے میں کس قدر تیز ہوتی ہیں

اہوں۔ اس نے آہ بھری

لیکن تم ان باتوں کو کیسے سمجھ سکتی ہو۔ تمہیں کیا معلوم۔

کیوں۔ اس نے نیچی نگاہ سے اسے دیکھا۔

تمہارے لئے تو ہر مرد۔ بڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اچھا۔ اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔

مجھے تو محبت بھرا لمس چاہئے۔ جذباتی لمس۔ ذہنی لمس جسمانی لمس۔

اچھا۔ وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔

لیکن مجھ میں وہ بات نہیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔

اوہ۔ دفعتاً وہ بولا۔ بہت تنگ جگہ ہے۔ تمہارے لئے۔ وہ پیچھے سرکتے ہوئے کہنے لگا۔ اچھا رنی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا مرد یہ پسند کرتا ہے۔ کہ اس کی محبوبہ کھنچی کھنچی رہے۔

وہ بے پروائی سے سبز رومال کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑی بے پروائی سے بیٹھی ہو وہ گنگنایا۔ ہاں۔ تمہیں ان باتوں سے کیا دلچسپی۔

ہاں۔ مجھے کیا۔ اس کی آواز میں تلخی سی تھی۔

جو خوشی بیچے اُسے غم سے کیا تعلق۔ اور جو غم سے آشنا نہیں اُسے خوشی سے کیا واسطہ۔ وہ خاموش ہو گیا۔

وہ پیچھے سے کھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

رنی وہ بولا۔ اس دھندے میں ڈرامائیت کیوں ختم ہو جاتی ہے۔

رنی نے ان جلتے میں پلنگ سے لٹکتے ہوئے ہار کا تاگا توڑ دیا۔ اور گرتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر ہنسنے لگی

ہنستی کیوں ہو۔ اُس نے رنی کو قریب تر کھینچتے ہوئے کہا۔

کیا رو دوں۔ وہ مسکرائی۔

رنی کیا تم رو سکتی ہو۔

رنی نے نگاہ بھر کر اس کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔ دفعتاً اس نے دوسری طرف منہ موڑ لیا۔

بہت کم لوگ رو سکتے ہیں بہت کم۔

آہ۔ رنی کی نگاہ میں نفرت کی ہلکی سی جھلک تھی۔

ہُوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

شکر ہے میں رو نہیں سکتا ورنہ۔ ۔ ۔

ہاں اس نے لمبی آہ بھری۔

ہے نا۔ اُس نے پوچھا۔

رنی نے سر ہلا دیا۔

شکر ہے تم اتنا تو سمجھتی ہو۔ لیکن اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔

ماحول۔ شور مچاتا ہوا طبلہ چیختی ہوئی سارنگی اور "ٹھنڈے ڈیرے آجا" بلاتی ہوئی آنکھیں۔ دیا جلانے والا پڑ ماس کے بعد گھپ اندھیرا تو ہونا ہی تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے لگا۔

عجیب بات ہے وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ اس کے بلاوجہ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس اور پانچسو ہو۔

رنی بے تابی سے سبز رومال کو گھورنے لگی۔ جس میں نہ جانے کیا لپٹا ہوا تھا۔

حماقت وہ ہنسا۔

اور کیا۔ وہ مسکرانے لگی۔ حماقتیں بھی کس قدر پیاری ہوتی ہیں۔

ہاں وہ بولا ہماری حماقتیں تمہیں پیاری ہوں گی ہی۔ وہ روپے کا روپ دھار لیتی ہیں نا۔

اوہ۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ اور سبز رومال کو اٹھا کر اس سے کھیلنے لگی۔

میں نے کہا باہر سے میراثی کی آواز آئی۔

کون ہے رنی نے پوچھا۔

میں نے کہا میراثی اندر داخل ہوتے ہوئے بولا سیٹھ صاحب آئے ہیں۔ دو گیت سننے کے لئے کہتے ہیں وہ۔

میں نے تو کہا تھا پر وہ تکرار کئے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔ وہ رک گیا۔

اوہ۔ رنی چونک کر بولی۔ اور پھر احمد کی طرف دیکھ کر کہنے لگی طبیعت اچھی نہیں۔

اوہ۔ احمد اُٹھ بیٹھا۔ میری طبیعت کی فکر نہ کرو میں اچھا بھلا ہوں ہمیشہ یہاں رہنا تو ——

نہیں نہیں وہ چلائی۔

ٹھیک ہے وہ ہنسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ہمیشہ یہاں رہنا۔

پھر پانچسو روپیہ۔

اوہ۔ رنی نے وہ سبز رومال احمد کی طرف بڑھا دیا۔ میری طرف سے وہ رُک گئی۔ جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔

ہاں وہ ہنسا نشانی ہے۔ تاکہ یہ پھر آنے پر اکسائے پانچسو جمع کرنے پر مائل کرے۔

رنی نے رومال پلنگ پر پھینک دیا۔ اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

اچھا میں جاتا ہوں۔

مگر وہ رک گئی۔

ایک دن اور رہ لوں تو بھی کیا۔ کاش تم سمجھ سکتیں۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ پھر ہنسنے لگی۔

ہاں ہاں ہنسو وہ مسکرایا۔ ہنسنے سے تو ہوتا ہے نا۔ اور وہ نیچے اُتر گیا۔

اندھیری گلی میں چلتے ہوئے احمد کو دور سے سارنگی کی آواز سنائی دی۔ اور پھر کوئی چیخ چیخ کر گانے لگی۔ "ہنستے ہنستے جینا —" ہونہہ وہ مسکرایا۔ اور میں محبت خریدنے گیا تھا۔ احمق!

فیاض محمود

ایک سودا ہی سہی

سودا ہی سہی، سودا ہی سہی، سودا ہی سہی . . . . اس کے قدموں کی چاپ سے اسی جملہ کے الفاظ نکلتے آ رہے تھے۔ بجلی کے کھمبوں کی قطار، تازہ بارش سے بھیگی ہوئی سڑک، نم آلود ہوا، رات کا سناٹا اور ان الفاظ کی گونج بڑھتی ہی جاتی تھی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تین چار میل کی سیر کر کے واپس آئے ہوئے اس کے بہکے ہوئے خیال ان تین لفظوں میں مرکوز ہو گئے۔ سودا ہی سہی، سودا ہی سہی۔ وہ کیوں اس مصرع کو پورا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کیوں آرزوئے خام سہی کہنے سے گریز کرتا تھا۔ "ایک سودا ہی سہی۔ آرزوئے خام سہی" شعوری طور پر آرزوئے خام کیوں ذہن کی سطح پر رینگنے نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنے وحشت کو کیوں سینے سے لپٹائے پھرتا تھا۔ اس کے ذہن کے جھلملاتے پردوں میں ایک کوندا لپک کر اس کے دماغ کو تاریک کر دیتا تھا۔ ایک لمحے کی یاد!

ایک لمحہ، ایک صدی! وہ اس کے بازوؤں میں! اس کا سینہ اس کے شباب کی موجوں پر تیرتا ہوا اس کے بال عنبریں ہواؤں کے تھپیڑے! اس کے ہونٹ بجلی کے ترچھے خطوط، اس کا جسم ایک لطیف بوجھ، ایک گداز کیفیت۔ اک "سیال نور" اس کا بوسہ ایک خواب کی بستی! ایک سودا ہی سہی ایک سودا ہی سہی۔ کیا یہ صحیح تھا کہ واقعی اسے یہ قرب نصیب ہوا۔ مگر اس نے اپنے بازوؤں کی طرف دیکھا، یہ میرے بازو ہیں یہ بجلیوں سے کیسے لپٹ سکے۔ وہ میرے سینے سے لگے: ایک آرزوئے خام! میں نے کیا کہا تھا "میری پیاری، میری پیاری، میری پیاری" کچھ اور بھی کہا تھا؟ اس نے کیا کہا تھا میں تمہاری ہوں، تمہاری ہوں تمہاری، مجھے لے لو، مجھے لے لو۔ مجھے لے لو، مجھے جانے نہ دو . . . . . ایک سودا ہی سہی، سودا ہی سہی، مجھے لے لو۔ مجھے جانے نہ دو۔ مجھے ہمیشہ کے لئے لے لو۔ میں تمہاری ہوں، تمہاری ایک سودا ہی سہی۔ بجلی کے کھمبے کیوں سیدھے نہیں رہتے، یہ ناچنے کیوں لگے یہ کیا گا رہے ہیں "ایک سودا ہی سہی، سودا ہی سہی . . . . ."

وہ اپنے گھر واپس آ گیا۔ اس کا چھوٹا سا تین برس کا بچہ ابا جی ابا جی کہہ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ یہ بچہ اسے بہت پیارا تھا۔ ہنس مکھ، شریر، تیز، اس کی دودھ پیتی بچی، دودھ چھوڑ کر رونے لگی بیوی نے اس کی طرف دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا آج آپ کی سیر بہت لمبی ہو گئی اس نے کہا وہ ایک دوست مل گئے تھے۔ بیوی نے ہنس کر کہا "آپ کے دوست!" وہ بھی ہنس دیا۔ اس کی ازدواجی زندگی نے اسے گھیر لیا۔ اس کا گھر اسے کتنا عزیز تھا۔ دو بچے اور اپنے پیارے بچے، اور بیوی وہ محبت کی دیوی! وہ اپنے بیٹے کو گود میں لئے بیوی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ بچہ سو گیا۔ اس کی بیوی دیکھ بھال سے فارغ ہو کر چھوٹی بچی کو تھپکا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس نے پوچھا۔ آج آپ کو پھر کام ہے کیا؟ اس نے جواب دیا۔ جی ہاں کچھ دیر کام کروں گا۔ اس کی بیوی نے کہا۔ "دیر نہ لگائیے!" "ابھی آیا!"

دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا دفتر کی فائلوں کو دیکھتا رہا۔ سپرنٹنڈنٹوں کو بہت کام ہوتا ہے۔ کام بہت ضروری مگر رفتہ رفتہ اس کے کانوں میں ایک مدھم ہی لے گونجنے لگی۔ ایک سودا ہی سہی، مجھے لے لو! مجھے لے لو . . . . . . بیوی کی سہیلی! بائیس سال کی عمر! لمبی لمبی پلکیں وہ لمبی لمبی پلکیں، وہ مسکراتے ہوئے ہونٹ وہ چھوٹی سی ناک، وہ پلکوں کی چھاؤں، وہ آنکھوں کا اندھیرا میں ان کے یہاں کیوں جانے لگا۔ وہ بیوی کی سہیلی، کالج کی یاد، وہ ہمارے ہاں آتی ہی کیوں تھی! مگر وہ تو اکثر آتی تھی۔ اس دن اس نے کہا "بھائی جان آج دیر ہو گئی ہے مجھے گھر چھوڑ آئیے" بیوی نے اصرار کیا نگہت کو گھر پہنچا کے آنا۔ تانگے میں

بٹھاکر ہاں نہ چھوڑ آنا۔ آپ کی عادت بہت بُری ہے۔" اس نے آگے بیٹھنے کی کوشش بھی کی مگر مجبوراً ساتھ بیٹھنا پڑا۔ گھوڑا بدکا اور نگہت گرنے لگی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر گرتے سے پکڑ لیا۔ بمرتع تو وہ پہنتی نہ تھی مگر اس کا جسم تو اس کے ہاتھ لگنے سے ہی پگھل گیا۔ یہ بھی کوئی بات ہوتی ہے۔ . . .

مجھے لے لو مجھے لے لو . . . . مگر مجھے تو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ میں اس کے بغیر بے چین اور اس بن ادھورا رہ جاتا ہوں۔ وہ تو میرے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ وہ میری آواز سن کر جیتی ہے اور میری شکل دیکھ کر سانس لیتی ہے۔ میں اور شادی نہیں کر سکتا۔ . . . "مجھے لے لو . . . . مجھے لے لو . . . . . مجھے لو"۔ میں تمہیں کیسے لے لوں، کیسے لے لوں . . . میں تم سے بیاہ نہیں کر سکتا۔ تم ویسے میری بن نہیں سکتیں۔ اخلاق کے کڑے اصول تمہارے راستے میں حائل ہیں۔ میں تمہیں کسی اور راستہ کی طرف بلا نہیں سکتا۔ تم پھول کی ڈالی ہو، تم شبنم کا قطرہ ہو۔ تم نسیم سحر ہو۔ تم دھوپ میں کملا جاؤ گی، تم آگ کے نزدیک نہ آؤ۔ . . مجھے لے لو . . . . مجھے لے لو . . . . . .

ہر رات گویہ لوری اس کے کانوں میں لہراتی، اُن باہنوں کا لمس اس کے جسم پر ہلکی ہلکی چنگاریوں کی شکل میں پھوٹتا رہتا۔ اس کے سانس کا تموج، درختوں کی ہلتی ہوئی شاخوں میں، پرندوں کی سرسراہٹ میں، اس کے بیٹے کی ناہموار چال میں اُسے محسوس ہوتا۔ فقط بیوی کی آغوش میں اُس دل کی دھڑکن اسے سنائی نہ دیتی۔ مگر بیوی کی محبت میں ہر وقت اپنے آپ کو نہیں ڈبو سکتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ اسے دفتری زندگی میں صرف کرنا ہوتا تھا۔ سائیکل کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ بھی اسی لَے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے لے لو . . . . مجھے لے لو . . . . . مجھے لے لو . . . . .

اس نے سوچا یہ فضول بات ہے۔ ایک عیال دار، دفتر کا بڑا بابو اور جنون! وہ سائیکل پر جاتے جاتے اکثر ہنس دیتا تھا۔ مگر تعجب اس بات پر تھا کہ دو گھنٹے کے کڑے ضبط کے بعد بھی کاغذ سے اس کی آنکھ اُٹھتی تو ان آنکھوں کی سیاہی اسے چمک چمک کر خیرہ کر دیتی تھی اور اس کا گداز لمس وہ اس کا تیز تیز سانس، وہ پلکوں کی چھاؤں . . . . ایک سودا ہی تھی . . . . اُسی دن نگہت پھر اپنی منہ بولی بہن سے ملنے آ گئی۔ اور آتے ہی کہا بھائی فاروق آج کہیں چلے نہ جائیے گا۔ مجھے چھوڑ کے آنا ہوگا۔ بیوی نے بھی تاکید کر دی۔ اس نے دو تین دفعہ کہا "مجھے کام ہے ایک جگہ جانا ہے۔" مگر بیوی نے مجبور کر کے ہی چھوڑا۔ "آپ بہانہ سازی نہ کریں۔ اگر کہیں جانا ہوتا تو دفتر سے آتے ہی کہہ دیتے۔ اطمینان سے چائے پی۔ ابھی کہہ رہے تھے ایک مزیدار کتاب خرید کر لایا ہوں۔ آج دفتر کا کام بھی اتنا زیادہ نہیں۔ اسے ہی پڑھوں گا اور اب بہانے تراشنے شروع کر دئے۔ کوئی نہیں جاتا۔ نگہت کو چھوڑ کر آنا ہوگا۔ سنا آپ نے" اور ساتھ اُن آنکھوں کی تیز تیز برچھیاں، وہ ہونٹوں کی خفیف جنبش، سیاہی کے وہ جھونکے، وہ اُس کے بکھرے ہوئے بال!

اس دن ٹانگہ صحیح و سالم انہیں نگہت کے گھر لے گیا۔ گول کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ کسی رشتہ دار کے ہاں ایک تقریب پہ گئے ہوئے تھے۔ وہ باہر ہی سے رخصت ہونے پر اصرار کر رہا تھا۔ کہ نگہت اسے پکڑ کر اندر گول کمرے میں لے گئی۔ وہ بجلی کا بٹن دبانے کو ہی تھا کہ دو بجلیاں اسے لپٹ گئیں۔ اس کے اپنے ہاتھ بے اختیار ہو کر نگہت کے جسم کے دائروں میں گھر گئے۔ . . . . . . کچھ عرصے کے بعد وقت کی چاپ اسے سنائی دینے لگی۔ مدہوشی کی لہروں کو چیرتا وہ اُبھرا، وقت ساکن، کائنات خاموش۔ بجلی کے کھمبے جامد، ٹانگے کے پہیے بے آواز، گھوڑے کے قدم ملفوف، دماغ میں لہروں کا خروش کم۔ قلب کی دھڑکن ہلکی، اس کی اپنی بیوی کی آواز کہیں دُور سے آتے ہوئے نغمے کی طرح دلکش! بیوی کی آغوش خواب آلود . . . . وہ صبح حسب معمول اٹھا اور ناشتہ کر کے دفتر روانہ ہو گیا۔

راستہ میں سائیکل معلوم نہیں کیسے ایک بس اور ٹانگے کے درمیان آ کر ٹانگے سے ایسی ٹکرائی کہ اس کا سر ٹانگے کے دائیں پہیے کے نیچے آتے آتے بچا۔ مگر چوٹ بہت آئی۔ ٹانگہ خالی تھا۔ دو ایک راہگیر اسے اسی ٹانگہ میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ سائیکل

کانسٹیبل کے حوالے کردیا گیا۔ ہسپتال میں دو گھنٹے بیہوش رہا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ دماغ کو صدمہ پہنچا ہے۔ مگر ضرب کاری نہیں۔ ہوش میں لانے کی دوا دی۔ مگر دو ہی گھنٹوں میں اسے تیز بخار آگیا۔ اس کے کوٹ کے کاغذات کو دیکھ کر اس کے دفتر اطلاع دی گئی۔ وہاں سے اس کے گھر اور اس کے والد اور بھائیوں کو بھی خبر دے دی گئی۔ ہسپتال میں اس کی خبرگیری اچھی طرح سے ہوتی رہی۔ بخار دس دن تک زور کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کی بیوی کو اس بات سے بہت پریشانی ہوئی۔ کہ ہذیان بکنے کے دوران میں وہ بے سری آواز میں گانے لگتا ..... مجھے لے لو لے لو..... لے لو اور اکثر ایک ہی جملہ کو دہراتا رہتا۔ ایک سودا ہی سہی ..... سودا ہی سہی ..... سودا ہی سہی

ان دنوں نگہت کے بال دو چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں بٹ گئے تھے۔ جس سے اس کی پلکوں کی چھاؤں ایسی گھنیری نہیں رہی تھی بیوی کا خیال تھا کہ نگہت نے سگی بہنوں سے زیادہ اسی بیماری میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ کیسی ہمدرد سہیلی تھی! مگر مریض کے منہ سے جب وہ ایک سودا ہی سہی کی رٹ سنتی تو نگہت کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ گھر لوٹتے وقت تانگے کے پہیے ایک ہی آواز نکالتے۔ وہ بہت کوشش کرتی کہ اپنی توجہ اور طرف پھیرے مگر تانگے کے پہیے ایک ہی بات کہتے: "ایک سودا ہی سہی ..... سودا ہی سہی ..... سودا ہی سہی"

وہ اسی آواز کو سنتی رہتی۔

اوپندر ناتھ اشک

لیرنجائیٹس

جب ہندی منتری نے 'پردھان' کا نام 'پرشادرت' کیا اور اردو منتری نے اس کی تائید کی تو صاحبِ صدر کرسی پر آبراجے۔ ایک لمحہ کی سکوت کے بعد شعرا کی فہرست ہاتھ میں لے کر پہلے شاعر کا نام پکارتے ہوئے انہوں نے بے ساختہ اردو میں کہنا شروع کیا۔ "اب میں جناب اچنت بہادر سنگھ سے درخواست کروں گا۔ . . . . . کہ اچانک ان کی نظر شاعر کے نام کے آگے لکھے ہوئے لفظ ہندی پر گئی اور کچھ اٹک کر انہوں نے اپنا جملہ یوں ختم کیا۔۔۔۔ کہ . . . . کہ . . . . . . وہ اپنی کویتا آپ پتر دل کے سمکش پرستت کریں۔"

ایک پتلا دبلا سا نوجوان چشمے کو ناک کے بانسے پر درست کرتا ہوا مائک کے سامنے آ بیٹھا۔

پروفیسر نیاز کندھائے پوری نے کرسی پر پہلو بدلا۔ اپنی بیاض میں ایک انگلی رکھ کر انہوں نے اسے پل بھر کے لئے بند کر دیا۔ اور گردن ذرا آگے کو بڑھا کر کویتا سننے لگے۔

لیکن پروفیسر صاحب کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ اچنت بہادر "نوین لیکھک سماج" کے پردھان منتری تھے لیکن کویتا ہندی اور عموماً مشکل ہندی میں کرتے تھے۔ فہرست کے مطابق ان کو آٹھویں نمبر پر نظم پڑھنا تھی۔ لیکن مشاعرے کا وقت کب کا ہو چکا تھا، طلباء بے صبر ہو رہے تھے اور ابھی تک شری اچنت بہادر کے علاوہ صرف ایک اور ہندی شاعر آیا تھا۔ اردو میں بھی پروفیسر نیاز کندھائے پوری کے سوا بقیہ سب غائب تھے۔ اس لئے انہوں نے پہلے خود ہی اپنی نظم پڑھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کی خواہش کے مطابق صدر نے ان کے نام کا اعلان کر دیا تھا۔

شری اچنت بہادر مائک کے سامنے آ تو گئے لیکن اس جلدی میں طے نہ کر پائے کہ کون سی کویتا پڑھیں۔ لڑکے ہال میں آ آ جا بیٹھ بیٹھا رہے تھے شور مچا رہے تھے۔ لیکن شری اچنت بہادر کو کچھ بھی نہ سوجھ رہا تھا۔ وہ اشاریت پسند پسندِ شاعر تھے۔ ایک بار پڑھ کر یا سن کر ان کی کویتا کو سمجھ لینا قارئین یا سامعین کے لئے دشوار تھا۔ یہ بات نہیں کہ انہوں نے آسان نظمیں نہ لکھی تھیں۔ کئی لکھی تھیں۔ لیکن اس عجلت میں وہ سوچ نہ پا رہے تھے کہ ان میں سے کون سی پڑھیں جو آسان ہو، برمحل ہو اور جسے سن کر سامعین بے ساختہ تالیاں پیٹ اٹھیں۔ جلدی میں انہوں نے اپنی کویتا "وام دشا" پڑھنی شروع کی۔

نیاز کندھائے پوری نے ایک بار غور سے سنا۔ ان کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ نظم چل رہی تھی۔

واوں واوں واوں دشا۔
سماں ساین آ - ای
پرشٹ پوم تپلہ شیر، پانیو
پانیو
پرشٹ کار چین پرین، چین پرین۔
پان پین
پان پین
پانیو
واوں واوں واوں دشا
سماں سائیں آ - ای

کچھ یہی آواز نیاز کندھائی پوری کے کانوں میں پڑتی رہی۔ بیزاری سے سر کو جھٹکا دے کر انہوں نے اپنی بیاض پھر کھول لی۔ دوسرے ہی نمبر پر ان کی باری آ جائے گی اس کا امکان نہ تھا۔ اس لئے بقیہ نظم سننے کا موہ چھوڑ کر، دل ہی دل میں وہ اپنی نظم کا ریہرسل کرنے لگے۔

نیاز کندھائے پوری اردو کے مشہور شاعر تھے۔ چند دن کے لئے

٥ تجویز - ٥ کہ وہ اپنی نظم آپ دوستوں کی خدمت میں پیش کریں

الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ بنک روڈ پر اپنے ایک پروفیسر دوست کے ہاں مقیم تھے۔ جب "نوین لیکھک سماج" کے اردو سیکرٹری کی طرف سے انہیں دعوت نامہ ملا تھا تو وہ بڑے چکرائے تھے۔ مشاعرہ "نوین لیکھک سماج" کی طرف سے تھا۔ اس میں ہندی، اردو دونوں زبانوں کے شعرا شرکت کر رہے تھے لیکن مشاعرے کا مقصد سیلاب زدگان کی امداد تھا۔ اور یہ امداد "ساہتیہ سنستھان" نامی کسی انجمن کی طرف سے دی جا رہی تھی۔

یہ "ساہتیہ سنستھان" کیا بلا ہے۔ یہ بات وہ دعوت نامہ پڑھ کر سمجھ نہ پائے تھے۔ انہوں نے دو تین بار اسے پڑھا اور دماغ پر زور ڈالا۔ تو معلوم ہوا کہ لفظ "ساہتیہ" تو کہیں انہوں نے سنا ہے۔ اس کے معنے ہوتے ہیں ادب اور سنستھان۔ اس کا مطلب انہوں نے اٹکل پچو "سبھا" لگا لیا اور یہ سب مطلب لگانے کے بعد وہ اور بھی چکرائے۔

سوچنے لگے کہ انہیں اس مشاعرے میں کون سی نظم پڑھنے کو لے جانی چاہیے۔ اگر مشاعرہ محض "نوین لیکھک سماج" کی طرف سے ہوتا تو کوئی فکر نہ تھی۔ ان کے پاس کئی ایسی نظمیں تھیں جنہیں نئے نقادوں تک نے بھی پسند کیا تھا اور جن کی تعریف کئی مضامین میں ہو چکی تھی۔ لیکن مشاعرہ کسی ادبی انجمن کی طرف سے سیلاب زدہ لوگوں کی مدد کے لئے ہو رہا تھا۔ یہ ادبی انجمن کیسی ہے؟ اس میں کیسے ادیب شامل ہیں؟ صرف ہندی کے ہیں یا اردو کے بھی؟ ہر طرح کے ہیں پرانے، ادر ترقی پسند؟ — اس سلسلے میں انہیں کوئی علم نہ تھا۔ "پھر وہ کیسی نظم لے جائیں" انہوں نے سوچا — "مصیبت زدوں کی امداد کے لئے تو یہاں کنسرٹین بھی ہوتی ہیں، ناچ گانا بھی ہوتا ہے۔ اگر رومانی شعرا بھی مشاعرے میں آئے اور انہیں کسی رومانی شاعر کے بعد نظم پڑھنے کو کہا گیا تو کسی پیاری پیاری میٹھی میٹھی رومانی نظم کے بعد جو عام طلبا کو پسند ہوتی ہے وہ کیسے رنگ جما پائیں گے"۔

اس کے علاوہ نیاز صاحب کے تذبذب کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ یہ مشاعرہ یونیورسٹی یونین کے ہال میں ہو رہا تھا۔ نیاز صاحب کو الہ آباد کے طلبا کا قطعی تجربہ نہ تھا۔ وہ پنجاب کے طلبا کی نبض پہچانتے تھے جو سوٹ بوٹ میں لیس ہو کر آتے تھے۔ اور بڑے بڑے شعرا کو اکھاڑنے میں لطف لیتے تھے۔ انہیں رام کرنے کے لئے مذاحیہ رنگ یا گلے بازی کی ضرورت تھی۔ وہ دلی کے طلبا کو جانتے تھے۔ جو بھلے چنگے لباس میں ہوتے اور بھلے چنگے جذبات کے ساتھ مشاعرے میں آتے۔ وہ علی گڑھ کے طلبا سے بھی واقف تھے جن کی شیروانیاں اور پائجامے اور شعر سنتے ہی کرسی سے اٹھ اٹھ کر داد دینا انہیں یاد تھا۔ ان مجلسوں میں کیسی نظم یا غزل پڑھنی چاہئے یہ انہیں خوب معلوم تھا لیکن الہ آباد کے طلبا سے وہ قطعی ناواقف تھے۔ صبح وہ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کہ ان کے دوست سے ایک نوجوان ملنے آیا۔ معمولی کرتہ پائجامہ پہنے ہوئے۔ وہ کسی کھاتے پیتے گھر کا معمولی نوکر معلوم ہوتا تھا۔ تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ ایم۔ اے کا طالب علم ہے۔ اور یہ حال اس کا نہیں عام طلبا اور پروفیسروں کا یہی حال تھا۔ ان کے لباس کو دیکھ کر معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کسی یونیورسٹی سے ان کا تعلق ہے۔ — تو کیا ایسے سیدھے لیکن ذہین اور "ادب" طلبا کے سامنے وہ کوئی سنجیدہ نظم پڑھیں — سنجیدہ، افادی اور با مقصد!

نیاز کندہ لائے پوری کچھ بھی طے نہ کر پائے تھے۔ آخر بڑے غور و خوض کے بعد انہوں نے یہی طے کیا تھا کہ وہ ساری بیاض ساتھ لے چلیں۔ وہاں جیسا موقع دیکھیں ویسی نظم پڑھیں۔

شری اچنت بہادر کوتا پڑھ چکے تھے۔ سٹیج سے لگی ہوئی ایک دری بچھی تھی جس پر پائجامہ قمیص یا کرتا۔ دھوتی پہنے کچھ طلبا بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سڑک پر سیر کرتے کرتے یا اپنے ہوسٹلوں کے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے وہ اٹھ کر مشاعرے کا لطف لینے چلے آئے تھے لیکن دری ابھی کافی خالی تھی۔ صاحب صدر نے پیچھے بنچوں پر اور دروازوں میں کھڑے طلبا سے کہا کہ وہ آگے آ کر بیٹھ جائیں۔ پھر انہوں نے دوسرے شاعر کا نام پکارا۔

نیاز کندہ لائے پوری نے ایک بار دری پر بیٹھے ہوئے ان طلبا پر نظر ڈالی۔ وہ اپنی نظم کے بارے میں ابھی تک کچھ بھی طے نہ کر پائے تھے۔ اپنی بیاض میں لکھی ہوئی وہ نئی نظمیں انہوں نے دل ہی دل میں پڑھ ڈالی تھیں۔ ایک میں انہوں نے ان دنوں کا ذکر کیا تھا جب انہیں پہلی بار محبت ہوئی تھی۔ اور اپنی محبوب سے دریافت کیا تھا کہ اگر شاعر کی زندگی اس کی زلفوں کے سائے میں گذر سکتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ دوسری نظم میں ایکٹر دو رعورت کے جذبات بیان کئے گئے تھے۔ رومان اور حقیقت کا امتزاج اس نظم میں انہوں نے نہایت خوبصورتی سے کیا تھا۔

طلباء ابھی تک اُٹھ بیٹھ رہے تھے۔ دوسرا شاعر کیا پڑھ گیا۔ نیاز کنندھائے
پوری اچھی طرح نہ سمجھ پائے۔ اپنی نظم کو انہوں نے ایک بار پھر پڑھ لیا۔ ابھی
تیسرے نمبر پیا گر انہیں بلا لیا جائے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا — تو
وہ ایسا رنگ باندھ دیں کہ واہ! اور دوسرے شاعر کے جانے پر وہ حسرت
بھری نظروں سے صدر کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اُن کو بلانے کی بجائے
صاحبِ صدر خود مائک کے سامنے آ گئے۔

ہوا دراصل یہ کہ ایک ہی شاعر ابھی تک نہ آیا تھا۔ اور صدر صاحب
سوچ رہے تھے۔ کہ اگر نیاز صاحب کو بھی وہ بلا لیں گے تو ان کے بعد کون پڑھیگا
اس لئے مائک کے سامنے آ کر انہوں نے کہا کہ ابھی ایک دن پہلے پاکستان کے
ایک اردو اخبار سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ اُردو کے مشہور رُومانی شاعر جناب
اختر شیرانی کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر دینے کے بعد انہوں نے اختر شیرانی کی
ایک نظم سنانی شروع کی۔

نیاز صاحب نے یہ سب نہیں سنا۔ اختر شیرانی کا نام سنتے ہی
انہوں نے تیزی سے اپنی بیاض کی ورق گردانی شروع کی اور ایک نظم
ڈھونڈھ نکالی۔ جو انہوں نے اس زمانے میں لکھی تھی جن دنوں اُردو
میں رومانی شاعری کا زور تھا۔ ان کی نظم کا عنوان تھا:۔

مجھے تو کچھ انہیں بیمار آنکھوں سے محبت ہے۔

ایک زمانے میں یہ بڑی زوردار نظم سمجھی جاتی تھی۔ مشاعرے اس
کے ترنم سے گونجا کرتے تھے۔ جتنے عرصہ میں صاحب صدر اختر شیرانی کی
خوبیوں پر تقریر کرتے رہے۔ نیاز صاحب اس نظم کو دل میں دہراتے
رہے۔ جب صدر نے اختر کی ایک رومانی نظم پڑھنی شروع کی۔ تو نیاز
صاحب اپنی نظم کو پوری طرح حفظ کر کے پڑھنے کے لئے بالکل تیار تھے
لڑکے اپنی اپنی سیٹوں پر جم چکے تھے۔ ہال میں صدر کی آواز گونج رہی تھی۔
اور اختر شیرانی کی نظم کا جادو اپنا رنگ لا رہا تھا۔ نیاز صاحب سوچ رہے
تھے کہ اس [illegible] ماحول میں جب [illegible] اپنی نظم پڑھیں گے۔ تو کس
طرح جادو کی فضا کو اور بھی گہرا کر دیں گے۔ اور کس طرح ان کی نظم طلباء
کے دل پر نقش ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے بعد خواہ کوئی کوی یا شاعر آئے
اسے وہاں سے نہ مٹا سکے گا۔ اور جب نوجوان طلبا اپنے اپنے بستروں پر
جا لیٹیں گے اور باہر چودھویں کا چاند چاندی کی مسلسل بارش کر رہا ہوگا
تو اُن میں سے ہر ایک دل ہی دل میں گنگنا اٹھے گا۔

مجھے تو کچھ انہیں بیمار آنکھوں سے محبت ہے۔

لیکن صاحبِ صدر نے اختر شیرانی کی نظم ختم کر کے ایک لمحے کے لئے
اِدھر اُدھر دیکھا۔ سیکرٹری نے ان کے آگے ایک پرچہ بڑھایا۔ ان کا چہرہ چمک
اُٹھا اور انہوں نے جو نام پکارا وہ نیاز کنندھائے پوری کا نہیں۔ بلکہ کنہی
چوبے جی کا تھا۔

نام سنتے ہی ایک لحیم شحیم نوجوان سٹیج پر آیا۔ اس نے مائک کی پروا نہیں
کی اور ہال کے آخری بنچ تک پہنچنے والی اپنی آواز میں اس نے ایک 'مارچ گیت'
سنانا شروع کیا۔

نیاز صاحب کو صدر کی اس حماقت پر سخت غصہ آیا۔ لیکن چوبے جی کا
"مارچ گیت" ہال میں گونج رہا تھا۔ اور لڑکے تال دے رہے تھے۔ اس کے
بعد ان کی — بیمار آنکھوں سے محبت — کیا جچے گی — نیاز
صاحب نے سوچا اور وہ جلد جلد اپنی بیاض کے اوراق الٹنے لگے۔ یکایک
ان کا چہرہ چمک اُٹھا۔ وہ مارا! انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اپنی بیاض
میں انہیں ایک مارچ گیت لکھا ہوا مل گیا تھا۔ جو انہوں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں
کانگرس تحریک پر لکھا تھا۔ گیت یوں تھا:۔

چلو چلو
بڑھو بڑھو
کہ آج دیش کی پکار میں بلا کا زور ہے۔
کہ آج خامشی کے دل میں بے پناہ شور ہے۔
جو زلزلے زمین میں سو رہے تھے آج اُٹھ پڑے۔
جو زلزلے کہ کسمسا رہے تھے آج اٹھ پڑے۔
ان زلزلوں کے ساتھ آج تم بھی قدم باندھ لو۔
چلو چلو۔
بڑھو بڑھو۔

دیش تو آزاد ہو گیا تھا اس لئے اس گیت میں لفظ 'دیش' انہیں
کھٹکا۔ اس کے بدلے میں فوراً انہوں نے 'کھیت' کر دیا۔ کھیت تو ابھی آزاد
نہیں۔ ان پر تو ابھی زمینداروں کا قبضہ ہے۔ کھیت کی پکار، کسانوں کی
پکار، زمین میں سوئے ہوئے زلزلے 'واہ! کیسی چیز بن گئی'۔ اور انہوں نے

جلد جلد اسے دل ہی دل میں دہرا لیا۔

چلو، چلو

بڑھو بڑھو

کہ آج گیت کی پکار میں بلا کا زور ہے۔

کہ آج خامشی کے دل میں بے پناہ شور ہے۔

جو زلزلے زمیں میں سو رہے تھے آج اٹھ پڑے

جو زلزلے کہ کنمنا رہے تھے آج اٹھ پڑے۔

ان زلزلوں کے ساتھ تم بھی آج قدم باندھ لو

چلو چلو

بڑھو بڑھو

نظم دہرا کر نیاز صاحب نے عالمِ تصور میں دیکھ لیا کہ کس طرح انہوں نے چوبے جی کے اس مارچ گیت کو اٹھا کر ہال کے باہر پھینک دیا ہے۔

لیکن پردھان جی نے چوبے جی کے بعد رہبر صاحب کا نام لیا۔ اور طلباء نے زور زور سے تالیاں بجا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

رہبر صاحب مقامی شاعر تھے۔ ان کی نظم تو کچھ ایسی عظیم نہ تھی لیکن ان کی آواز میں بلا کا نغمہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ مٹھاس کی ایک ندی بہ رہی ہے۔ اور سامعین اس کے ساتھ بہے جا رہے ہیں۔ نظم ملک کی موجودہ حالت پر تھی لیکن شاعر اس میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ یہ شاید کوئی بھی سن یا سمجھ نہ رہا تھا۔ جیسے سانپ بین کے گیت کو سمجھے بغیر اس کی آواز یا حرکت پر جھومتا رہتا ہے۔ ویسے ہی طلبا بھی نظم کے پیچ و خم کو سمجھے بغیر جھومے جا رہے تھے۔ نظم طویل تھی۔ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لیکن سامعین چاہتے تھے۔ کہ وہ بڑھتی چلی جائے اور رہبر صاحب کی شیریں آواز انکے کانوں میں متواتر رس ٹپکاتی رہے

نیاز صاحب اس آواز کو سن کر متفکر ہو گئے۔ اگر رہبر صاحب کے بعد ان کی باری آ گئی تو رس میں ڈوبے ہوئے کانوں کو تو دوسری کوئی بھی آواز کرخت معلوم ہو گی۔ انہوں نے اپنی ساری بیاض پھر ایک بار جلد جلد پلٹ کر ایک نئی نظم نکالی۔ جو ملک کی موجودہ حالت کی ہو بہو ترجمانی کرتی تھی پھر اسے پڑھ کر طے کیا کہ وہ موسیقی کے اس سحر کو توڑنے کیلئے وہ کس ڈرامائی انداز میں اسے پڑھیں گے۔ کس کس مصرع پر زور دیں گے۔ کس کس مصرع کو دوبارہ پڑھیں کس کس کی طرف طلبا کو خاص طور پر متوجہ کریں گے۔ انہوں نے تصور کیا کہ کہاں کہاں انہیں داد ملے گی۔ اور کہاں کہاں وہ اس داد کے جواب میں سر جھکا کر، لبوں پر ہلکا سا تبسم پیدا کر کے ہاتھ کو سر کی طرف لے جاتے ہوئے بے حد انکسار کے ساتھ آداب عرض کہیں گے۔

رہبر صاحب کے جانے پر سامعین ایک اور ایک اور کا شور مچا رہے تھے۔ اور نیاز صاحب کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا کہ صدر نے کہیں ڈاکٹر صاحب کا نام لیا۔ سامعین کے اس شور میں نیاز صاحب نے عیاں طور پر دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ ہندی کی کچھ رباعیاں سنائیں گے۔

رباعیاں! نیاز صاحب کے ذہن میں اپنی کئی رباعیاں چکر کاٹنے لگیں۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب ایک ہی رباعی پڑھ کر (جو لڑکوں کے اس شور میں کسی نے نہیں سنی) پھر اپنی جگہ جا بیٹھے تو نیاز صاحب نے لحظہ بھر میں طے کیا کہ اگر ان کا نام پکارا گیا تو اپنی کسی رباعی سے شروع کریں گے۔ اور اس طرح اپنا رنگ جما کر کون سی نظم پڑھیں گے۔ لیکن صدر نے ایک دوسرے اُردو شاعر کا نام پکارا جس نے سامعین کے زور دینے پر اپنی مشہور نظم "جواب اس کا کون دے" پڑھنی شروع کی۔ جو اُس نے مہاتما گاندھی کے قتل پر لکھی تھی۔ نظم چل رہی تھی —

جواب اس کا کون دے۔

کسے اب اتنا ہوش ہے۔

کہ آج ہند کس کے سوگ میں سیاہ پوش ہے۔

اور نیاز صاحب جلد جلد بیاض کے ورق الٹ رہے تھے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کے قتل پر دس نظمیں لکھی تھیں۔ جو بہت مقبول ہوئی تھیں وہ ابھی طے ہی کر رہے تھے کہ اگر انہیں بلایا جائے۔ تو اُن میں سے کون سی نظم پڑھیں کہ وہ صاحب چلے گئے اور ایک دوسرے صاحب آ کر پنجاب کی تقسیم اور تباہی پر نظم پڑھنے لگے۔

پنجاب کی تباہی تو نیاز صاحب نے دیکھی نہ تھی۔ لیکن انہوں نے اس تباہی کی نشکار ایک دوشیزہ کی بے بسی کا نہایت دردناک خاکہ ایک نظم میں کھینچا تھا۔ دقت یہ تھی وہ نظم انہوں نے کسی مشاعرے میں آزمائی نہ تھی۔ ہاں دوستوں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ اور خواتین کی ایک مجلس میں اسے سن کر ایک خاتون کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ لیکن صدر نے ان کو نہیں

بلایا بلکہ کبھی کبھی "شوخ صاحب" کا نام لیا۔

نیاز صاحب کا خیال تھا کہ شوخ کے بھیس میں کوئی کالج کا چھوکرا اپنی مزاحیہ نظم سنائے گا۔ لیکن شوخ کی جگہ ایک پچپن ساٹھ سال کے بوڑھے کھوسٹ حضرت سٹیج پر کچھ اس انداز میں نمودار ہوئے کہ ان کی صورت دیکھتے ہی ہال میں زبردست قہقہے پڑنے لگے۔ سامعین کی طرف سے بے پرواہ، مائک کو داہنے ہاتھ سے ہٹا کر کرسی کو کچھ اور آگے کھسکا کر اور کچھ اس طرح ہاتھ پیر ہلا کر انہوں نے ایک رباعی پڑھی کہ سننے بغیر ہی "واہ واہ" کہتے اور قہقہے لگاتے ہوئے طلبا، کرسیوں پر سے اچھل پڑے۔ اس سے غضبناک ہو کر اور بھی شدت سے گرجتے ہوئے اور کچھ عجیب انداز سے کرسی پر تقریباً قلابازی کھاتے ہوئے شوخ صاحب نے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا کہ شعر کو سمجھنے کے لئے "دل" چاہئے۔ لیکن حاضرین کے پاس اس وقت صرف "آنکھیں" تھیں۔ اس لئے "واہ!" "کیا کہنے ہیں!" "آپ ہی کا حصہ ہے!" کہتے ہوئے وہ قہقہے لگانے لگے۔

اس وقت نیاز صاحب نے دیکھا کہ صاحبِ صدر ہاتھ جوڑ کر ان بزرگ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ اور وہ بزرگ آنکھیں دکھلاتے ہوئے سٹیج پر سے اتر رہے ہیں اور لڑکے قہقہے پر قہقہے لگا رہے ہیں۔

نیاز صاحب کا دل یہ سوچ کر دھڑکنے لگا کہ کہیں صاحبِ صدر ان کا نام نہ پکار دیں۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو قابو میں لانے کے لئے انہوں نے مارچ گیت سنانے والے چوبے جی کو بلایا۔

چوبے جی نے سٹیج پر اترتے ہی اعلان کیا کہ وہ سامعین کو ایک دوسرا مارچ گیت سنائیں گے۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے مائک کو ہٹاتے ہوئے، پنچم میں، اپنی آواز اٹھائی کہ پچھلی بنچ پر بیٹھے ہوئے کسی منچلے نے ان کی آواز کے ساتھ عین مین آواز ملاتے ہوئے پنچم ہی میں اس طرح کیں۔ یں۔ یں کی کہ سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد ان حضرت نے داہنے ہاتھ کی مٹھی ہلا ہلا کر کیا سنایا یہ نیاز صاحب مطلق نہ سمجھے۔ وہ ہال کے مختلف گوشوں سے بلند ہوتی ہوئی بھانت بھانت کی آوازیں سنتے رہے۔ آخر الہ آباد کے طلبہ شعرا کا مذاق اڑانے میں پنجاب یا علی گڑھ کے طلبا سے کس طرح مختلف نہ تھے۔ اپنی بیاض اور اس میں لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں کو بھول کر نیاز صاحب بھی سامعین کے ساتھ چوبے جی کی پریشانی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جب اپنا مارچ گیت ڈبل مارچ سے ختم کر کے چوبے جی نہایت ناراض ہو کر طلبا کو اپنے پیچھے قہقہے لگاتے ہوئے چھوڑ کر سٹیج ہی سے نہیں بلکہ ہال سے مارچ کر گئے۔ تو یکایک صاحبِ صدر نے جناب نیاز کندھائے پوری کو سٹیج پر "تشریف لانے" کی دعوت دی۔

نیاز صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔

قریب ہی دری پر بیٹھے ہوئے کسی طالب علم نے دریافت کیا۔ "کون پوری؟"

اور جب جناب صدر نے مائکروفون پر جواب دیا "کندھائے پوری" تو کسی نے زور سے قہقہہ لگایا —— "کندھائے پوری کیا نام ہے۔ واہ!"

نیاز صاحب کے ذہن سے ان کی تمام نظمیں، غزلیں، رباعیاں رفو چکر ہو گئیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک عجیب دھندلکا سا چھا گیا۔ انہوں نے وہیں اپنی کرسی پر کھڑے کھڑے گلے کی طرف اشارہ کیا۔

صدر نے سکرٹری کو ان کی طرف بھیجا۔

نیاز صاحب کے دماغ نے سمجھایا "کہدو میرا گلا خراب ہے" اور انہوں نے سیکرٹری صاحب سے گلے کی طرف بدستور اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا گلا خراب ہے۔ سیکرٹری حیران نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹہ قبل جب وہ انہیں بلانے گیا تھا تو اس نے انہیں کے منہ سے آدھ گھنٹہ تک ان کی نئی نظمیں سنی تھیں۔ یہاں تک کہ سنتے سنتے اکتا گیا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا بات ہے"

بجلی کی سی تیزی سے نیاز صاحب کے دماغ میں حفاظتی کونسل میں ہندوستان کے نمائندے گوپال سوامی آئنگر کا جملہ گھوم گیا۔ جو انہوں نے اسمبلی کے آگے تقریر کرنے میں اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ نیاز صاحب نے انہیں کا فقرہ دہراتے ہوئے کہا۔ "مجھے لیرنجائٹس (Laryngitis) ہو گیا ہے۔" لیکن یہ بات گھبراہٹ میں انہوں نے اتنے زور سے کہی کہ صاحبِ صدر مسکرا دئیے۔ اور انہوں نے مائک میں کہا —— "ہمیں افسوس ہے کہ آپ لوگوں کے موڈ کو دیکھ کر جناب

(بقیہ برصفحہ ۱۲۸)

بلونت سنگھ

اعتراف

بیمار خاوند کے پلنگ کے قریب بچھی ہوئی آرام کرسی پر دراز شاہدہ آنکھیں موندے اپنے خیالات میں گم تھی۔

بظاہر مریض کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کہ آیا نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند تھیں یا وہ واقعی سو گیا تھا یا قطعاً بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے حساس نتھنوں کو جنبش تک نہیں ہو رہی تھی۔ سانس کم کم اور نامعلوم طریقے سے آ رہی تھی۔ اس کی ناک بہت پتلی تھی۔ پتلی ناک خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن وہ ضرورت سے زیادہ پتلی تھی۔ جیسے شکنجے میں دبا دی گئی ہو۔ نتھنے روٹی کے پردے کے مانند باریک۔ وہ ہر وقت سرخ، نمدار اور متحرک رہتے تھے۔ نتھنوں کے اندرونی حصے بالوں کی فراوانی کے باعث بالکل سیاہ دکھائی دیتے تھے۔ جو بال نتھنوں سے باہر نکل آتا اسے چمٹی سے نوچ کر پرے پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ کئی روز سے بیمار تھا۔ ڈاکٹر سمجھ چکے تھے۔ کہ مریض کا بچ جانا ناممکن ہے۔ لیکن مریض کی حسین اور جوان بیوی پر یہ راز افشا کرنے کا انہیں حوصلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

شاہدہ شب و روز خاوند کی تیمارداری کیا کرتی۔ چوبیس گھنٹوں میں اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں موہوم سی چمک صرف اسی وقت پیدا ہوتی تھی جب رات کے دس بجے کے قریب اسے سیٹی کی ہلکی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ اسے اس سے محبوب کی آمد کی اطلاع مل جاتی تھی۔ شوہر کے بیمار ہونے سے پہلے بھی ـــــ پچھلے چند مہینوں سے اس کا یہی معمول ہو گیا تھا۔ سارا دن ان چند کیف انگیز لمحوں کی یاد میں بیت جاتا تھا۔ اگر کبھی ناغہ ہو جاتا تو اس کا دم گھٹنے لگتا اور جان لبوں تک آ جاتی تھی۔

کل رات بھی اس کا محبوب ایک روز کے ناغے کے بعد آیا تھا۔

اور وہ دل ہی دل میں "بے پروا! ظالم!! بے پروا! ظالم!!" کی رٹ لگا رہی تھی۔ کہ باہر سے سیٹی کی آواز آئی۔۔۔۔۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ جب کبھی ناغہ ہو جاتا تو وہ یہی سمجھتی تھی کہ اب اس کا محبوب کبھی نہیں آئے گا۔۔۔۔ سیٹی کی آواز سے گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔

باہر رات پرسکون اور ہوا خنک تھی۔

تاروں کی مدھم روشنی میں شاہدہ کی صورت پھیکی پڑتی ہوئی تصویر کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ برآمدے کے سفید چوبی جنگلے پر بیٹھ گئی۔ اور لان کے پرلے سرے پر اُگے ہوئے چیڑ کے درختوں کے گھنے سائے کی جانب گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ اس کے بکھرے ہوئے گھنے اور سیاہ بال کالی گھٹاؤں کی طرح چاند سے مکھڑے کو گھیرے ہوئے تھے۔ آنکھیں خشک اور کھوئی کھوئی سی بھرے بھرے ہونٹوں پر بے کیفی کی تہ سی جم گئی تھی۔ بہ ہزار دقت وہ زبان نکال کر ہونٹوں پر پھیر لیتی تھی۔

اتنے میں بجری کے چٹخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دفعتاً اس کا محبوب آتا دکھائی دیا۔ لان سے ہٹ کر وہ بجری بچھی روش پر چل رہا تھا۔ قدم بہ قدم۔۔۔۔ اس کی عمر بمشکل اٹھارہ یا انیس برس کی ہوگی۔ اس نے ٹھوڑی پر استرا پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مونچھیں جن کی حقیقت نرم و نازک رُوؤں کے سوا کچھ نہیں تھی۔ ابھی سلامت تھیں۔ شاہدہ عمر میں اس سے چھ سات برس بڑی تھی۔ لیکن نازک اندام ہونے کی وجہ سے اس کی ہم عمر ہی دکھائی دیتی تھی۔ نوجوان کی صورت سے مردانگی کے بجائے لڑکپن کا الھڑپن زیادہ عیاں تھا۔ چہرا اس قدر بھولا تھا۔ گویا مُنہ میں دانت ہی نہیں ہیں۔

اس نے آتے ہی شاہدہ کا ننھا ننھا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تنگ چولی کے دامن میں عورت کا سینہ مچلنے لگا۔ اس نے شکایت کرنی چاہی کہ آخر اس نے ایک رات کا ناغہ کیوں کیا۔ لیکن

ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"تم اداس ہو" نوجوان نے سرگوشی میں پوچھا۔

"نہیں تو" شاہدہ کے لبوں سے آہ سی نکل گئی۔ اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بے کیفی کی تہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہونٹوں کی شادابی ختم ہوتی جا رہی تھی۔

وہ آہستہ سے ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں مسرت، رنج، یا شرارت کا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ لیکن یہ بے معنی ہنسی بھی نہیں تھی۔ یہ الہڑپن کی ہنسی تھی۔ بہارِ زندگی کی ہنسی تھی۔ جوانی ہنسا ہی کرتی ہے۔ پھر اس نے بند ہاتھ کھول دیئے۔ اور اس میں چھپا ہوا عورت کا نسبتاً اجلا ہاتھ خرگوش کے ننھے بچے کے مانند کسمسانے لگا۔

شاہدہ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے جواب سے محبوب مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس نے بھرّی ہوئی آواز میں کہا۔ "چار روز سے سوئی نہیں۔ کبھی دو گھڑی کو آنکھ لگ بھی گئی تو کیا۔ شاید جاگنے کی وجہ سے چہرہ اتر گیا ہوگا۔ یوں بھی بے حد تکان محسوس کر رہی ہوں . . . . . ." یہ کہہ کر وہ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے گئی۔ پھر اس نے سر پیچھے کے جانب جھٹکا دیا جیسے گردن کو جھٹکا دے کر اس کی ساری تکان دور کر دینا چاہتی ہو۔ اس کے آنکھوں کے پپوٹوں پر سوجن آ گئی تھی۔

"تم سو لیا کرو"۔

یہ سن کر عورت نے اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ یہ "سو لیا کرو" میں خود غرضی کی جھلک تھی۔ نوجوان نے محسوس کیا کہ اسے اس طرح نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ یہ خود غرضی ہی نہیں بلکہ سنگدلی تھی۔ کہ خاوند بیمار ہو۔ اور عورت مزے سے پڑی سویا کرے۔ شاہدہ اس قسم کے جذبات کا اظہار پسند نہیں کرتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ ایسی عاشقانہ محبت جیسے وہ نوجوان اس کا عاشق نہیں بلکہ معشوق ہو۔ بعض اوقات اظہارِ محبت کرنے میں وہ خود بڑی گرمجوشی سے پہل کرتی تھی۔ وہ رخصت ہونے لگتا تو اس کے بازو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیتی اور کہتی "نہیں۔ نہیں ابھی نہیں۔ ذرا تو رک جاؤ . . . . . . آں! اور پھر وہ محبت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے لپٹ جاتی . . . . . . اس کی گرمجوشی کے مقابل اس کی اپنی محبت پھیکی نظر آنے لگتی — اور جب کبھی وہ ایک روز کے ناغے کے بعد آتا تو اس کی بے قراری وحشت سے کم نہیں ہوتی تھی "کل تم کیوں نہیں آئے؟ غالباً تمہیں یقین ہوگا کہ ناغہ کرنے کے بعد آؤ گے تو مجھے بدستور زندہ سلامت پاؤ گے۔ آں؟ کہو۔ کہو۔ لیکن یاد رہے — میں تمہیں خبردار کئے دیتی ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔" پھر وہ اس کے سارے چہرے کا بھوکی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہتی "میں ڈرتی ہوں . . . . کسی روز تم ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے دور چلے جاؤ گے اور پھر لوٹ کر نہیں آؤ گے . . . . تمہاری راہ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرا جائیں گی . . . . بالآخر میں مر جاؤں گی"۔

یہ الفاظ — بلند بانگ دعوے — یہ بنے بنائے گھڑے گھڑائے الفاظ — جنہیں کہنے پر شاہدہ مجبور سی ہو جاتی تھی . . . . . . وفورِ جذبات کے مقابل الفاظ کی کم مائیگی پر شاہدہ کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ لیکن بیشتر اس کے کہ آنسو بھر آئیں آنکھوں کی نمی چوس لی جاتی۔

شاہدہ کی محبت اور وارفتگی کے باوجود نوجوان اپنے دل کے حال سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ خود اس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکا تھا۔ وہ اس سے ہر بات کی جواب طلبی نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ اس کی ہر حرکت پر نقطہ چینی ہی کرتا۔ کئی باتیں اس کی عقل کے حدود سے باہر تھیں لیکن اسی نے شاہدہ کو ان کی وضاحت کرنے کے لئے کبھی نہیں کہا تھا۔ وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں کے شاہدہ اپنے خاوند سے گہرا لگاؤ اس کی سمجھ سے باہر ہی رہا۔ وہ ایک بچے کی ماں بھی تھی۔ اور پھر ایک غیر مرد پر عاشق تھی۔ ادھر خاوند سے بھی اس کا رشتہ قائم تھا۔ اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے اور دیگر ضروریات کی اسے خاصی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اسے ان سب باتوں کا علم تھا۔ پھر بھی اس نے کبھی استفسار نہیں کیا۔ مبادہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اسے شاہدہ سے دور رہنا پڑے۔ چنانچہ اس نے اس قسم کے سارے شکوک کو مدفون کر دیا تھا . . . . . . لیکن آج اس کی سوجی سوجی آنکھیں اور اس کا اترا اترا چہرہ دیکھ کر اس کے منہ سے اس قسم کے الفاظ نکل ہی گئے

لیکن وہ فوراً اپنی محبوبہ کی دلی کیفیت کو بھانپ گیا۔ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "نہیں شاہدہ! اپنا دل میلا مت کرنا۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا تم جانتی ہی ہو۔ مجھے اس معاملے میں کچھ کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ اگر تمہارے دل کو ٹھیس لگی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں ——— کیا فی الحقیقت ان کی طبیعت بہت خراب ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے تم انہیں ملازم کے سپرد کر دو۔ آخر اس بات کا امکان بھی تو ہے نا کہ رتجگے سے تمہاری طبیعت بھی علیل ہو جائے۔ ایسی شاندار صحت تو پہلے بھی کب تھی تمہاری کہ ان پدرپے بیداریوں کی متحمل ہو سکو۔"

شاہدہ کو اس کی باتوں سے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ آہستہ سے بولی "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہاری دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں۔ ..... لیکن ان کی ..... وہ واقعی بہت سخت بیمار ہیں۔ بخار ان کے سر کو چڑھ گیا ہے۔ رات کے وقت دو دو گھنٹے کے بعد دوا پلانی ہوتی ہے۔ اگر میں ہی سو رہوں تو انہیں دوا کون پلائے ..... بھلا نوکر کا کیا بھروسہ؟"

"درست ہے" کہکر نوجوان نے سر جھکا لیا۔

اس وقت وہ بھی اداس نظر آتا تھا۔ یا تو وہ حقیقتاً پریشان تھا۔ یا پھر شاہدہ کا بیمار خاوند کی اس قدر انہماک سے تیمارداری کرنا اس کے لئے سخ وہ ثابت ہو رہا تھا۔ شاہدہ نے کم و بیش یہی اندازہ لگایا۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ چہرہ جسے دیکھتے رہنے کی بھوک کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت اداس اور کھویا کھویا سا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا وہ جنگلے پر چڑھ کر برآمدے میں چلا آیا۔ شاہدہ نے خاموشی سے اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ آج اس کے ہونٹوں میں وہ گرمی وہ تڑپ نہیں تھی۔ پہلے وہ یہی سمجھی کہ کچھ دیر بعد حرارت پیدا ہو جائے گی لیکن جب اس کا وہی حال رہا۔ تو اس نے اپنا چہرہ قدرے پیچھے ہٹا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا "تم مجھ سے خفا ہو کیا؟"

وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ خوابناک نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے حیرت سے قدرے کھلے ہوئے ہونٹوں کے قریب اپنے ہونٹ لے گیا ——— شاہدہ ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند اس کی آغوش میں گر پڑی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ جدا ہو گئے۔ وہ زیادہ دیر تک رکنے سے معذور تھی۔

کمرے کو واپس آتے وقت اس نے بالوں کو انگلیوں سے ہموار کیا بار بار بغل گیر ہونے کی وجہ کپڑوں میں جو بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی۔ اُسے دُور کیا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بیمار خاوند کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

پچھلی رات کے یہ سارے واقعات فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ آنکھیں موندے موندے اس نے سوچنا شروع کیا کہ کہیں آج پھر وہ ناغہ نہ کر دے کہیں۔ حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا۔ لیکن وہ بچاری اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی ...... دفعتاً اس نے آنکھیں کھول کر ٹائم پیس کی جانب دیکھا ——— ابھی آٹھ بجے تھے۔ محض آٹھ ——— وہ دس سے پہلے تو کیا آئے گا۔

آنکھیں کھول لینے کے بعد اب انہیں بند کرنے میں تساہل سے کام لے رہی تھی۔ عجب کیفیت ہو گئی تھی اس کی۔ تپائی پر رکھے ہوئے سبز رنگ کے شیڈ والے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کمرے کی ہر شے جگمگا رہی تھی۔ یہاں تک کہ دواؤں کی رنگ برنگ کی شیشیاں بھی بڑی بھلی دکھائی دے رہی تھیں۔ البتہ مریض کے چہرے پر شیڈ میں سے چھن چھن کر سبز رنگ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہدہ کی نظر شوہر کے چہرے تک پہنچ کر رُک گئی۔ اس کا لمبوترا چہرہ۔ بڑا سا سر۔ دبی ہوئی کنپٹیاں۔ بھنویں ناک کے اوپر آن کر مل گئی تھیں۔ اس کے پتلے بے رس ہونٹوں کے اوپر مونچھیں کانٹوں کی طرح سیدھی کھڑی تھیں جسم دُبلا پتلا جلد چیپی اور لجلجی سی اپنے ننگے بدن اور شوہر کے عریاں جسم کے لمس کے احساس ہی سے شاہدہ کے دل میں کراہت سی پیدا ہونے لگی۔

پھر اس کی نگاہ سامنے کی میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر پر جا پڑی۔ یہ بہت پہلے کی تصویر تھی۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس تصویر کو بڑے انہماک سے دیکھا کرتی تھی۔ اسے اس صورت اور اس جسم سے محبت تھی ان دنوں اس کی جو سہیلی بھی اسے دیکھتی تو کہتی "شاہدہ! تجھ پر تو جوبن پھٹ پڑا ہے ری بھئی اللہ کرے تجھے شوہر بھی تیری ٹکر ہی

کاملے"۔

سہیلیوں کی اس قسم کی باتیں اسے پسند نہیں آتی تھیں۔ جوبن پھٹے پڑتا، کافر جوانی، قاتل نگاہیں، وغیرہ محاوروں ہی سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ ان باتوں پر سنجیدگی اور فلسفیانہ انداز میں غور کیا کرتی تھی وہ حسن کی تعریف سیدھے سادے الفاظ میں سننا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ اس بات کی خواہش مند بھی نہیں تھی کہ اس کا شوہر لازمی طور پر بے مثل حسن کا مالک ہو۔ وہ کہتی تھی کہ میں دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔

پھر گھر میں اس کی شادی کا چرچا ہوا۔ چند مہینے اسی چہل پہل میں گزر گئے۔ اور پھر شادی ہو گئی۔

پہلی رات کو وہ خاوند کے انتظار میں تن تنہا پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا خاوند رنڈوا ہے۔ خوبصورت بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ کب چاہتی تھی کہ وہ لازمی طور پر بانکا ترچھا جوان ہو۔ آخر ایسا محض اتفاق ہی سے ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب اس نے ایک رات شوہر کے ساتھ گزار لی تو اسے اپنی زندگی کے بھرپور ہونے کے احساس کے عوض عجیب کھوکھلا پن سا محسوس ہونے لگا۔ پہلی ملاقات بڑی مضحکہ خیز سی رہی۔ خاوند نے خاص التفات نہیں کیا۔ باتیں نہیں ہوئیں بس گھونگھٹ الٹ دینے کے بعد جب دونوں کی نظریں ملیں تو شاہدہ کو اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ ہی دکھائی نہیں دیا۔ روکھا پن۔ سرد مہری۔ اسے دیکھتے ہی شوہر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی انہونی شے دیکھ لی ہو جیسے اس کے قریب آنے میں کوئی خطرہ ہو۔ اور یہ بعد بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور تو اور اس نے کبھی اس کے ہونٹوں کو بھی نہیں چوما تھا۔ کبھی اس کے گالوں کو چومتا تو پھر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے شوہر کے ہونٹ اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر سخت مونچھوں کی چبھن سی محسوس کر کے رہ جاتی۔ اس نے کبھی پیار کا ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ جنسی تعلقات کے باوجود جذباتی طور پر وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے یہاں تک کہ بچی کی پیدائش بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لا سکی۔ کبھی آپس میں جھگڑا نہیں خفگی یا رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی ازدواجی زندگی چھکڑا بن کر رہ گئی تھی۔ جو ناہموار راستے پر دھچکولے کھاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شاہدہ کا دل دکھ کے مزے سے آشنا ہو چکا تھا۔ نامعلوم سا درد کلیجے میں بیٹھ کر رہ گیا تھا۔

آغازِ شباب سے لے کر اس لمحے تک کا زمانہ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں تلے سے گزر گیا۔ آرام کرسی پر پیچھے کی جانب جھکے جھکے اس نے آنکھیں نیم وا کر لیں۔ ایک مرتبہ تو اس کی قوتِ ادراک قطعاً مفلوج ہو گئی تھی اور نہ کوئی احساس ہی باقی رہ گیا تھا۔

سامنے خاوند کی دھندلی دھندلی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خاوند جو اس کے لئے صبح سے شام تک دفتر میں کام کرتا تھا۔ نہ معلوم کیا کچھ کرتا تھا وہ خاوند جس نے اسے کبھی سخت کلمہ تک نہیں کہا تھا۔ اپنی ساری آمدنی اس کے سپرد کر دیتا۔ اس کے کپڑے لتے دیگر ضروریات کا دھیان رکھتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر شوہر کے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے نتھنوں میں چند بال باہر کو نکل آئے تھے جنہیں وہ بیماری کی وجہ سے نوچ کر پرے نہیں پھینک سکا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاً اس کے لبوں میں سے ہلکی سی آواز نکلی — شاہدہ نے آنکھیں پورے طور پر کھول دیں۔

"پانی!"

شاہدہ نے فوراً پانی کا گلاس اس کے منہ کے قریب کر دیا۔ دو تین گھونٹ پی کر اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ پانی کے قطرے اس کی سخت مونچھوں پر لرز رہے تھے۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی زرد آنکھیں کھولیں۔ اور بیوی کی نظروں سے نظر ملائی۔ معلوم ہوتا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جذبہ تھا۔ شاہدہ وہیں زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ شوہر کے ہونٹ لرزے "شاہدہ!!"

"جی" —— پھر وہ بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد بولا "شاہدہ!!"

اس کی آواز میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہدہ نے ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ سانس کی آمد و رفت جاری تھی —— "جی!!"

شوہر نے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کہنا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کئی دفعہ جی چاہا کہ کہہ دوں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ نہ معلوم ۔ ۔ ۔ ۔ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ ۔ ۔ ۔"

یہ کہکر اس نے مُنہ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی ہمہ تن گوش ہے۔ پھر دفعتاً آواز آئی "شاہدہ! مجھے تم سے محبت ہے، پہلی رات ہی سے ......

شاہدہ کا جسم شدّت کی گرمی سے جھلس کر سرد پڑنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ کھڑکی میں سے جھلملاتے روشن تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر سر شوہر کے سینے سے چھپا دیا۔ وہ مر رہا تھا۔

جھینگر کے جھنڈ میں سے سیٹیوں کی آوازیں آتی رہیں —
لیکن وہ بیٹھی ہچکیاں لے لے کر آنسو بہاتی رہی

(بقیہ صفحہ ۱۲۳)

نیڈا کنڈا ہے پوری کولریجا نٹس ہو گیا ہے"۔

ہال میں قہقہے گونج اٹھے۔ لیکن یہ سب سننے سے پہلے نیاز صاحب ہال سے نکل چکے تھے۔ اور لریجانٹس کی بات بھول کر زور زور سے ایک رکشا والے کو آوازیں دے رہے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۳۲)

طرف تیر رہی ہیں۔ اور سونے کے رنگ کا پانی کائنات پر برستا جا رہا ہے۔ دیوانے انسانو۔ کیا تم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ اس پانی میں جنم جنم کا سارا نامکمل پن، ساری بے اطمینانی، ساری کشمکش ہمیشہ کے لئے بہہ جائے گی۔ دیکھو صحرا کا آسمان کتنا تنہا ہے۔ کتنا خوبصورت کتنا عظیم اور وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ اور حیات کی روح القدس میں داخل ہو کر آگے جا رہی ہے۔

یہ لمحہ کتنی دیر ٹھہر سکے گا۔ کتنی دیر — ؟

اور تب میں نے پوکس سے کہا آؤ پوکس ڈارلنگ چل کر چاء پیئیں پھر میں تمہیں چند نئے پارٹی گیم بتاؤں گی۔

(ارے ہائے بھئی اللہ میاں)

قرۃ العین حیدر

جو سالوں کی وادی میں چلے

بہت ٹھنڈا چاند ہے۔ بہت ویران ہوائیں اندھیرے کمروں اور طویل، لاانتہاہی، غیر ضروری گیلریوں میں سرسراتی پھر رہی ہیں۔ زینے تاریک ہیں اور سرد۔ اور ایک نامعلوم خوف دل میں جھنجا جا رہا ہے۔ مجھے یہیں چھوڑ دو بھائی۔ چاند سیاہ پڑ گیا ہے۔ اور اجالے کی پھواروں کے ایسے سرخ ذرّے اس کے چاروں طرف منڈلاتے جاتے ہیں۔ گیلریاں سنسان ہیں اور تاریکی میں رینگ رہی ہیں۔ ابھی وہ سب یہاں آئیں گے۔ اور روشنیاں جلیں گی۔ اور پانی پر سے موسیقی اٹھے گی۔ پھر سب مر جائیں گے۔

یہ سب اتنا ناقابل برداشت ہے۔ اور اس نے کہا۔ دیکھو۔ ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔ اور میری آواز سنو۔ میں نے اکتا کر چاروں طرف دیکھا اور اس کی آواز سنی۔ اور میں نے دیکھا کہ یہ سب اتنا غیر ضروری تھا۔ اور میں نے کہا سنو۔ زندگی کی روحیں وجود کے کرب سے بچنے کی کوشش میں تاریک خلاؤں میں گھوم رہی ہیں۔ اور اس وقت چاند سُرخ اور سیاہ ہوتے ہوئے بالکل انگارے کی طرح جلتا جلتا نیچے گر پڑا۔ اس کو میں نے چھوا۔ لیکن وہ اتنا گرم تھا کہ مجھے بالکل تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ اور ہوائیں اندھیری غلام گردشوں میں شور مچاتی رہیں۔ اور پانی کا سیاہ محیط گھوں گھوں کرتا چاند کی طرف اٹھ رہا تھا۔

کیوں اس قدر اٹھلا اٹھلا کے باتیں کرتی ہو۔ ہم مار دیں گے۔ اللہ قسم۔ میں نے پُوکس سے کہا۔ رات جب وہ نرگس کے پھولوں میں مُنہ چھپائے ہنس رہی تھی۔ رات میں نے دیکھا تھا کہ میں زرد گلاب کے باغیچوں والے ان آنگنوں میں پہنچ گئی ہوں جن کے ٹھنڈے پتھروں پر پہاڑی نہروں کا خنک پانی بہتا ہے۔ اور جہاں گلیوں کے دروازے پراسرار طریقے سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اور میں نے پوکس سے کہا۔ کیا تم جانتی ہو پوکس ڈارلنگ کہ میں اس طرف سے آئی ہوں جہاں ہوائیں روتی ہیں اور آدھی رات کے زینوں پر کہرہ منڈلاتا ہے۔ اور پوکس نے آنکھیں جھپکا کر چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اور پھر وہ چُپ ہو گئی اور مدھم تکلیف دہ چاندنی میں چوڑی، بھیگی، سرد سیڑھیوں پر کہرہ منڈلاتا رہا۔ کتنی ٹھنڈ ہے۔ کتنی ٹھنڈ ہے۔ میں نے بیوقوفوں کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی مٹھی بنا کر چُپکے سے دہرایا۔ کتنی ٹھنڈ ہے۔ خدا کی پناہ۔ دیکھو بھائی راحیل — وہ کہہ رہا تھا۔ یہ وجود کی بیوقوفی۔ اسے تم پہچانتی ہو —؟ ارے جاؤ بھی۔ میں نے اکتا کے کہا۔ کتنی ٹھنڈ ہے۔ خدا کی پناہ۔ میں نے پھر دہرایا۔ اور چاند بالکل سرد ہو گیا۔ اور بدمزاج، کالی رات چیختے چیختے تھک کر خاموش ہو گئی۔

اور ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ وہاں پر اندھیرا نہیں تھا۔ اور چاروں طرف پھول کھلے تھے۔ اور ندی شور مچاتی تھی۔ اور ہوا میں بہار کے نئے شگوفوں کا رنگ اڑ رہا تھا۔ دُنیا اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کا اندازہ مشکل ہے! تاریکی وجود کی سرد۔ بے رحم، بھیس تاریکی سب ختم ہو چکی تھی۔ سورج بادلوں میں سے جھانکتا تھا اور گرسینتھم کے گچھے بارش کی پھواروں میں نہاتے تھے۔

اور اب ہم ساکت، خاموش، نیلگوں پانی کے کنارے کنارے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ اور کناروں کے پتوں کا عکس پانی میں تیر رہا ہے۔ اور اب کچھ یاد نہیں آتا۔ اور جو یاد آتا ہے۔ وہ بالکل غلط ہوتا ہے۔ یہ نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا محض جنگوں، لڑائیوں اور طوفانوں ہی سے انسان زخمی نہیں ہوتے۔ زندگی کا کرب ہر جگہ۔ ہر وقت ہر حالت میں موجود ہے۔ سنو پُوکس ڈیئر۔ یہ تار۔ لمبے، الجھے ہوئے تار۔ اور ان میں انسانوں کے ٹکڑے اور خون۔ اور کیچڑ۔ اور بارش موسلا دھار بارش، ہوا کے زور سے دروازہ کھل گیا ہے اور بارش کی تیز پھوار سے ہال کا سارا چمکدار فرش بھیگ گیا ہے اور اس پر چاند کی دھندلی کرنیں پھیل گئی ہیں اور اب دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے

جیسے پرشور طوفانوں سے گھر محفوظ ہو گیا ہے۔ گھر جہاں آتشداں میں آگ جلتی ہے۔ اور قالینوں پر بلیاں اونگھتی ہیں۔ اور باہر بارش کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتی ہے۔ اور اندھیرے باغ میں دیودار کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر روشوں پر گرتی ہیں۔ گھر۔ گھر۔ ارے ہٹئے۔ اب یہ یوں ہوگا۔ یہ یوں ہوگا۔ گھر جو اتنے سینکڑوں ہزاروں میل پیچھے رہ گیا۔ اور بیوقوف گدھے چٹانوں پر بیٹھے تصویریں بنا رہے ہیں جو نمائشوں میں رکھی جائینگی۔ سمندر۔ ماہی گیروں کی کشتیاں۔ چٹانیں۔ اتنی بہت ساری بھوری چٹانیں کہ دیکھو تو باؤلے ہو جاؤ بھائی۔

اور اتنے غیر ضروری مرد اور اتنی غیر ضروری عورتیں۔ اور وہی باتیں سب کی ایک ہی سی باتیں۔ یہ سب لوگ جو اپنے آپ کو جانے کتنا اہم سمجھتے ہوں گے۔

میں نے چمپا کے شگوفوں کی ایک ربنبھ بنائی تاکہ تم جب کسی ایسی ہی کاہل سی موسم گرما کی شام کو نیلوفر کے ان راستوں پر سے گزرو۔ تو ان احمق زمانوں کو یاد کرو جب وہ سب ایک سوتے ہوئے سے خوابیدہ بے حس پیلے چاند کے نیچے ان پگڈنڈیوں پر گھومتے تھے۔ اور جنگل کے پرے ان سرخ چھتوں والے گھروں میں کنول جلتے تھے۔ اور شفاف نیلگوں پروں والے چھوٹے چھوٹے پری زاد نیلوفر کی ڈالیوں پر ہفتے اور اتوار کے دن گزارنے آتے تھے۔

لیکن موسم گرما بھی گزر رہا ہے۔ جیسے اور سب موسم گزرتے جاتے ہیں۔ اور میں آنکھیں کھول کر زندگی کی اس تیز چلچلاتی ہوئی روشنی کو نہیں دیکھ سکتی۔ اور اگر یوں ہو کہ ہم وجود کے اس بے پایاں کرب میں خاموشی سے تحلیل ہو جائیں۔ (یہاں تک کہ وقت اپنی جگہ پر ٹھہر جائے۔ اور پھر کچھ نہ ہو۔ وجود کا یہ کرب۔ ابدی۔ لازوال۔ اسٹ) لیکن یوں نہیں ہے۔ اور وہ روشنیاں اور آدھی روشنیاں پھیل گئی ہیں جنہیں میں نے پکڑنا چاہا تھا۔ اور موسم گرما گزرتا جا رہا ہے۔ اور سب چیزیں ویسی ہیں۔ اور کسی چیز میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

داس کی آنکھوں میں شدت کی اکتاہت تھی اور اس وقت اسے صرف دو چیزوں کا خیال تھا۔ سگرٹ اور نیا فوکس ٹیریر۔ (تم نے مجھے خدا حافظ نہیں کہا ۔۔ ؟) اس نے مڑکر پوچھا اور پھر لمبے لمبے قدم رکھتا اس طرف چلا گیا جدھر کرسنتھمم کے پھول تھے۔ زرد۔ اودے۔ ہلکے نیلے اور پیازی۔ جاگستد کے مدھم آفتاب کو دیکھ رہے تھے۔ اور باغ کی مٹی نم آلود تھی۔ اور وطن کی خوشبوؤں کی یاد دلاتی تھی۔ اس خوشبو کو پہچانو۔ داس نے کرسنتھمم کے پھولوں پر سے چلا کر کہا۔ گویا اسے دفعتاً کوئی بیحد ضروری بات یاد آگئی ہے) یہ ہرسنگھار ہے اور ہرسنگھار تمہیں یاد آنا چاہئے۔ عاحیل کہ وطن کی اکیلی سبزے سے گھری ہوئی ندیوں کے کنارے اگا کرتا تھا۔

وطن ۔۔ وہ پورب دیس جو ہم نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اور یہاں چلے آئے۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایک نئی دنیا تھی۔ اور ایڈونچر۔ اور نئی کائناتوں کی تخلیق کا پراسرار جذبہ۔ لیکن اپنے اس دیس کی یاد میں اس طرح نہیں چھوٹ سکتیں۔ گرمیوں کی شبنم آلود صبحیں۔ اگست کی بارشیں۔ ہرسنگھار کی مہک (اس کی کالی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور بارش ہوتی رہی۔ اندر برآمدے میں لوگ شطرنج کھیل رہے تھے) ہاں۔ ان خوشبوؤں کی یاد دل سے نہیں نکل سکتی۔ اس نے آہستہ سے پھر دہرایا اور پھر وہ ہنس پڑا۔ یہ سب کس قدر بیکار اور حماقت زدہ ہے۔ غیر ممکن کی خواہش بھول جانے کی کوشش۔ اس نے کہا۔ اور خاموشی سے جیسے مذاق اڑاتا ہوا وہ واپس چلا گیا۔ جدھر کرسنتھمم کے پھول تھے۔ اندر کوئی اس وقت پیانو پر ایک پرانی دھن بجا رہا تھا۔ (اس بہت پرانے پیانو پر جو والد ایک مرتبہ فرانس سے لائے تھے) اور ہوائیں چنار اور پیپلے کے جھنڈ میں سیٹیاں بجاتی رہیں۔ اور اس نے بے پروائی سے ایک جماہی لے کر (NOSTALGIA) کی اس اچانک اور غیر متوقع لہر سے نجات پانے کی کوشش کی۔ وہ خوش تھا۔ اور مطمئن اور مون سون کے بھولے بھٹکے بادل جو صحرا کی طرف آنکلے تھے۔ شام کے آسمان پہ امڈتے رہے۔ اور ہوائیں بےچینی سے ڈولتی گئیں۔

اور تب میں نے سوچا۔ کہ کیا یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نے اسے اپنی شام کی دعاؤں میں شامل کیا۔ اتنی مدتوں تک خداوند خدا سے اس کی باتیں کیں۔ اور کہا کہ ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ اے خداوند کہ ابدیت کے دھارے میں تیرتی ہوئی حیات کی رو سے تو نے ہماری زندگی کی تخلیق کی۔ اور ہم ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ جو اتنی حقیر اور بے وقعت ہیں۔ کہ ان کے وجود کا تجھ پر کوئی احسان نہیں۔ پھول۔ حماقت زدہ لطیفے۔ جنہیں ایک دوسرے کو سنا کر وہ خوش ہوتے تھے۔ وہ لمحات جب ہم ریلنگ پر جھک کر سمندر میں سورج کو غروب ہوتے دیکھتے تھے۔ اور انا میرا بیٹ

نیچے گرتا آتا تھا۔ اور زندگی اچھی تھی۔

پھر میں اس معبد میں گئی جہاں اونچی اونچی موم بتیاں جلتی تھیں اور جہاں وہ خوبصورت ڈیچ راہب تھا۔ جو ہنس رہا تھا۔ اور وہاں محض دعائیں تھیں اور پھول تھے۔ اور میں نے آہستہ سے کہنا چاہا کہ کیوں زندگی کا مذاق اڑاتے ہو۔ بھائی خوبصورت راہب۔ تم جو ایک عورت کے مجسّمے کی پرستش کرتے کرتے اس اندھیرے سے نکل کر دوسرے اندھیرے میں چلے جاؤ گے۔ اور تمہارے مزار پر اسی طرح کے دوسرے مجسّمے اور برابطوالے فرشتے سجا دیئے جائیں گے۔ شب بخیر ہولی۔ اور میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ اور واپس چلی آئی۔ شب بخیر اس نے جواب دیا اور اسی بے تعلقی سے ہنستا ہوا مقدس دیوداروں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا جہاں وہ خدا کی ماں کی عبادت کرتے تھے۔ وہ ڈیچ راہب جو اپنی شمعوں، اور سیاہ پوش ہیکل کے پردوں اور سینٹ پال اور جینوا کی کیتھرین کی کتابوں کے انبار کے درمیان محفوظ تھا جس کے حسن کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا جس کے حسن کو دیکھ کر اطمینان ہوتا تھا کہ زندگی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

پھر میں نے سُرخ پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ سرخ اور نیلی پہاڑیاں جن کے چاروں طرف سخت، کالے راستے پھیلے ہوئے تھے۔ اور ناگ پھنی جو پہاڑیاں آہستہ آہستہ آسمان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اور راستوں کے چاروں سمت شدید تکلیف دہ وسعتیں تھیں۔ جہاں پر کچھ نہ تھا۔

پھر ہوائیں چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ اور شمال کی سمت بڑھیں۔

اور سائبرن چیخنے لگے۔ تو میں نے چُپکے سے پوچھا۔ میں نے پوچھا، یہ آبشار کیوں آئے۔ خداوند خدا نے اپنے ازلی گناہ کو کس طرح پہچانا۔ اور طوفان کیسے گرجتے رہے۔ لیکن مجھے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور وقت لڑھکتا گیا۔ اور طوفان میرے پاس سے گزر گئے جبکہ میں سو رہی تھی۔ پھر میں نے اسے پہاڑوں پر سے اترتے دیکھا۔ اس کے نغمے کی آواز قریب آتی گئی اور پھر دفعتہً وہ آواز بھی دُور چلی گئی۔ اور میں نے کہا میں اس کے ساتھ چل سکتی تھی۔ کائنات کے عظیم ترین ویرانوں تک اس کے ساتھ جا سکتی تھی لیکن یہاں پر محض یہ ہوائیں بہتی ہیں۔ اور سب مر چکے ہیں۔ جب یہاں پریاں ہنستی تھیں اور گرجا کے گھومتے ہوئے چاندوں کے نیچے وہ ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہتے تھے سنو — وہ آ رہا ہے۔ وہ خوابوں کا انسان آ رہا ہے۔ جو ہمیں نیلی پہاڑوں کی طرف لے جائے گا۔ وہ ہنستے رہے۔ اور آسمان کو لخت سیاہ پڑ گیا (اور وہ اپنے ڈائننگ روم میں، وادی کے پار، پکاسو اور اوڈن کے متعلق باتیں کر رہا تھا) اور پھر آسمان نیچے گر پڑے۔ بہت ٹھنڈ ہے۔ بہت ٹھنڈ ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ چلو یہاں سے چلیں۔ ہاں۔ چلو یہاں سے چلیں۔ انہوں نے طے کیا۔ اور وادی کی طرف واپس چلے گئے۔ جہاں سفارتی ضیافتیں ہوتی تھیں۔ اور معزز خواتین ناک کی نوک کو میکس فیکٹر سے ٹھیک کر کے ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں۔ ازنٹ اٹ کیوٹ ڈارلنگ — ؟

اور رات کے چاند تیزی سے گھومنے لگے۔ اور شیطان چیخے۔

اور جس طرف بھی آندھی گئی۔ چھوٹے چھوٹے سرخ شیطان اس کے ساتھ ساتھ چیختے گئے۔ اور پریاں ایک کے بعد ایک مر گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ نیلی پہاڑیوں تک پہنچ سکتیں۔ خداوند خدا نے یہ زندگی کتنی عظیم کتنی مقدس۔ کتنی قیمتی تخلیق کی ہے۔ کہ جو جب ختم ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لئے کوئی روتا ہی نہیں۔

ایسی باتیں نہ کرو۔ ورنہ خداوندِ عالم تم پر اپنا عتاب نازل کرے گا۔ نورانی داڑھیوں والے عالموں نے کہا۔ جبکہ روحیں کائنات کے ویرانوں میں اپنا ابدی گھر تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ انسانوں کی دعاؤں کے ذخیرے ختم ہو گئے۔ اور جتنی سانسیں انہیں زمین کے اُوپر عطا کی گئی تھیں، وہ پوری ہو گئیں۔ تب مکمل سناٹا چھا گیا۔ اور سب خاموش ہو گئے۔

مَیں نے یہ سب کچھ دیکھا جس وقت مَیں ٹھنڈی گھاس پر بیٹھی تھی۔ اور مَیں نے فرشتوں کی آواز سنی جو میری گمشدہ روح کی نجات کے لئے مصروفِ عبادت تھے۔ تم جو کچھ سوچتی ہو۔ اس کے لئے تمہیں زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔ ورنہ ابدی گھر کے دروازے تم پر بند ہو جائیں گے۔ نورانی داڑھیوں والے عالموں نے دہرایا۔ چنانچہ مَیں نے بےحد فرمانبرداری کے ساتھ اچھے اچھے خیالات جمع کرنے شروع کئے — گلاب کے پھول ایرانی جانمازیں، سفید نورانی کپڑے۔ لیکن یہ اور بھی زیادہ بوریت تھی۔

آخر اس شور و غل میں وجود کے طوفان کی خاموش، ساکت

گرجے کو میں نے پہچانا۔ اور میں نے دیکھا کہ مٹیالے شب و روز چاروں جانب پھیلتے جا رہے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور خالی آسمانوں کی عظیم تنہائی میں روح القدس بلا کسی مقصد کے منڈلاتی پھر رہی ہے۔ اور پھر پانیوں پر سے موسیقی اٹھی۔ اور اس نے کہا۔ میں یہاں ہوں۔ اور میں مر چکا ہوں (وہ اپنے ڈرائنگ روم میں، وادی کے پار، پکاسو اور اوڈن کے متعلق باتیں کر رہا تھا) وہ مر گیا جس وقت کہ وہ ریلنگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اور غروبِ آفتاب کی روشنی میں اس کے بال سُرخ نظر آ رہے تھے۔

اور زندگی کے اس ابدی اندھیرے میں اسے دفن کر دیا گیا۔

اور ہواؤں میں شیطان چیختے رہے۔ اور زندگی کی قبروں کی لامتناہی تاریکی میں فاسفورس کی سی روشنی جھلملاتی رہی۔ اور دریا کے طویل سیاہ پُل پر سے کسی انڈر ٹیکر کی کالی گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ اور ہوائیں اپنے سُرخ، گرم آنسوؤں کو ضبط کر کے سکون سے بہنے لگیں۔ اور چاند قبرستان کی سیاہ رنگ کی دیمک خوردہ صلیبوں پر لٹک گیا۔

چنانچہ آج کی رات، مارچ کے مہینے کی اس معمولی سی رات، وہ ختم ہو گیا۔ وہ اس دوسری، روشنی کی زندگی میں پہنچ گیا جو اس کی اپنی زندگی ہے جہاں اس کا اپنا گھر ہے۔ (اس کا گھر جس کی آرائش اور جس کے باغ کے پھول اسے اتنے پسند ہیں۔ کہ وہ پہروں ان کے متعلق آپ سے باتیں کر سکتا ہے) اس کا اپنا مستقبل۔ ان گنت دن۔ ان گنت راتیں۔ ستاروں کی روشنی۔ ہر سنگھار کی خوشبوئیں۔ شور مچانے والے خوش باش دوست۔ ضیافتیں۔ خاموشی کے مکمل لمحات یہ سب کچھ اس کا اپنا ہو گا۔ اپنا اور دلچسپ۔

ایسا ہوتا ہے کہ۔ اور روح القدس اندھیرے میں آگے بڑھ رہی ہے یہ یسوع کی دلہن بن گئی۔ اور یسوع اپنی اسی ہزار دلہنوں کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہے ـــ خوبصورت ڈیرک راہب نے آہستہ سے کہا۔ کوائر کے نیلی آنکھوں والے لڑکوں نے اس کی بات دہرائی جبکہ ایک سنہرے بالوں والی لڑکی بال منڈوا کے صلیب کی بیٹیوں کے مقدس سلسلے میں داخل کی جا رہی تھی (تم نے مجھے خدا حافظ نہیں کہا۔؟

وادی کے پرے، اپنے ڈرائنگ روم میں۔ اوڈن پر باتیں کرتے کرتے مڑ کر اس نے پوچھا۔ صوفے پر سے اُٹھ کر ایٹ ہوم کے چند اور مہمانوں سے کچھ تکلف کے الفاظ کہے اور پھر بیٹھ گیا) اور زمان و مکان کے اس بلّوریں قید خانے میں خیالوں کے ٹوٹے پھوٹے ستون چاروں جانب بکھرے پڑے تھے۔

اور اتنے برسوں پہلے جامنوں کے سائے میں سے جو کشتی چلی تھی۔ وہ خداوند خدا کے تخت کے نیچے جو کالی ندی بہہ رہی ہے۔ اس تک پہنچ گئی ہے۔ وقت کا آبشار تیزی سے نیچے گر رہا ہے۔ اور اس سے سینکڑوں ہزاروں میل پرے۔ پورب دیس کے ہمارے گھر میں آنگن کے پیپل کے نیچے مالی کی بہو نے بھوانی کا چبوترہ سجایا ہو گا۔ اور ندیوں کے کنارے ہر سنگھار کی مہک اڑتی ہو گی۔ کتنا عبرتناک انجام ہے ان سب چیزوں کا اے مومنو! اور گزرتی ہوئی صدیوں کی راکھ ہوا میں بکھرتی جا رہی ہے۔ اور کچھ یاد نہیں آتا۔ لیکن اگلی پیدائش پہلی پیدائش سے بہتر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک۔ یہاں تک کہ اگلے آنے والے زمانوں میں وقت کے صحراؤں میں گھومتے ہوئے میں اسے دوبارہ دیکھ پاؤں گی۔ جس طرح پچھلی صدیوں میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ جیسے اس زمانے، اس دنیا کے ایک مخصوص چکر میں۔ دن و رات کے ان حلقوں میں اسے پہچانا تھا۔ اس وقت تک جب کہ مارچ کی ایک شام کو وہ ختم ہو گیا۔ ۱۲ مارچ کی اس دھندلی رات کو اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اور اس سمے، دوپہر کے سناٹے میں روحیں دُور دُور تک تیرتی پھر رہی ہیں اور وہ سارے رنگ جو دھنک اور پھولوں اور بادلوں کے لئے تخلیق کئے گئے تھے اس ایک، اکیلی، لرزاں روشنی میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ اور اس روشنی میں خدا اپنی سنہری آنکھیں بند کر کے ابدی آنند کی نیدرا میں کھو گیا ہے۔ خلائے بیکراں کا یہ صحرا دور تک موسیقی کی لہروں کی طرح پھیلا ہوا ہے اور چاند کنول کے اکیلے پھول کی طرح ڈنٹھل سے جدا ہو کے نور کی اس ندی میں گر چکا ہے۔ اور یہاں، اس روشنی میں آخری دعا سنی جاتی ہے۔ اور اس بھری دوپہر، یا اس آدھی رات کی گہرائی میں مجھے اپنے وجود کے مکمل پن کا احساس ہوتا ہے۔ دوپہر کی لہریں چاروں

(بقیہ بر صفحہ ۱۲۸)

اے حمید

گولڈفلیک اور بیڑی

کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہی کھانسی نے اُس پر پھر حملہ کر دیا۔ اور وہ اندھیرے میں دیوار کا سہارا لئے جُھک کر کھانسنے لگا۔

صبح ہی سے اُس کے سینے میں درد کی لہریں سی اُٹھنے لگی تھیں اور کوئی پُراسرار آواز سرگوشی میں اُس کے کانوں کے قریب کسی خوف ناک شئے کا نام دہرانے لگی تھی۔ جنوری کی چمکیلی اور پُرسکون دھوپ میں ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے یہ درد ایکا ایکی ایک ٹیس بن کر اُس کے سینے میں اٹھا تھا۔ اور اس کی اُوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی تھی۔ کسی نو گرفتار پرندے کی مانند یہ درد بار بار اپنا سر اُسکی کمزور پسلیوں سے ٹکرانے لگا اور وہ سینہ تھام کر وہیں دوہرا ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد جب درد میں کچھ کمی ہوئی تو وُہ کھیتوں کی مینڈھ سے اُٹھ کر علی بخش لوہار کی دوکان پر چلا گیا اور باہر تخت پر بیٹھا اُس سے دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ لیکن پرندہ بدستور اپنے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہی ٹیس شعلے کی طرح لپکی اور تیز نیزے کی مانند اُس کا سینہ چھیدتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اُس کے مُنہ سے بلا اختیار ایک مدہم چیخ نکل گئی اور علی بخش لوہار گھوڑے کے نعل کو بھٹی سے نکالتے رُک گیا۔

'خیر تو ہے بابو؟'

'خیر ہے چچا'

'بھئی سردی ہے۔ سینہ لپیٹ کر رکھا کرو۔ تمہارا کمبل کیا ہوا؟'

وہیں بیٹھے بیٹھے لال لال سورج کا تھال اپنے پیچھے گہرا قرمزی شفق چھوڑ کر مغربی جانب، شیشم، کیکر اور آم کے گھنے ذخیروں کی اُوٹ میں چھپ گیا۔ اور گاؤں کے کچے مکانوں سے اُٹھتا ہوا اضمحل دھواں شام کی پھیکی اور بے رنگ اُداسی میں تحلیل ہونے لگا۔ وہاں سے اُٹھ کر وُہ اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا جو گاؤں کے مشرقی حصّے میں پُرانے تالاب کے پاس واقع تھی اور جہاں وہ تقریباً سات ماہ سے روپوشی کے دن گذار رہا تھا۔

پرانے تالاب کے پاس پہنچکر کھانسی نے اچانک اُسے آدبوچا اور وُہ پیپل تلے ٹوٹے ہوئے چھکڑے پر بیٹھ گیا۔ کھانسی ایک خوف ناک بھوت کی طرح اُس کے سارے جسم کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اُس کے پٹھوں اور گردن کی تمام رگیں اکڑ کر تن گئیں اور چہرہ پسینے میں تر بتر ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ زمین پر تھوکتے ہوئے اُس کی نظر سیاہ اور جمے ہوئے خون پر گئی اور اُس کا بدن سر سے پیر تک سرد پڑ گیا۔ جیسے کسی برف آلودہ ہاتھ نے اُس کے دِل کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ اُس کا چہرہ زرد ہو گیا اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر بے نور سی ہو گئیں۔

'انجام قریب ہے' جیسے کسی نے ہولے سے اُس کے کان میں کہا اور وُہ سہم کر اکھٹا ہو گیا۔ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور موت سامنے والی کوٹھڑی میں اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ چھکڑے کے بانس کا سہارا لے کر وُہ اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے اپنی کوٹھڑی کیطرف چل پڑا۔ اب سردی اُتر آئی تھی۔ تالاب میں شفق کا رنگ مٹیالا ہو رہا تھا اور آسمان پر تاروں کے فانوس روشن ہونے لگے تھے اور پرندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے آشیانوں کی سمت چُپ چاپ اڑی جا رہی تھیں۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھولتے ہی اُسے محسوس ہُوا گویا وہ کسی تاریک اور گہرے غار کے مُنہ پر کھڑا ہے اور یہ غار اُسے نگلنے کے لئے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

'انجام قریب ہے، انجام قریب ہے'

یہ خوف ناک الفاظ سرگوشی انداز میں سنسان کوٹھڑی میں چمگادڑ کی

کی طرح غوطے لگا رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور کھانسی نے
ایک بار پھر اس پر حملہ کر دیا اور وہ دیوار کا سہارا لے کر جھک کر کھانسنے لگا۔
جیسے کوئی طاقتور ترین شے اس کے بدن کو دھنک رہی تھی اور
اس کا انگ انگ روئی کے لطیف گالوں کے روپ میں فضا میں
منتشر ہو رہا تھا۔ تھوکتے وقت اس کے ہونٹوں پر گیلا اور نمکین لعاب
بہہ نکلا۔ اندر اگرچہ اندھیرا تھا مگر اسے یقین تھا کہ لعاب صرف خون
ہے ۔۔ سیاہ اور جما ہوا خون ۔۔۔

کھانسی رکی تو سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کی ٹانگوں
میں سے طاقت گویا بالکل زائل ہو گئی تھی۔ جیسے وہ اس کی اپنی ٹانگیں
نہ ہوں۔ ایسے شخص کی ہوں جو کئی ماہ ہسپتال میں پڑے رہنے کے
بعد پہلی بار بستر سے اٹھ رہا ہو۔ اس کا بند بند درد کرنے لگا تھا۔
اس نے جیب سے دیا سلائی نکال کر طاق میں رکھا ہوا دیا جلایا۔
اندر کمزور اور مدھم روشنی پھیل گئی۔ اور مختصر سا معمولی سامان نظر آنے
لگا۔ بند کھڑکی کی سل پر قلم دوات شیو کا صابن، ٹوٹا ہوا شیشہ، پرچوں
کا ایک بنڈل، چند ایک پھٹی پرانی کتابیں، رسالے کونے میں ٹین کے
سوٹ کیس پر گرد میں اٹے ہوئے جوتے۔ اور اوپر دیوار سے
لٹکی ہوئی میلی شیروانی۔

دیا جلا کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور کمبل منہ پر کھینچ لیا۔ سینے
کا درد اگرچہ کم ہو گیا تھا مگر اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔
کمبل منہ پر کھینچتے ہی جیسے غار کا تاریک منہ زیادہ بھیانک صورت
میں بدل کر اور آگے کھسک آیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں۔
'آ گئی۔ آ گئی۔ موت آ گئی'
چمگادڑیں فضا میں غوطے لگا رہی تھیں۔

وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندگی کے چھبیسویں سال
میں قدم رکھا تھا۔ اس نے ابھی تک خزاں میں درختوں کی ٹہنیوں کو
اپنے گلے سڑے سوکھے پتے نیچے پھینکتے ہی دیکھا تھا۔ ان ٹہنیوں پر بہار
کے اولیں شگوفے کسی طرح اپنی ننھی منی آنکھیں کھولتے ہیں اور کب
ہری بھری نرم بیلوں کے اجلے پھول نشہ آلود ہواؤں کے تال پر
جھومنے لگتے ہیں؟ اسے کوئی خبر نہ تھی۔ اس نے خزاں کا غمناک مرثیہ ہی
سنا تھا بہار کے مدھر الاپ سے اس کے کان ہنوز ناآشنا تھے۔ وہ
بہار کا منتظر تھا۔ وہ کب سے بہار کا منتظر تھا اور بہار ابھی نہیں آئی تھی۔

* * * * * * * * * * *

کسان تحریک سے ناطہ جوڑنے سے پہلے وہ ایک آزاد اور کھلنڈرا
لڑکا تھا۔

اس نے کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ لمبے قد مضبوط
ہاتھ پاؤں، چوڑے چکلے سینے، گول گول چمکدار آنکھوں اور مضبوط
دانتوں والا ایک ہنس مکھ نوجوان تھا۔ سخت محنت اور جفاکشی و مشکل
پسندی کا خیال اسے نچلا نہ بیٹھنے دیتا۔ اپنے محلے کے ٹال پر کشمیری
ہاتو کو کلہاڑا چلاتے دیکھ کر اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتیں۔
کئی بار اس نے کلہاڑا تھام کر خود لکڑیاں پھاڑنا شروع کر دیں اور
جلد ہی تھک ہار کر پسینے میں ڈوب گیا اور کسی بڑے سے مڈھے سے
پیٹھ لگائے، ٹانگیں ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر پسارے وہ لذیذ تھکن
کے پرلطف اتار کا مزہ لینے لگا۔

دیہاتی فلموں یا تصویروں میں وہ کسانوں کو تہمد باندھے تیز دھوپ
اور بارشوں میں کھیتوں کی تلائی کرتے ہل چلاتے، زمین کھودتے
فصل کاٹتے دیکھتا تو اس کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہو جاتا۔
رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ وہ سوچتا۔ کاش میں بھی کسان
ہوتا۔ اور کھیتوں میں کام کیا کرتا۔

اسے ابتدا ہی سے کسانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی بیحد خواہش تھی۔
اس کا مزاج لڑکپن ہی سے دہقانہ تھا۔ ایک دن وہ چپکے سے آبادی
سے باہر نکل گیا۔ تین چار میل طے کرنے کے بعد اسے کسان اور
مزدور کھیتوں میں کام کرتے ملے۔ گیہوں کی فصل ابھی پوری طرح
پکی نہیں تھی۔ مگر ایک کھیت میں کٹائی شروع ہو گئی تھی۔ فصل
تقریباً پک چکی تھی۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا اور شام تک گیہوں
کے پتلے پتلے لمبے خوشے کاٹ کر ان کے گٹھے بناتا رہا۔ پکے ہوئے اور
ادھ پکے گیہوں کی سوندھی سوندھی مہک نے اس کے بدن میں
تازگی اور بشاشت کی لہر دوڑا دی۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا
وہ طویل بیماری کے بعد ابھی ابھی شفایاب ہوا ہے شام کے وقت

وُہ خوشی خوشی گھر لوٹتا۔

اگرچہ اُس کے ہاتھوں پر جگہ جگہ خراشیں آ گئی تھیں اور کئی جگہوں سے سُرخ سُرخ خون بہنے لگا تھا مگر اُسے درد کا احساس تک نہ تھا۔ اُس رات وُہ تھکے مارے گھوڑے کی طرح سویا اور اُس نے بھرپور نیند کا لُطف اُٹھایا۔

کالج میں آتے ہی وُہ اپنے اکھڑ اندازِ گفتگو، مضبوط ڈیل ڈول اور دہقانوں ایسی چال ڈھال کی وجہ سے بہت جلد جیسی، مشہور ہو گیا۔ وہ ہر بات کا ہنس کر جواب دیتا۔ اُس کی ہنسی میں دودھ ایسی تازگی اور شبنم ایسی پاکیزگی تھی۔ ہنستے وقت اُس کے مضبوط دانتوں کی سفید قطار پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اُٹھتی اور اُس کی گول گول آنکھوں میں زندگی کی سچّی خوشی کا نور جھلملانے لگتا۔ لڑکے بہت جلد اُس سے مانوس ہو گئے۔ اور اُس کے گرد اکثر دوستوں کا جمگٹا رہنے لگا۔ اُس کے طویل اور بلند قہقہے صحتمند اور تسکین بخش تھے۔ یہ قہقہے ایک تیز رفتار پہاڑی نالے کی طرح اُس کے دوستوں کے دلوں سے نفرت، غصّہ اور غم کے جلے گلے سرکنڈوں کو بہا کر لے جاتے اور انہیں اپنے دل بچوں ایسے معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتے۔ ان قہقہوں میں، زندگی، امید اور روشنی کا بھرپور احساس تھا۔ اُس نے اپنے دوستوں کی ایک جماعت بنائی جو مہینے میں ایک بار قریبی دیہاتوں کے دورے پر نکل جاتی۔ گاؤں گاؤں جا کر وہ کسانوں سے ملتے۔ اُن سے باتیں کرتے۔ اُن کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ انہیں پُرانے ہلوں کی جگہ مشینی ہل خریدنے کی تلقین کرتے۔ گندی گلیوں، کوٹھڑیوں اور ڈھور ڈنگر کی صفائی اور صحت کے بارے میں تقریریں کرتے۔ انہیں کہتے کہ وہ اپنے بچّوں کو تھوڑی بہت تعلیم دلائیں۔ اور تعلیم دلانے کے بعد اُنہیں شہر کے دفتروں میں کلرک بھرتی کروانے کی جگہ اُن سے کھیتی باڑی کا کام لیں۔ بعض کسان اُن کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتے اور بعض بڈھے بوڑھے سُنی اَن سُنی کر دیتے۔

ادسال کی مسلسل پڑھائی اور دیہاتی دَوروں کے بعد ایک روز اچانک اُسے محسوس ہُوا کہ وہ کسان جن کی منڈلی میں شامل ہو کر اُس نے پہلی بار فصل کی کٹائی کی تھی اور جن کے درمیان وہ مدّت سے ترقّی اور اصلاح کا پرچار کر رہا تھا۔ اصل میں حقیقی خوشی اور سچّی خوش حالی سے کوسوں دُور ہیں۔ اُس نے دوسرے مُلکوں کے کسانوں سے اپنے وطن کے دہقانوں کا مقابلہ کیا تو اُسے یُوں محسوس ہُوا گویا وُہ پیرس کے خوشنما بازاروں میں سے گدھے پر سوار ہو کر گزر رہا ہو۔ شہروں کی عالی شان عمارتوں شاندار ہوٹلوں، شاداب پارکوں اور کلبوں میں رہنے والے مہذب انسان نے اپنے اُس دیرینہ ساتھی، دُور افتادہ بھائی کو بالکل بھلا دیا تھا جو گمنامی، تنگ دستی اور جہالت میں گھرا ہوا، سردیوں کی سنسان راتوں میں گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہو کر اُن کے لئے راشن کا بندوبست کر رہا تھا، کیک بنا رہا تھا، سینڈوچ بنا رہا تھا، پیسٹری، پینیٹر اور کورن فلیکس کے بیج بو رہا تھا۔

اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی زندگی اُن دُور افتادہ بھائیوں کی فلاح کے لئے وقف کر دے گا۔

کالج میں آخری سال گزار چکنے کے بعد جب اُس نے اپنے باپ کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو اُن کی ترکی ٹوپی کا سیاہ پھُندنا ایک دم ساکن ہو گیا۔ اُنہوں نے عینک کے پیچھے سے اپنے بیٹے کو گھُور کر دیکھا۔ وُہ اُسے جاہل اور اُجڈ کسانوں کے درمیان بیٹھے بیوقوفوں کی طرح باتیں کرتے اور ایک احمقانہ مقصد کی خاطر گاؤں گاؤں کی خاک چھانتے دیکھنے کی بجائے کسی اعلےٰ عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ اُس کثیر رقم کو اس طرح دیہاتی علاقوں کی دُھول میں رُلتے نہ دیکھ سکتے تھے جو اُنہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر خرچ کی تھی انہوں نے اُسے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے اور اُن بے معنی ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر اُن کا بیٹا اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اُسے چچا زاد بہن طاہرہ کا لالچ دیا گیا جو بی اے میں پڑھ رہی تھی اور جو امیر ماں باپ کی بیٹی ہونے کے علاوہ خوبصورت بھی تھی۔ مگر یہ وار بھی خالی گیا۔ اُسے آخری بار کہا گیا۔ اگر اُس نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو اُسے گھر چھوڑنا پڑے گا۔

چنانچہ ایک روز وُہ چند کتابیں اور کچھ کپڑے سوٹ کیس میں ڈال کر گھر سے نکل پڑا اور اپنے ایک دوست کے ہاں ٹک گیا۔ اُس نے

وقت ضائع کئے بغیر رسالوں اور اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر ان مضامین کا معاوضہ اتنا قلیل اور اتنی دیر سے ملتا تھا کہ وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کرنے پر مجبور ہو گیا۔

سیاسی ماحول میں براہِ راست داخل ہونے کے تھوڑے ہی عرصے اُس کا تعلق ایک ایسی جماعت سے ہو گیا جو کسانوں کی بہتری کے لئے کام کر رہی تھی۔ اُس نے اپنی تنخواہ کا آدھا حصہ اس جماعت کے نام وقف کر دیا۔ یوں ہر ماہ اُس کے پاس ساٹھ روپے بچتے تھے۔ اُس نے اپنی ضروریات کو بتدریج کم کرنا شروع کر دیا۔ ریشمی قمیصوں کی جگہ ہتھ کھڈیوں کے بنے ہوئے کھدر کے کرتوں اور پاجاموں نے لے لی۔ اس سے پیشتر وہ گولڈ فلیک کے علاوہ اور کوئی سگریٹ نہ پیتا تھا۔ مگر اب تارہ مارکہ بیڑیوں کا بنڈل اُس کی جیب میں رہنے لگا۔ کبھی کبھار سینما جاتا تو ہمیشہ تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدتا۔ وہ صبح سویرے اُٹھتا۔ خالی پیٹ دفتر چل پڑتا۔ وہاں ایک گھٹیا قسم کے قہوہ خانے میں چائے کا ایک پیالہ پیتا۔ دوپہر کو وہیں روکھی سوکھی روٹی کھا لیتا اور شام کو کام ختم کرنے کے بعد کسان کمیٹی کے دفتر میں پہنچ جاتا اور رات کو تھکا ہارا گھر لوٹتا۔ دو گھنٹے تک کتابوں اور مختلف ملکی اور غیر ملکی رسالوں کا مطالعہ کرتا اور پھر بے سُدھ ہو کر سو جاتا۔

زندگی کے بوجھ کو براہِ راست اپنے کندھوں پر اُٹھا چکنے کے بعد اُسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ کسی وقت جب وہ اپنے کرتے یا پاجامے کو پھٹی ہوئی جگہ سے مرمت کرنے لگتا تو بے اختیار اُسے اپنا گھر ——— اپنی ماں اور بہنیں یاد آجاتیں اور وہ ہلکی سی آہ بھر کر زیرِ لب ہنس دیتا۔ جیسے رات اُس نے کوئی سہانا اور جگمگاتا ہوا خواب دیکھا ہو۔

اپنے گھر، ماں باپ، بہن بھائیوں کو چھوڑے اُسے تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں ایک آدھ دفعہ اُس نے اپنے باپ کو تانگے میں بیٹھے گزرتے دیکھا اور اُس کے دل میں محبت، احترام اور غم کا ملا جلا احساس جاگ اُٹھا۔ وہ سوچتا اُس نے ایک گھر سے نکل کر ہر گھر کو اپنایا ہے۔ گنتی کے افراد کی ذاتی مسرّتوں کا گلا گھونٹ کر وہ دنیا جہان کے پس ماندہ، مفلس اور بدنصیب لوگوں کی لٹی ہوئی چھنی ہوئی، گمشدہ خوشیوں کی کھوج میں نکلا ہے۔ انفرادیت کے سرد و تاریک غاروں سے نکل کر ہمہ گیر انسانیت اور محبت کے کھلے اور وسیع میدانوں میں آگیا ہے۔ خاموش اور سنسان چوٹیوں سے اُتر کر وہ اُن دلدلی کھڈوں میں چل پھر رہا ہے جہاں ویران سرکنڈوں کے خاردار جال میں اُلجھے ہوئے مہیب پتھروں تلے دبے ہوئے بے حس اور بے جان انسان ہر قدم پر اُس کی ہمدردی اور قربانیوں کے محتاج ہیں۔ اپنے گھر میں رہ کر وہ سوائے اپنی ماں باپ اور طاہرہ کو خوش رکھنے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا لیکن گھر سے باہر نکل کر وہ ہر ماں، ہر باپ اور ہر طاہرہ کو اپنے ساتھ لئے ازلی اور ابدی مسرّتوں کے اُن چشموں کی طرف جا رہا ہے جو زندگی اور انسانیت کی شاداب وادیوں میں سرو و صنوبر کے جھنڈ میں بہہ رہے تھے۔

شاید وہ سفر ہی میں کہیں دم توڑ دے۔ شاید اُس کے پیاسے ہونٹوں کو اُن چشموں کا سرد اور شیریں لمس نصیب نہ ہو۔ لیکن اگر انسان اُس کے بعد بھی اُن راہوں پر چلتے رہے تو ایک نہ ایک دن وہ اُن چشموں پر ضرور پہنچ جائیں گے۔ ان کے سوکھے ہوئے پیاسے ہونٹ سرد اور شیریں پانی کی شاداب سطح کو بے اختیار ہو کر چوم لیں گے اور اُن کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی سچی چمک پھر عود کر آئے گی۔ اور انہی وادیوں میں، صنوبر کے جھنڈوں تلے، اُبلتے ہوئے شفاف چشموں کے کنارے انہیں وہ پر ملیں گے جنہیں اُن کے بازوؤں سے جدا کر کے وہاں پھینک دیا گیا تھا اور گلہ بان انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے تاریک کھڈوں کے دلدلوں میں اُتر گئے تھے۔

شہر کی گندی اور تاریک گلیوں میں کھیلتے ہوئے نیم عریاں بچوں کی منڈلیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اُسے ہر بچے پر اپنا بھائی اپنا بیٹا ہونے کا گماں ہوتا۔ راشن ڈپوؤں کے آگے خالی کنستر تھیلے اور برتن زمین پر رکھے قطار در قطار کھڑے آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو دیکھ کر اُسے محسوس ہوتا وہ اُس کے اپنے کنبے کے افراد ہیں جنہیں اس بھوکے ننگے دَور کے مہذب انسان سے

دانے دانے کا محتاج کر رکھا ہے۔ جو راشن ڈپوؤں میں اناج کے انباروں کے باوجود گمنامی اور اندھیرے میں فاقوں پر فاقے کر رہے تھے۔ جن کے بچے خالی پیٹ بستہ بغل میں داب کر اسکول پڑھنے جاتے تھے اور جن کے گھروں میں راشن کارڈ تو ہے مگر راشن نہیں۔ لکڑیاں نہیں مگر چولہے ٹھنڈے ہیں۔ زندگی ہے مگر جو خود زندہ نہیں۔ جو وقت سے پہلے ختم ہو رہے ہیں موت سے پہلے مر رہے ہیں ——— شہر سے باہر نکل کر اُس کی نگاہیں لمبی لمبی چمنیوں والے اُن کارخانوں کی طرف اُٹھ جاتیں جہاں جنگی سامان دھڑا دھڑ تیار ہو رہا تھا۔ اور جو دن رات، نفرت، دھواں، دُکھ اور موت اُگل رہے تھے۔

یہ کارخانے آدمیوں کے علاوہ اناج بھی کھاتے ہیں۔ یہ آدم خور نہیں اناج خور بھی ہیں انسان کو ان کارخانوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ہری بھری لہلہاتی کھیتیوں اور زرخیز زمین کی ہے۔ یہ جنگ قحط، بھوک اور غلامی کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن زمین امن، خوشحالی اور آزادی کا پیام دیتی ہے۔

ہم اُسے انسانی کھوپریاں اور گندگی دیتے ہیں اور وہ ہمیں گیہوں کی خوشبودار بالیاں اور میٹھے رنگدار پھل اور سرد چشمے عطا کرتی ہے۔ دھرتی نے ہمیشہ اپنے بچوں سے محبت کی ہے اور انہیں نیکی، سچائی اور محبت کا سبق دیا ہے۔ اُسکا کوئی راشن ڈپو نہیں کوئی راشن کارڈ نہیں ——— مٹھی بھر انسانوں نے ساری دھرتی کو آپس میں بانٹ لیا ہے اور لوگوں کے گھروں میں چولہے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں، کنستر گیہوں سے خالی ہو گئے ہیں۔ اور اُن کے بچے خالی پیٹ اسکول جانے لگے ہیں۔

وہ زمین کو اُن مٹھی بھر ڈاکوؤں کے چنگل سے آزاد کروانا چاہتا تھا وہ ہر گھر میں شام کے وقت چولہوں کو گرم دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہر خالی کنستر کو گیہوں سے بھر دینا چاہتا تھا اور ہر کمسن کو اسکول روانہ ہونے سے پہلے دودھ پلانا چاہتا تھا۔ وہ پژمردہ چہروں اور بجھی بجھی آنکھوں والے بھوکے ننگے، بھولے بھٹکے انسانوں کو شہروں کی سنگین سڑکوں تنگ و تاریک گلیوں اور بدبودار گھٹی گھٹی کوٹھڑیوں سے نکال کر قیمتی بیج کی طرح حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے زرخیز کھیتوں اور شاداب مرغزاروں میں بکھیر دینا چاہتا تھا۔ وہ اُن کی مدقوق زندگیوں پر تندرستی اور خوشحالی کی آخری مہر ثبت کرنا چاہتا تھا لوگ آپس میں گرمجوشی سے ملیں اور خندہ پیشانی سے جُدا ہوں۔ ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کریں زندگی کی دوڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ سوئیں اور طلوعِ آفتاب کے ساتھ مسکراتے ہوئے، تازہ دم بستر سے اُٹھیں ——— وُہ اس شئے کو مہنگے سے مہنگے داموں پر اُٹھانے کو راضی تھا۔ وہ اس سودے میں بڑے سے بڑا گھاٹا کھانے پر بھی تیار تھا۔

خود بیڑیاں پی کر، کھدر پہن کر، سوکھی سوکھی روٹی کھا کر وہ دن رات کی محنت سے ایک ایسے باغ کی آبیاری میں منہمک تھا جس کی سایہ دار روشوں، نرم نرم گھاس کے خطّوں، پھولوں بھرے تختوں اور پھل دار درختوں کی خوشبودار اور پُرسکون چھاؤں میں ٹہلنے والے نئے انسان کو بہترین سگریٹ، بہترین لباس، بہترین خوراک اور اعلےٰ ترین خیالات نصیب ہو سکیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنے ماں باپ کی چھوٹی چھوٹی، غیر اہم مسرتوں کو قربان کر سکتا تھا، اپنے بھائی کی محبت ہار سکتا تھا، طاہرہ کے حسین جسم اور خوب صورت آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو سکتا تھا۔ مگر اُن لوگوں کو اکیلا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا جن کا عمر بھر ساتھ دینے کی وہ قسم کھا چکا تھا۔

اُسے خبر ملی طاہرہ کی شادی اُس کے بڑے بھائی کے ساتھ ہو گئی ہے۔ ایک روز شام سے کچھ پہلے اُس نے شہر کے بڑے باغ میں طاہرہ کو ہلکے زرد رنگ کی ہلکی ساڑھی پہنے، بالوں میں ایک طرف چنبے کی سپید سپید کلیاں اڑائے، اپنے خاوند کے ساتھ ٹہلتے دیکھا اُسکا بھائی گولڈ فلیک سگریٹ کے ہلکے کش لے رہا تھا۔ اور مسکراتے ہوئے طاہرہ سے گفتگو کرتا جا رہا تھا۔

وہ بیڑی دانتوں تلے دبائے، دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں دیئے ایک طرف درخت سے ٹیک لگائے انہیں دیکھتا رہا۔ سڑک کے موڑ پر جا کر وہ کلب گھر کی طرف گھوم گئے وہ زیرِ لب ہنسا

اور واپس چل پڑا۔

وہ سوچنے لگا۔ اُس کا بھائی گولڈ فلیک کا دُھواں اُڑاتے بہترین سوٹ میں ملبوس ایک ایسی سڑک پر چل رہا ہے جو آگے آگے جا کر ایک ویران اور تاریک غار میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہاں وُہ سوائے اپنے آپ کے اور کسی انسان کو نہ پائے گا۔ اس غار میں چاروں طرف بڑے بڑے آئینے آویزاں ہوں گے اور اُسے ہر طرف اپنا ہی عکس نظر آئے گا۔

لیکن جس سڑک پر وہ پھٹا ہوا لمبا کوٹ پہنے، بیڑی منہ میں دبائے چلا جا رہا تھا اگرچہ ویران، اُجڑی اُجڑی اور تنہا تھی مگر اپنے اختتام پر ایک وسیع و عریض میدان میں نکل گئی تھی جہاں محبت کے بھوکے اور مہربان نظروں کے پیاسے، بے بس، بدنصیب، مصیبت زدہ انسانوں کا ہجوم اُس کے خلوص اور پیار کے میٹھے بول کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کا بھائی اپنے اردگرد ریشمی تاروں کا خول بن رہا تھا۔ اُس کی زندگی ریشم کے کیڑے کی زندگی تھی۔ مگر وُہ برگد کا پھیلی ہوئی گنجان شاخوں والا درخت تھا۔ جو تھکے ہارے پردیسی مسافروں کو اپنی ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے انسانوں کو اپنی ٹہنیوں کا ایندھن ———

اُس کا دل میٹھے پھلوں سے لدا ہوا پودا تھا اور وہ اپنے پھل دونوں ہاتھوں سے لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ چھپکلی کی مانند چھت کی بوسیدہ کڑیوں میں چھپے رہنے کی بجائے جگمگاتے ہوئے درخشاں سورج کی طرح پہاڑ کی چوٹی سے نور کا سیلاب لئے طلوع ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ اُس کی روشنی میں بھولے بسرے پردیسی اپنی راہ پہچان کر اپنے دیس پہنچ سکیں، کھیتوں میں پکی ہوئی فصل پک سکے اور خوشوں کے سیپ گیہوں کے موتیوں سے بھر سکیں۔

اُس کے دل میں طاہرہ کے لئے بڑی جگہ تھی۔ اُسے اُس کا بیضوی چہرہ، ذہین آنکھوں کی پُراسرار چمک، بوجھل جسم اور والہانہ انداز گفتگو بڑا پسند تھا۔ مگر وہ اُس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی کو محض ایک لڑکی کی محبت کے لئے وقف نہیں کر سکتا تھا۔ گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے اُس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اُس نے دیکھا وہ جیل کی تاریک کوٹھڑی میں قید ہے۔ اُسکی ڈاڑھی بڑی ہوئی ہے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ وہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے اور اُس کے اوپر سوائے ایک پتلے سے گندے کمبل کے اور کچھ بھی نہیں اور اُس کی طاہرہ ——— اُس کی بیوی گھر میں بیمار بچے کو چھاتی سے چمٹائے بیٹھی ہے۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں کی ذہین چمک ماند پڑ گئی ہے۔ اُس کے شبنمی ہونٹوں کا شہد سوکھ گیا ہے۔ اور گدرائے ہوئی نازک کلائیوں کی رگیں کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے اُبھر آئی ہیں۔ وہ اِس منظر سے سہم گیا۔

پھر اُس نے ایک اور تصویر دیکھی۔ طاہرہ عروسی جوڑا زیب تن کئے دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اُس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔ اُس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں اور باریک ہونٹ شدتِ غم سے قدرے اندر کو بھینچے ہوئے ہیں۔ اور اُس کی سہیلیاں اُس کے پاس بیٹھیں ڈھولک پر سہاگ گیت گا رہی ہیں۔

آیا نی لاڑیئے تیرا سہریاں والا....

. . . .

اور اُس کا سہرے والا برات کے دروازے پر پہنچ گیا ہے اور طاہرہ کی کانپتی ہوئی پلکوں پر آنسوؤں کے موتی لرز رہے ہیں سہیلیاں اُسے سہارا دیئے دھیرے دھیرے ڈولی کی طرف لئے جا رہی ہیں۔ طاہرہ کے قدم رک رک کر اُٹھ رہے ہیں۔ جیسے وہ اندھیرے میں چل رہی ہو۔ جیسے اُسے ہر قدم پر کسی گہرے کھڈ میں گر جانے کا احتمال ہو۔ اور پھر ایک دم روشنیاں بجھ گئیں تاریکی چھا گئی، طاہرہ کے قدم لڑکھڑائے اور اُس کی چیخ کھڈ میں دیر تک گونجتی رہی ———

وُہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ دن بھر پریشان رہا تھا۔ مگر اُس نے خواب کا دوسرا منظر اپنے لئے پسند کیا۔ اور وہ گھر سے نکل پڑا۔ اور طاہرہ کھڈ میں گر پڑی۔

لیکن ایک عرصہ بعد شہر کے باغ میں طاہرہ کو ہنسی خوشی اپنے خاوند کے ساتھ ٹہلتے دیکھکر اُسے بڑی خوشی ہوئی کہ طاہرہ

کھٹڑ میں نہیں گری تھی۔

وُہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اب وہ پوری توجہ سے کام کر سکیگا۔ اُس نے سوچا

کام، کام، کام —— ہر وقت کام، دن رات کام

اور بھوک، بھوک بھوک —— دن رات بھوک، طرح طرح کی بھوک —— دبی ہوئی، پسی ہوئی گھٹی ہوئی بھوک —— اُس کی صحت خراب رہنے لگی۔ ایک روز شیو بناتے وقت اُس نے کنپٹیوں پر بیک وقت دو تین سپید بال دیکھے۔ اُسے پہلی بار اُس بات کا زندہ ثبوت ملا کہ وہ کام کر رہا تھا۔ مگر یہ کام کی زیادتی ہی نہیں، بھوک کی زیادتی بھی تھی۔ اُس نے اکھیڑنے کی بجائے بالوں کو وہیں رہنے دیا۔

برسات شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے جبکہ کھیتوں میں دھان کی پنیری بونے کا موسم تھا۔ ملک کے شمالی دیہات میں کسانوں نے جاگیرداری ختم کرنے کے لئے عام بغاوت کر دی۔ کسان کمیٹی کے دفتر میں چھاپہ پڑا۔ چند ایک کارکنوں کے ساتھ اُسے بھی گرفتار کر لیا گیا اور بغیر کسی قسم کا مقدمہ چلائے اُسے دو سال کیلئے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

شروع شروع میں اُسے جس کوٹھڑی میں بند رکھا گیا وہ نو فٹ چوڑی اور بارہ فٹ لمبی تھی۔ اُسے پیشاب وغیرہ بھی اُسی کوٹھڑی میں کرنا پڑتا تھا۔ اُسے پڑھنے لکھنے کی سخت ممانعت تھی۔ یہ جگہ سرد، مرطوب اور بیحد غلیظ تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جو چوڑی دیواروں میں، چھت کے بالکل قریب اندر کو دھنسا ہوا تھا۔ یہاں سے ہلکی ہلکی روشنی کوٹھڑی میں مدہم غبار کی طرح پھیلی رہتی۔ دن بھر وہ چارپائی پر پہلو بدلتا رہتا۔ رات کو گرمی اور حبس ہو جاتا اور مچھر اُس کا گوشت نوچتے رہتے۔ پیشاب وغیرہ کی بدبو سے اُسکا دماغ پھٹتا رہتا۔ کوئی اُس کی کوٹھڑی کے قریب سے ہو کر بھی نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ ماہ اس قبر سے بھی بدتر کوٹھڑی میں، لیٹ کر، کروٹیں بدل بدل کر، ٹہل ٹہل کر، گذارہ چکنے پر اُسے ایک دوسری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا جو کافی کھلی اور روشن تھی اور جہاں پیشاب وغیرہ کا بھی الگ بندوبست تھا۔ یہاں وہ پڑھ لکھ بھی سکتا تھا۔

ایک دن اچانک اُسے بخار ہو گیا۔ دو دن تک وہ بخار میں نیم ہوش سا پڑا رہا۔ تیسرے روز اُس کا ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ اور اُسے دوائی دی گئی۔ مگر بخار نہ ٹلا۔ ڈیڑھ ہفتہ اُسی حالت میں گزر جانے پر اُسے ہسپتال وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ ہسپتال میں پہنچ کر اگرچہ بخار دن بھر کے لئے دفعہ ہو جاتا مگر شام ہوتے ہی اُسکا بدن گرم ہونا شروع ہو جاتا اور رات بھر وہ بخار میں بیہوش پڑا رہتا —— بخار کے علاوہ اب ہلکی ہلکی کھانسی بھی شروع ہو گئی۔ یہ حالت چھ ماہ تک رہی اور اُس کا بدن پہلے سے بہت لاغر ہو گیا۔ رنگ پیلا پڑ گیا اور آنکھوں کے گرد حلقے ظاہر ہو گئے۔ اُسکا ایکس رے لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا اسکے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اُس کے لئے روزانہ ڈیڑھ پاؤ دودھ کی سفارش کی۔ تین دن تک اُسے باقاعدہ صبح کو دودھ ملتا رہا مگر چوتھے روز وہ پتلا ہو گیا۔ اب اُس میں دُودھ کم اور پانی زیادہ ہونے لگا۔ اُس نے ڈاکٹروں سے شکایت کی لیکن دُودھ سے پانی جدا نہ ہو سکا۔ بلکہ اور بڑھ گیا۔ آٹے میں ریت اور کنکریں بدستور موجود رہیں

پورے دو سال قید بھگتنے کے بعد جب وہ جیل سے رہا ہو کر اپنے دوستوں سے ملا تو وُہ اُسے بمشکل پہچان سکے۔ اُس کے خد و خال بدصورتی کی حد تک بدل گئے تھے۔ وُہ دُبلا پتلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ اُس کی صحت کافی حد تک گر چکی تھی اور روز بروز گر رہی تھی کسی وقت اُسے اپنے آپ پر ایسے مجرم کا گمان ہوتا جیسے موت کی سزا دے دی گئی ہو اور جس کے لئے اپیل کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ وہ صحت اور تندرستی کا خواہشمند تھا کیونکہ وُہ کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے کسی صورت میں بھی موت کا استقبال کرنے کو تیار نہیں تھا۔ تاہم اُس نے جی نہ ہارا —— وہ برابر کام کرتا رہا۔ اور اُس کے سر میں جگہ جگہ سپید سپید بال روپہلی تاروں کی طرح چمکنے لگے۔ رات کو بلا ناغہ اُسے کھانسی کے دُورے پڑنے لگے۔ گالوں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں اور سیاہ حلقے زیادہ گہرے ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے اُسے پہاڑ پر چلے جانے کا مشورہ دیا۔

اُسے یُوں محسوس ہوتا گویا وہ کسی پیر فقیر کا مُرید ہے اور اُسے دنیا تیاگ کر پہاڑوں پر نکل جانے کو کہا جا رہا ہو —— پہاڑوں پر کیا ہوتا ہے؟ سردی اور پتھر ——!

کھانسی ایک گولہ سا بن کر اُس کے پھیپھڑوں سے اُٹھتی۔ یہ گولہ ہر جھٹکے کے ساتھ اُس کی پسلیوں سے ٹکراتا۔ پھر پھیلنے لگتا۔ اور اُس کا دم پھُول جاتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی شے اُس کے سینے میں پھٹنے کو ہو۔ اور اگر وہ پھٹ گئی تو اُس کے جسم کے پُرزے اُڑ جائیں گے۔ وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑتا اور ہانپنے لگتا اور اُسے طرح طرح کے تکلیف دہ کمزور اور غیر صحت مندانہ خیالات گھیر لیتے۔ وہ سوچتا وہ ایک بیوپاری ہے جس کا سارا مال گلا سڑا اور شکستہ صورت میں بوریوں سے نکلا ہے۔ اُسے عظیم ترین خسارے کا احساس ہوتا۔ اُسے زندگی میں کوئی ایسا لافانی کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس کے بدلے میں اُس سے تندرستی ایسی انمول شے چھین لی گئی تھی۔ اُس کا دل جو کبھی شیریں میووں سے لدا ہوا پودا تھا۔ سُوکھ کر مرجھانے لگا تھا۔ وہ سورج جو کبھی پہاڑ کی چوٹی پر بڑی آب و تاب سے طلوع ہوتا تھا اب ہیجان کی بستیوں اور مرغزاروں پر شام کی اُداس تاریکیوں کے ماتمی آنچل پھیلائے مغربی افق میں غروب ہو رہا تھا۔

کبھی وقت وہ جھنجھلا کر ایسے ناتواں اور بیمار خیالات کو دھکے دے کر دماغ سے نکال دیتا۔ جیسے وہ دیوانے ہوں جو پاگل خانے کی سلاخیں توڑ کر اُس کے کمرے میں گھس آئے ہوں۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا لیتا۔ لیکن یہ دیوانے —— یہ چھپکلیاں درزوں اور کونے کھدروں میں کہیں نہ کہیں چھپی رہتیں اور موقع ملتے ہی حملہ کر دیتیں۔

جیسے جیسے اُس کی صحت گرنے لگی تھی وہ لوگوں سے شرمانے لگا تھا۔ اُسے مضبوط اور صحت مند لوگوں سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ اُن سے ملتے ہوئے گھبراتا تھا اور اکثر کنی کترا کر نکل جاتا۔ اُسے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی شخص وہ بات —— وہ خوف ناک بات اُس کے منہ پر نہ کہہ دے جسے دل میں لاتے ہوئے بھی خوف کھاتا تھا۔ وہ چپ چاپ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہتا اور بہت کم کسی سے بات کرتا۔ اب موت کا خیال چوبیس گھنٹے اُس کے ذہن پر مسلّط رہتا۔ وہ ہر چیز کو یوں دیکھتا گویا وہ اُس کی الوداعی نظریں ہوں۔ سونے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں، کتابوں کیلنڈروں، فریم میں جڑی ہوئی آئیل پینٹ تصویروں، کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں، دروازے کی کنڈی، روشندانوں کے شیشوں اور چھت کی کڑیوں کو حسرت ناک نگاہوں سے تکتا۔ جیسے وہ انہیں آخری بار دیکھ رہا ہو۔ جیسے اُسے یقین ہو گیا ہو۔ صبح وہ اُن چیزوں کو دوبارہ دیکھنے کے لئے اس کمرے میں زندہ نہ ہو گا۔ لیکن اچانک ایک عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوئی۔

وہ درست ہونے لگا۔ اُس کی گرتی ہوئی صحت سنبھلنے لگی۔ جیسے کوئی سیڑھیوں پر سے مسلسل پھسلتا چلا آ رہا ہو اور آخری سیڑھیوں پر پہنچ کر سنبھل جائے اور کپڑے جھاڑ کر اطمینان سے اترنا شروع کر دے۔ اُس کا بخار ٹل گیا اور کھانسی کے دورے بھی کم ہو گئے۔ اُسے دفعتاً احساس ہوا کہ وہ قبرستان کی مردہ فضا سے بارونق شہر کی ہماہمی اور نت نئی رنگینیوں میں داخل ہو رہا ہے۔ اُس کے اُجڑے ہوئے ویران چہرے کی رونق بہت حد تک واپس آ گئی اور وہ کام میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔

دن بھر وہ دوستوں سے جی بھر کر ہنسی مذاق کرتا، دھوپ، روشنی اور لوگوں کی باتوں اور درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی میٹھی بولیوں کا لطف اٹھاتا اور رات کو بھرپور نیند سوتا۔ صرف کبھی کبھی بازاروں سے کوئی جنازہ گزرتے دیکھ کر یا کہیں موت کا ذکر سُن کر اُس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ جیسے موت کوئی قرض خواہ ہو جس کی ایک بہت بڑی رقم اُس کے ذمّے واجب الادا ہو۔ تاہم وہ عام طور پر خوش خوش رہنے لگا۔ اُس کے دماغ میں سادہ، روشن اور تندرست خیالات آنے لگے اور وہ اُن مُہلک اور خوف ناک خیالوں سے دُور ہٹتا گیا جو ایک مدّت سے اُس کی روح کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہے تھے۔

ایک سال گزر جانے پر جبکہ اُس کی گئی ہوئی تندرستی تقریباً واپس آ

چکی تھی اور وہ تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا تو اُسے کسی خاص مصلحت کی بنا پر نہ معلوم عرصے کے لئے روپوش ہونا پڑ گیا۔ ایک شام وہ سوٹ کیس اٹھائے دفتر سے نکل کر سٹیشن پہنچا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی رات بھر میدانوں، کھیتوں اور ویرانوں میں سفر کرتی رہی تیسرے درجے کی مدہم روشنی میں لوگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے اونگھ رہے تھے۔ اور ان کے غمزدہ چہروں پہ بے بسی اور درد کی جھلک تھی۔

علی الصبح جب کہ مشرقی آسمان پر سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے کو تھیں اور ٹمٹماتے ستاروں کی ہلکی چمک میں رات کے آخری کمزور سائے ماند پڑ رہے تھے وہ ایک غیر آباد چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتر پڑا۔ یہ موسمِ گرما کا اخیر تھا اور صبح کی تازہ ہواؤں میں کھیتوں کی مہک اور شبنم کی نمی تھی۔

وہ ایک طرف پیدل چل پڑا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ تاڑوں کی چھاؤں میں تین میل چلنے کے بعد وہ ایک قصبے میں داخل ہو گیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور چوڑے اور ہموار کھیتوں میں دور تک روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی۔ قصبے میں اُس نے ایکہ کرائے پر لیا اور دس میل شمال مشرق کی جانب ایک پرانے اور تاریخی گاؤں میں اُتر پڑا۔ وہاں سے چار میل کچے اور غیر ہموار سفر کے بعد وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ یہ ایک گمنام اور تنہا گاؤں تھا۔ جہاں اُسکا ماموں اپنی تھوڑی سی زمین کے سہارے پورے کنبے کا پیٹ پال رہا تھا۔ یہاں آ کر اُس نے بہت جلد اپنے لئے ایک کام تلاش کر لیا۔ وہ دن بھر ماموں کے بچّوں کو انگریزی اردو وغیرہ پڑھاتا اور شام کو ادھر اُدھر کافی لمبی سیر کے بعد اپنی کوٹھڑی میں دیا جلا کر دیر تک پڑھتا لکھتا رہتا۔ اُس کی کوٹھڑی کے بالکل سامنے ایک پرانا تالاب تھا جس کی سطح پر سبز کائی اُگ رہی تھی اور گندے پانی میں بقول اُس کے ماموں بوڑھی اور بیمار مچھلیاں رہتی تھیں۔ کسی وقت وہ علی بخش لوہار کی دوکان پر جا کر اُس سے گاؤں کی فضائی اور وہاں ایک اسکول کھولنے کی سکیم پر باتیں کرتا رہتا۔

سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی جبکہ کھیتوں میں گنے کی کاشت شروع تھی اور راتیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں اور ڈھور ڈنگر چھتوں کے نیچے بندھنے لگے تھے، اُسے ایک رات ہوا سی لگ گئی اور بخار ہو گیا۔ رات بھر اُس کا بدن انگارا گرم رہا مگر صبح ہوتے ہی بخار خود بخود اُتر گیا اور وہ اُٹھ کر چنگا بھلا ادھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ لیکن شام کو بخار نے پھر آ لیا۔ اُس کے ماموں نے مسجد کے امام سے جو حکیم بھی تھا دوا منگوا کر عرق گاؤزبان میں گھول کر اُسے پلائی مگر ہلکا ہلکا بخار بدستور موجود رہا۔ وہ ایک پریشان سا ہو گیا۔ جیسے کسی نمازی کے آگے سے کوئی بچہ گزر جائے اور اُسکے سکون اور عبادت میں خلل آ جائے اور اُسے نماز توڑ دینا پڑے۔

وُہ بھیانک کر خوفناک خیال جو اُس کے دل کے کسی کونے میں دبا پڑا تھا موقع پاتے ہی آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھا اور کسی فاتح کی طرح اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دن کے وقت وہ بچّوں کو پڑھانے اور ادھر اُدھر گھومنے پھرنے میں مشغول رہتا مگر رات کو جب وہ مطالعہ ختم کر کے دیئے کو پھونک مار کر کمبل منہ پر کھینچتا تو اندھیرے کی دبیز تہوں میں وہ خوفناک خیال ایک تاریک غار کا روپ دھار کر منہ کھولے اُسکی طرف دھیرے دھیرے سرکنے لگتا۔ اس کا بدن پہلے کی طرح ایک بار پھر کمزور پڑنے لگا۔ چہرے کا رنگ پیلا اور سبزی مائل ہونا شروع ہو گیا۔ زیادہ چلنے پھرنے کے بعد اس کا بند بند دُکھنے لگتا بدن میں نقاہت آ جاتی اور پھول جاتا۔

ایک دن ——— جنوری کی ایک چمکیلی اور روشن دوپہر کو ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اُس کے سینے میں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کی سانس اُوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ وہ درد کو دبائے علی بخش لوہار کی دوکان پر بیٹھا اُس سے دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ تالاب کے قریب چھکڑے کے پاس پہنچ کر اُس پر اچانک کھانسی نے حملہ کر دیا اور وہ بڑی طرح کھانسنے لگا۔ یہاں اُس نے پہلی بار خون تھوکا۔

کوٹھڑی میں پہنچکر دروازہ بند کرتے ہوئے اُسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا اور اُسکے منہ سے خون کا لعاب بہہ نکلا۔ اُسے محسوس ہوا اب کھیل ختم ہونا چاہتا ہے۔

* * * * * * * * * * * * *

اُس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اُس نے منہ پر سے لحاف سرکایا اور ہانپنے لگا۔ جیسے اُس نے کسی وزنی پتھر کو اُٹھا کر دُور پھینکا ہو۔ طاق میں جلتے ہوئے دیئے کا تیل ختم ہو رہا تھا اور اُسکی نرم روشنی دم بدم پھیکی ہو رہی تھی۔ سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی شیروانی کے قریب ہی ایک سیاہ رنگ کی چھپکلی کسی شے پر داؤ لگائے بالکل ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ جیسے مر گئی ہو ——— روشنی میں شیروانی ایک ایسی لاش لگ رہی تھی۔ جیسے پھانسی کے بعد شہر کے دروازے میں لٹکا دیا گیا ہو۔ سوٹ کیس پر رکھے ہوئے گرد آلودہ بوٹ پھول کر دو بڑی بڑی قبروں میں تبدیل ہو گئے جن میں کیڑوں مکوڑوں نے اپنے گھر بنا رکھے ہوں۔

موت آگئی، موت آگئی،

کوٹھڑی کی نیم روشن بیمار فضا میں جیسے چمگادڑیں غوطے لگا رہی تھیں۔ اُس نے خیال ہی خیال میں دیکھا لوگ اُسکا جنازہ لیے گاؤں کے قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اُسکا ماموں سب سے آگے آگے ہے۔ اُسے لحد میں اُتارا جا رہا ہے۔ اُس پر گلاب چھڑکا جا رہا ہے اور پھر قبر مٹی سے بھری جا رہی ہے۔ وہ دبا جا رہا ہے ——— پسا جا رہا ہے۔ اُسکے سینے پر منوں مٹی کا سنگین بوجھ پڑ گیا ہے۔ اُس کی چھاتی پھٹنے لگی ہے۔ سانس رکنے لگی ہے۔ وہ بے اختیار چیخ اُٹھا۔ مگر یہ چیخ مدّہم اور بے حد نحیف تھی۔ جیسے اُس نے ہلکی سی آہ بھری ہو۔ اُس نے بولنا چاہا مگر آواز اُسکے حلق میں یوں تحلیل ہو گئی جس طرح خشک ریت میں پانی ——— ایک تاریک پردہ اُس کی آنکھوں میں کھینچ گیا جس پر بڑے بڑے سُرخ دھبے ناچ رہے تھے۔

اُسے یقین ہو گیا کہ موت نے آخر اُسے آلیا ہے۔ اب وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔

اُسے اپنی ماں کا خیال آیا۔ وہ کیا کر رہی ہو گی شاید وہ سو رہی ہو گی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اُسکا غمزدہ بیٹا اِس دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو اُسے بالکل خبر نہ ہو گی۔ اُس نے آج تک اُس کی کوئی خدمت نہ کی تھی۔ کاش وہ اُسے معاف کر دے۔

اُسے طاہرہ یاد آئی۔ ایکا ایکی باریک ہونٹوں کی شبنمی لمس کو اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر محسوس کرنے کی خواہش شعلے کی طرح اُسکے دل میں بھڑک اٹھی۔ مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا جہاز کا نصف حصّہ جو تھائی حصّہ ڈوب چکا تھا۔ وہ اِس جہاز کو کسی نہ کسی طرح ڈوبنے سے بچا لینا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ ——— نیچے اور نیچے ——— پانی تیزی سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اب صرف عرشہ اور چمنیاں ہی باقی تھیں۔

اُس کی آنکھوں میں غم اور دُکھ کے آنسو جھلملا اُٹھے۔ اُس نے ...... آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں اور گرم آنسو اُس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

اس کے سینے کا درد اب بالکل بند ہو چکا تھا اور سانس گہری اور پرسکون ہو گئی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا گویا وُہ بالکل تندرست ہو اور کبھی بیمار نہ رہا ہو۔ موت کے بالکل قریب پہنچ کر وقت اور فاصلے کی حدیں اُٹھ گئی تھیں اور وہ ہر شے کو ماضی حال اور مستقبل کو بے نقاب دیکھ رہا تھا۔ اُسے اس بات کا اطمینان تھا کہ اگرچہ طاہرہ کی محبت اُسے نصیب نہیں ہو سکی گولڈ فلیک کے سگرٹوں سے وُہ ہمیشہ محروم رہا تھا اور خوشحال گھرانے کی جگہ اُس نے جوانی کے بیش قیمت سال جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند رہ کر گزار دیئے تھے پھر بھی اُس کی زندگی رایگاں نہیں تھی۔ اپنے لئے نہ سہی لیکن اُن لوگوں کے لئے اُس نے کچھ نہ کچھ ضرور کیا تھا جو اِس زمین پر زندہ رہنے کے باوجود زندگی کے حقوق سے محروم تھے۔ جو شہروں میں بسنے والے انسانوں کے لئے خود بھوکے رہ کر روٹی مہیّا کرتے ہیں اور ننگے رہ کر اُن کے بچّوں، اُن کی عورتوں کا تن ڈھانپنے کا رُخ کرتے ہیں جو دہکتی ہوئی بھٹیوں کے سامنے دن بھر لوہا کوٹتے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

وہ مر رہا تھا مگر اُسے پورا بھروسہ تھا وُہ بیج جو اُس نے بویا تھا ایک نہ ایک دن دھرتی کا سینہ چیر کر ضرور پھوٹ پڑے گا۔ وہ درخت جن کی اُس نے آبیاری کی تھی ایک دن جھنڈوں کی شکل میں اُگ کھڑے ہوں گے۔ وہ نہیں ہو گا مگر اُس کے لاکھوں تھکے ماندے بھائی اُن کی گنجان چھاؤں میں آرام کریں گے۔ اُسکا کام اتنا اہم نہیں تھا کہ اُس سے تاریخ کا رُخ پلٹ سکتا۔ وقت کا دھارا موڑا جا سکتا۔ تاہم وُہ اتنا معمولی بھی نہیں تھا کہ اُسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ وقت کی عظیم ترین مشین میں اُس نے ایک اہم ترین پُرزے کا کام سرانجام دیا تھا۔ یہ

پُرزہ اپنی جگہ پر ایک مکمّل مشین کی حیثیت رکھتا تھا۔

سورج طلوع ہونے کو تھا، چشموں کا پانی اُبلنے کو تھا، بیج دھرتی کی چھاتی سے پھوٹ نکلنے کو تھا۔ چھوٹی چھوٹی ان گنت لہریں سمندر کی سطح پر اُبھر رہی تھیں اور یہ چھوٹی لہریں جب آپس میں مل کر بہنے لگتی ہیں تو بپھرتی ہوئی موجوں کا روپ دھار لیتی ہیں اور بپھرتی ہوئی موجیں۔ ....

اُس نے آہستہ سے پلکیں کھول دیں۔ اُسے ہر شئے مدہم اور دھند میں لپٹی ہوئی نظر آنے لگی۔ کھڑکی میں رکھی ہوئی چیزیں، سوٹ کیس پر پڑے ہوئے گرد آلود بوٹ، دیوار سے لٹکی ہوئی شیروانی —— سب کچھ بے معنی اور مبہم معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ انہیں بہت دُور سے دیکھ رہا ہو۔ اُسے اپنے ماموں کا خیال آیا۔ اُس کی عام کسانوں ایسی سیدھی سادی صورت اُس کی آنکھوں میں آ گئی۔ اور پھر یہ صورت جیسے خود بخود کہیں ڈوب گئی۔

گزرتے ہوئے دن، دوستوں اور پیاروں کے میٹھے اور کڑوے بول، دیکھے بھالے مہربان اور نامہربان چہرے، اجنبی اور غیر مانوس اشیا کی طرح اس کے سامنے سے گزر کر بلبلوں کی مانند یکے بعد دیگرے پھٹتے گئے۔ اُس نے ہونٹ ہلانے چاہے۔ مگر وہ اس کوشش میں ناکام رہا۔ اُس کے ہونٹ جیسے سُوج کر بوجھل ہو گئے تھے جیسے کسی نے اُن پر گوندھے ہوئے آٹے کا پیڑا رکھ دیا ہو۔ اُس نے ایک ہاتھ اٹھانا چاہا مگر وہ بمشکل اُسے ہلا سکا۔ کوئی ان دیکھی، پُر اسرار اور طاقتور شئے بڑی تیزی سے اُس کے جسم کی رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر رہی تھی۔

کھیل ختم ہو رہا تھا اور اب دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اُسکی زندگی میں ایک دن کا اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ دیئے کی لَو مدہم سے مدہم تر ہو رہی تھی۔ ماند پڑتی ہوئی پھیکی روشنی طاق کے گرد سمٹ رہی تھی۔ اور وہ بڑے سکون کے ساتھ زندگی سے دُور ہو رہا تھا۔ دُھند —— تاریکی —— خلا

اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں اور وہاں سفیدی سی چھانے لگی تھی۔ اُس کی نظر جیسے واپس اُس کی آنکھوں میں آ رہی تھی۔ اُس نے دیوار پر سیاہ چھپکلی کو کسی شئے پر جھپٹتے دیکھا۔

اور یہ زندگی کا آخری نشان تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ —— وہ اسے دیکھنے، سمجھنے، سوچنے اور سُننے کی حدود سے پرے بہت پرے پہنچ چکا تھا۔

* * * * * * * * * *

اور پھر دیا بجھ گیا۔ کوٹھڑی میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔ اور باہر سرد آسمان پر ستاروں کی ٹولیاں بلک بلک کر چمکنے لگیں، ڈوبنے لگیں اور ڈوبتی گئیں اور مشرق کی جانب پہاڑیوں کے اوپر طلوع ہونیوالے سورج کا نور پھیل گیا۔ اوس میں بھیگے ہوئے جھکے ہوئے گیہوں کے نازک خوشوں پر شبنم کے آنسو تڑپ —— تڑپ —— نیچے گرنے لگے۔

اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتے پھیلتے نور کی ہلکی نیلی روشنی کوٹھڑی کی بند کھڑکی کی درزوں میں سے چھن چھن کر دھرتی کے گمنام لال کے پُرسکون چہرے پر کا نور بن کر بکھر گئی اور تازہ ہوا نے مہربان ماں کی طرح شہید بیٹے کی پیشانی پر اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

پروفیسر اختر اورینوی

اُنہیں مُردے نہ کہو

——"خداوند خدا یوں کہتا ہے۔ کہ تم دو دفعہ اسیر کئے جاؤ گے یہوواکا غضب تم پر بھڑکے گا۔ تمہارے پلونٹھے مارے جائیں گے تمہاری کنواریوں کی چادرِ عصمت کو تمہارے دشمن تار تار کر دیں گے۔ تم اپنے گھروں میں غلام بنائے جاؤ گے۔ تمہارے ہیکل لوٹ کر ویران کر دیئے جائیں گے۔ اور یہ اس لئے ہو گا۔ کہ تم نے خداوند خدا، اسرائیل کے پروردگار کی نافرمانی کی۔ خداوند خدا یوں کہتا ہے۔ کہ تم مُلک مُلک میں خانماں برباد و ذلیل مارے پھرو گے۔"

——محمود حلمی تل عقیف سے یروشلم جانے والی سڑک پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ مختلف باتیں اُس کے ذہن میں اُبل رہی تھیں۔ پُرانے عہدنامہ کے حوالے مُبہم طور پر اُس کے حافظہ کے پردہ پر اُبھر رہے تھے۔ وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا ایک شامی طالب العلم تھا۔ اُس نے عرب عسکرِ آزادی میں رضاکارانہ طور پر شرکت کی تھی اُس کا بائیس سالہ شباب، لانبا چھریرا بدن، تیکھا ناک نقشہ، سُرخی مائل زیتونی رنگ اور اُس کی ارادہ و عزم سے چمکتی ہوئی عقابی آنکھیں ہمہ تن مدافعت و اقدام معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اُس کے تیور میں کچھ ایسی ادائیں بھی تھیں جس سے یہ صاف جھلکتا تھا۔ کہ عزم و عمل کی قوّت کے ساتھ ساتھ اُس کے دماغ میں فکر و تخئیل کی طاقت بھی تھی فلسطین پر صیہونی حملہ کے دفاع کے لئے وہ صرف جوش و ولولہ کے ماتحت ہی نکل نہیں آیا تھا۔ بلکہ نہایت غور و فکر کے بعد۔ وہ یونیورسٹی کا ایک سنجیدہ فرد تھا۔ مساوات و جمہوریّت کا حامی۔ اُس کی عادتیں سادہ تھیں۔ وہ ہمیشہ ایثار پسند رہا تھا۔ اور انسانی اخوّت کا قائل حبش کی تباہی پر اس کا دل رویا تھا۔ انڈونیسیہ کی جمہوریّت اور چین کی خلقت کی بربادی پر اُس کی جان گھُلی تھی۔ نازیت کے مظالم، اور روس کی جنتا کی خونابہ فشانی سے اُس کی رُوح

چیخ چیخ اُٹھی تھی۔ مگر آج اُن ساری باتوں کو سوچ کر اُس کے دل و دماغ میں ایک تشویش تھی۔ یہ اُلجھن کبھی خلفشار کی کیفیّت اختیار کر لیتی تھی۔ وہ غم و غصّہ سے بھر جاتا۔ اُسے حیرت ہوتی کہ جب صیہونی فسطائیوں نے مظلوم و مفلس فلسطین پر حملہ کیا اور لاکھوں عربوں کو بہیمانہ وحشت و بربریّت کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا تو آزادی، جمہوریّت و مساوات کے حامیوں کو کیا ہوا کہ ان میں سے اکثر ظالم کی تائید کرنے لگے اور بقیہ مجرمانہ طور پر خاموش ہو بیٹھے وہ ابھی تل عقیف اور یروشلم کے درمیان سڑک پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ وہ پتھر کی ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی رائفل اُس کی آغوش سے ایک شریکِ حیات کی طرح ملی تھی۔ اُس کا دستہ پہرہ پر معمور تھا۔ یہودی یروشلم کے محاصرہ کو توڑنے کے لئے بڑی جدوجہد کر رہے تھے۔ عرب افواج نے یروشلم کے قدیم شہر کو فتح کر لیا تھا اور اب نئے یروشلم کی یہودی تجارتی منڈی کا محاصرہ تھا۔ متذکرہ بالا شاہراہ کی حیثیت رگِ جاں کی تھی۔ عرب جیالے اپنے ننگ و ناموس اور اپنے وطن و مِلّت کی حفاظت کے لئے جان لڑا رہے تھے۔ اور صیہونی حملہ آور ٹینک اور بکتر بند موٹریں استعمال کر رہے تھے۔ امریکی سرمایہ دار اور روسی کارخانے اُن کی مدد پر تھے۔ جنگ کی رفتار ابھی ذرا تھم گئی تھی۔ وہ اپنے مورچہ سے نکل کر دو گھڑی کے لئے نیلے گرم آسمان، چٹیل اور سنولائی پہاڑیوں، اور زیتون کے توانا اشجار کو دیکھ کر زندگی کی گراں بہا لذّت حاصل کر رہا تھا۔ پاکیزہ ہوا اُس کے رخساروں سے کھیل رہی تھی اور اُس کے فکر و تخئیل کے لئے مہمیز بن رہی تھی

وہ سوچ رہا تھا کہ صیہونی مطالبے میں کیا کوئی دور کی بھی حق داری ہے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے رومیوں نے یہودیوں

کو فلسطین و شام سے جلا وطن کر دیا تھا۔ یہ خفیہ ریشہ دوانیاں کرنے والی، آپس میں تفرقہ رکھنے والی، اپنوں سے غداریاں کرنے والی اور اپنے ہی خواہوں کو قتل کرنے والی بدنصیب قوم سارے کرۂ ارض پر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ سے اِس نے اپنی نا اہلی کے باوجود دنیاوی بادشاہت کا مطالبہ کیا تھا۔ مسیح نے جواباً کہا تھا کہ "میری بادشاہت تو آسمانی ہے"۔ پھر اس مغضوب قوم نے امن کے شہزادے کو، اپنے خون اور اپنے گوشت کو، اپنے نجات دہندہ کو صلیب پر لٹکوا دیا ۔۔۔ "خداوند خدا یوں کہتا ہے کہ اُس کا غضب تم پر بھڑکے گا۔ اور یہ اس لئے ہوگا۔ کہ تم نے خداوند خدا، اسرائیل کے پروردگار کی نافرمانی کی"۔

پرانے عہدنامہ کی پیشگوئیاں اُس کے ذہن میں رہ رہ کر اُبھر رہی تھیں۔ اچانک اُس کا جسم خوف سے لرز اٹھا۔ پروردگار کی نافرمانی اور اُس کا غضب تم پر بھڑکے گا۔ یہ الفاظ بار بار اُس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ "تمہارے پلوٹھے مارے جائیں گے اور تمہاری کنواریوں کی چادرِ عصمت کو تمہارے دشمن تار تار کر دیں گے"

اُس کے رخساروں پر غیرت اور غم و اندوہ میں غلطیدہ خون کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے وہ قتلِ عام یاد آنے لگا۔ جو گذشتہ دنوں صیہونی یہودیوں نے مفتوحہ عرب آبادی کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ننھے بچے، جوان اور بوڑھے مرد اور عورتیں تہ تیغ کر دی گئی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ عرب تو یہودیوں سے زیادہ مغضوب ہو رہے ہیں۔ خود یہود کے ہاتھوں مقہور۔ وہ اس داغِ رسوائی کو مٹانا چاہتا تھا۔

بہر قیمت! بہر قیمت! اپنے خون سے۔ سارے عرب کے باحمیت خون سے۔ اُس کا ہاتھ بے اختیارانہ رائفل سے مربوط ہو گیا۔ مگر پرانے عہدنامہ کی پیشگوئیاں اُس کے دماغ کی تہوں میں منڈلاتی رہیں۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ داخلی طور پر ایک آئینہ دیکھ رہا ہے جس میں اُس کی قوم کی صورت بھی نظر آ رہی تھی خیالات کی اس خاص رَو کی تلخیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ چٹان پر سے اُتر آیا اور اپنے رفیقوں سے ملنے کے لئے مورچے کی طرف بڑھا۔ حریتِ عرب کے علمبردار مورچے کے قریب سر بکف بیٹھے۔ قہوہ

پی رہے تھے۔ گہرا سُرخ، گرم اور خوشبودار قہوہ۔ خالص عربی قہوہ۔ ان نوجوان مجاہدوں کے پاس راشن کی قلت تھی۔ اکثر وہ قہوہ پی کر ہی گذارتے تھے۔ اُن کے پاس کافی اسلحے بھی نہ تھے۔ اقوامِ متحدہ کے امن پسند اراکین نے اسلحوں کی درآمد پر امتناعی پابندیاں لگا دی تھیں۔ اگرچہ روسی پردۂ حدیدہ کے اُس پار سے اسرائیل کی نام نہاد حکومت کو جدید ترین اسلحے اور طیارے مل رہے تھے۔ اور "بحرِ ظلمات" کے ساحلوں پر قائم حکومتوں کے خزانوں سے زرِ خالص آ رہا تھا۔ تو اُس کی ذمہ دار بھلا اقوامِ متحدہ کس طرح ہو سکتی تھیں۔ اُس نے اپنے رفیقوں کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ایسی محبت جو صرف میدانِ جنگ کے رفقاء کے درمیان ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اُس کے دل میں انہیں دیکھ کر تازہ اعتماد پیدا ہوا۔ رفیقوں کی آنکھوں میں عزم و توکل جھلک رہا تھا۔ جو بِن ہتھیار اور بلا غذا کے بھی آمادۂ ستیز کر دیتا ہے۔

"ایک فنجان اِدھر بھی"۔ محمود حلبی نے عادتاً کہہ دیا۔ پھر سنبھل کر بولا ۔۔ "رفیقو! معاف کرنا! ہم دمشق یا قاہرہ کے قہوہ خانوں میں بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ ادک میں ہی مل جائے تو غنیمت"۔

"یہ مگ حاضر ہے۔ اور بوترابوںؓ کے لئے یہ بھی نہ ہو تو کیا ہے"

"تم پر فیضِ بوترابیؓ میں کیا شک ہے رفیقو۔ تم بابُ الحجاز کی حفاظت کر رہے ہو۔ تم روضۂ نبی کے پاسبان ہو۔ تم کعبہ کے محافظ ہو۔ یورپ اور امریکہ کے سرمایہ دار۔ صیہونی یہود ناحق ہمارے وطن پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ اُن کی نیتیں اُن کے اعمال سے زیادہ سیاہ ہیں۔ اُن کا آخری نشانہ مدینہ اور مکہ ہے۔ وہ جمہوریتِ اسلامی اور ہماری بین الملیت کی جڑوں کو اکھیڑ پھینکنا چاہتے ہیں"۔ وہ سنجیدہ جوش کے عالم میں سرگرمِ سخن تھا۔ اُفقِ مغربی سے آنے والی آتش باری کی پیہم آوازوں نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ہر شخص چوکس اور ہوشیار ہو گیا۔ پھر بم اور ہینڈ گرنیڈ پھٹنے کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ یہ نوجوان عسکری میدانِ جنگ میں اب تک اتنے تجربے حاصل کر چکے تھے۔ کہ وہ مختلف آتش بار اسلحوں کی منفرد گونج اور گرج اچھی طرح پہچاننے لگے تھے۔ سبھوں نے اپنے اپنے اسلحہ سنبھال لئے اور ہر مجاہد مقررہ مقام پر تیزی سے پہنچ گیا۔ چشم براہ، چشم انتظار میں

کٹے اور سنگین چٹانوں کے جگر کے اندر دفاعی پِل باکس، دلِ مضطرب کی طرح دھڑکنے لگے۔ آسمان کے نیلے سلیٹ پر ایک طیارہ صلیب کے نقوش بناتا ہوا گزر گیا۔ جلد ہی اس کے فرّاٹے کی آواز بھی فضا میں تحلیل ہو کر گم ہو گئی۔ ہر طرف سنّاٹا چھا گیا۔ دُور کی آتش باریاں بھی بند ہو گئیں۔ مُبہم امکانات سے لبریز سکوت ماحول پر طاری تھا۔ محمود حِلمی اپنی چھوٹی دُوربین سے مغربی اُفق کے پردوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک داہنی جانب نارنج کے کُنج سے مشین گنوں کے متصل تڑاخے سُنائی دینے لگے۔ حملہ شمال کی طرف سے ہو گیا تھا مورچے کے افسر نے جوابی کارروائی کے احکامات صادر کئے۔ مجاہدین نے بھی حملہ آور دشمن کے رُخ پر گولیاں برسانی شروع کیں آگ کے بدلے آگ۔ محمود حلمی اپنے فرض سے ایک ثانیہ کے لئے بھی غافل نہ ہوا۔ اُس کی دُوربین نگاہیں تل عفیف کی طرف سے آنے والی سڑک اور اس کے اطراف و جوانب کی ایک ایک چٹان، ہر ہر سنگریزے اور ہر پیچ و خم کا محاسبہ کر رہی تھیں۔ حِلمی کے گرداگرد گولیاں برس رہی تھیں۔ اور شل پھٹ رہے تھے۔ لیکن وہ خطرات سے بے پرواہ دشمن کی سرحدوں کو اپنی نگاہ کے نیزے سے بلا توقف کھُرچ رہا تھا۔ اپنے رفیقوں کی رائفلوں اور مشین گنوں کی گونج اور گرج اُسے بہت ہی سُہانی معلوم ہو رہی تھی۔ دوربین پر ہاتھ رکھے وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ "ناخن کے بدلے ناخن، دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ"

مغربی اُفق پر ایک دھبّہ نظر آیا۔ دھبّہ پھیلتا گیا۔ آسمان اور زمین کے کناروں پر پل چل تھی۔ دھبّہ نے حرکت و حیات کی صورت اختیار کر لی۔ محمود حلمی کی دُوربین نے اُفق اُفق کھنگال دیا۔ اس نے صاف طور پر دیکھا کہ انسانوں کا ایک مجمع افراتفری میں مشرق کی طرف بھاگا آرہا ہے۔ مغرب میں آتش باری بھی تھم گئی۔ مگر مجمع قریب ہوتا گیا۔ اب یہ واضح تھا کہ وہ عرب خانماں برباد پناہ کی تلاش میں اِدھر آرہے تھے۔ اُن کا اکثر حصّہ سڑک پر ہی مسافت طے کر رہا تھا۔ عورتیں چادروں اور برقعوں سے بے نیاز بچّوں کو گود میں اٹھائے یا کوئی بوجھ سر پر لئے ہانپتی کانپتی بھاگی آرہی تھیں۔ بوڑھے جوان۔ مرد لانبے لبادوں کو سمیٹے اپنے سامان و اسباب سروں، کاندھوں اور بغلوں میں لئے لپکتے یا دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ حلمی بہت ہی مُشوّش ہوا۔ وہ نہتّے بے خبری میں میدانِ کارزار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بہت قریب آ گئے۔ حلمی نے ایک نوجوان رفیق کو اُس جانب دوڑایا جو پیکِ جنگی (ڈسپیسچ رائڈر) تھا تاکہ عرب مُہاجرین کو متنبہ کیا جائے اور اُنہیں جنوبی جانب چکّر کاٹ کر مشرق کی سمت بڑھنے کی ہدایت دی جا سکے۔ مگر مہاجرین کا مجمع سیدھے سڑک پر بڑھتا ہی آیا۔ پیک نے آکر حلمی کو اطلاع دی کہ مہاجرین کے عقب میں یہودیوں کا ایک مسلح دستہ ہے۔ وہ عربوں کو زبردستی اس راہ پر لا رہا ہے۔ یہ ہمرنگِ زمین دام تھا۔ "کمفلاح"! حلمی نے فوراً افسر کو اطلاع دی اور وہ خود بھی فکر میں ڈوب گیا۔ رفیقوں کو اب دو جانب سے حملہ کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ مگر دقّت یہ تھی کہ سامنے نشانہ پر عرب مہاجرین تھے۔ یہ شرارت صیہونیوں نے مُرتّب نقشہ کے مطابق کی تھی۔ محمود حلمی نے دیکھا کہ مغرب سے تین برن گن کی حامل موٹریں تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہی ہیں یہودیوں نے نئے رُخ سے آتش باری شروع کر دی۔ اس نئی سمت میں جواب دینا محال تھا۔ سامنے بے کس و بے بس عربوں کے سینے کھُلے ہوئے تھے۔ حلمی اضطراب میں چیخا۔

بھائیو! جنوب کی جانب! جنوب کی جانب! مہاجرین کا اگلا حصّہ جنوب کی سمت دوڑ پڑا۔ حلمی نے دیکھا۔ وہ پٹ پٹ مُنہ کے بل گرنے لگے۔ صیہونیوں نے اُس طرف باڑ مار دی۔ ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ تماشِ جنگ اُلجھا ہوا تھا اور مہاجرین جدھر سینگ سماتا بھاگے جاتے تھے۔ اُفتاں و خیزاں و نالاں۔ صیہونی گولیاں ان کا صفایا کر رہی تھیں۔ عرب حفاظتی مورچہ پر بھی شل برس رہے تھے۔ شمال اور مغرب سے سخت حملہ ہو رہا تھا۔ دو گھنٹوں کی خوں ریز جنگ کے بعد عرب مورچہ ٹوٹ چکا تھا۔ محمود حلمی چند اور رفیقوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا

اب وہ کہیں نام نہاد مملکتِ اسرائیل کے حلقۂ محصور میں تھا۔ اسرائیل، فلسطین کے دِل کی ایک قاش، عرب کے

جگر کا تراشہ جسے اقوام متحدہ کے اربابِ ثلاثہ نے یورپ اور امریکہ کے باشندے، صیہونی بھیڑیوں کے آگے خون چوسنے کے لئے پھینک دیا تھا۔ حلمی ہزاروں عربوں کے ساتھ صیہونی کانسنٹریشن کیمپ میں موت سے بدتر زندگی گذار رہا تھا۔ زبردستی کی ناقابلِ برداشت کڑی محنت ذلت اور فاقہ۔ کھلے آسمان کے نیچے دن کو سخت گرمی اور رات کو اچانک ٹھنڈ۔ محصور کیمپ میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ عراقی، شامی، نجدی، یمنی اور مصری عرب۔ نوجوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ۔ ایسے بھی جو پرانی وضع کی مزل لوڈر لے کر میدانِ جہاد میں اتر آئے تھے۔ ایسے جن کی ساری کائنات بس ایک ربود و تار تار لبادہ تھا۔ شہری پیشہ ور اور بادیہ نشین بدو۔ زیتون اور نارنج کے باغوں میں مزدوری کرنے والے فلسطینی عرب دارالعلوموں کے طالب العلم، مسلم اور عیسائی سب اپنے ننگ وناموس، اپنے وطن، اپنی جان، اپنی زمین، اپنی روٹی کی حفاظت کرنے جنگ کی گھمسان میں کود پڑے تھے۔ یورپی فاشسٹ، صیہونی سرمایہ دار سارے عرب کو لوٹ کر ویران کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ عرب عوام اس عظیم خطرے سے واقف ہو گئے تھے۔ اور جس طرح بن آتی تھی اس کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مگر اس جاں سوز فرض کی انجام دہی کے لئے سامان پورے طور پر مہیا نہ تھا۔ اور سب سے بڑی کمی یہ تھی۔ کہ ملوکِ عرب میں اتفاق نایاب تھا۔ اور مجاہدین میں ایسے عناصر بھی تھے۔ جنہیں حملہ کی وسعت اور گہرائی کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ وہ بغداد۔ بصرہ، دمشق، عمان اور قاہرہ کے قہوہ خانوں میں لوبان و مُر کے دھوؤں، پرجوش قصیدوں اور گرم فنجانوں کے درمیان اپنے جذبات کی پرورش کرتے رہے تھے۔ اور صیہونی روس اور امریکہ کی فیکٹریوں اور جنگی تعلیم گاہوں میں اسلحوں کی خریداری اور فوجی تربیت حاصل کرنے میں مشغول تھے۔

حلمی محصور کیمپ کی سنگلاخ زمین پر تھکا ماندہ لیٹا ہوا تھا۔ رات خنک ہو چلی تھی۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ اور اس کا دل تو اور بھی دردمند ہو رہا تھا۔ اسے شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ کبھی وہ آنتوں کی اینٹھن سے تلملا اٹھتا۔ اور کبھی نقاہت کے سبب نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا۔ سیاہ آسمان کے ستاروں کے ساتھ اس کے خیالات بھی جھلملا رہے تھے ——

—— وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کا وسیع احاطہ ہے۔ حلمی دائرۃ المعارف کی حسین عمارت میں داخل ہوا۔ کتب خانہ میں الماریاں کندھے سے کندھا ملائے فوجی قواعد کی حالت میں استادہ تھیں اور صف بہ صف کتابیں پیریڈ کر رہی تھیں۔ ہر طرف شل پھٹنے لگے۔ قطار اندر قطار کتابیں مر مر کر گرنے لگیں۔ بہت سی مجروح ہو کر کراہ رہی تھیں۔ سارا کتب خانہ میدانِ جنگ بن گیا تھا حلمی نے دیکھا کہ لطفی منفلوطی اور جبران خلیل جبران کی کتابیں دم توڑ رہی ہیں جب جبران کی ایک کتاب کی روح پرواز کرنے لگی تو دم واپسیں اس کے یہ کلمات سنائی دیئے ——

"اے زمین! کتنی حسین ہے تو، اور کتنی دلکش! ہم تیرے چہروں کو خون سے رنگتے ہیں، اور تو ہمارے چہروں کو آبِ کوثر سے دھوتی ہے ہم تیرے عناصر سے بندوقیں اور توپیں بناتے ہیں اور تو ہمارے عناصر سے گلاب اور سوسن کے پھول پیدا کرتی ہے" —— دائرۃ المعارف کی عمارت منہدم ہو گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ خرابے کے ایک گوشہ سے ایک پیکر نمودار ہوا۔ سیاہ برقعے میں محجوب۔ وہ پیکر قریب آتا گیا۔ قریب آ کر اس نے نقاب الٹ دیا۔ حلمی نے اس کے غم ربا، دلکش، حسین چہرے کو پہچان لیا۔ وہ تو "شمع" تھی۔ لوگ اسے دارالعلوم کی "شمع فروزاں" کہتے تھے۔ وہ بیروت کے دارالعلوم میں ابھی نئی نئی آئی تھی۔ طالبات اسے "الحمرا کا گلاب" کہتی تھیں۔ حلمی کی پرستیدۂ خیال اس کا رشکِ مہتاب چہرا۔ اس کی ناقابلِ فہم خواب آگیں سحر ناک آنکھیں سفید کبوتروں کے جوڑے کی طرح اس کے پیارے پیارے ہاتھ —— اس کی چراغ کی لو کی مانند لانبی لانبی مخروطی دلکش انگلیاں۔ اس کا جاذبِ نگاہ پیکرِ موزوں اس کا حشر خیز خرامِ ناز۔ "شمع" نے حلمی کی دنیائے دل ہی بدل دی تھی۔ نئی روشنیاں! نئی روشنیاں!

حمرا کے گلاب نے دائرۃ المعارف کے خرابہ کو بھی گل افشاں کر دیا —— پھر نارنج و زیتون کے کنج رونما ہوئے۔ اور مشین گنوں کی آوازیں اور خندق۔ اور پھر خندق عرب مہاجرین کی لاشوں سے

بھر گیا۔ مرد، عورتیں اور بچے ــــ

یونہی رات بھر محمود حلمی کے خیالات بے ہوشی اور ہوش کے درمیان جھلملاتے رہے اور پھر صبح ہوئی۔ ہر روز صبح ہوتی تھی۔ مگر حلمی کے لئے کالی رات کا لامتناہی سلسلہ تھا۔

صبح ہوتے ہی چند عرب قیدیوں کو پابہ جولاں لایا گیا۔ ایک صیہونی سپاہی نے انہیں کیمپ کی ایک طرف قطار میں کھڑا کیا۔ اُن سے کچھ سوالات پوچھے گئے۔ اور پھر انہیں دوسرے قیدیوں کی آنکھوں کے سامنے گولی سے اُڑا دیا گیا ــــ حلمی کے قریب ایک عرب قیدی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ قیدی نے سُنایا کہ ان میں سے دو نوجوان اُس کے گاؤں عرکیش کے رہنے والے تھے۔ صیہونی یہود عربوں کے شہری مکانات اور اُن کے دیہاتوں کو ڈائنامیٹ سے اُڑا رہے تھے۔ مگر جہاں جہاں پر عربی یہود کے مکانات بھی ملے جُلے ہوئے تھے۔ وہ عرب قیدیوں سے عربوں کے مکانات ڈھوا رہے تھے۔ کل عرکیش نوجوانوں نے اپنے گاؤں کو ڈھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس پیارے گاؤں کو کیسے ڈھاتے۔ وہاں اُن کی طفلی، عنفوانِ شباب، اور جوانی گذری تھی۔ وہ اُن کے خاندانوں اور قبیلوں کا مسکن۔ وہ گھر جو اُن کے جسم و جان کے حصے تھے۔ وہاں اُن کے خیالات اور ارمان پلے تھے۔ وہ اُن کی حیات کا گہوارہ وہ اپنے اشجار وہ شناسا باغ و نخلستان

"ہم تو عرکیش یہود کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہتے سہتے آئے تھے۔ ان صیہونی غیر ملکی یہود نے ہمارے باپوں، بھائیوں، ماؤں اور بہنوں کو قتل کیا اور اب وہ ہماری بستیوں کو مسمار کر رہے ہیں"

حلمی کا رفیق عرب قیدی آنسوؤں کی جھڑی کے درمیان اپنی بپتی بیان کرتا رہا ـ "وہ سب سے لانبا نوجوان جسے ابھی گولی سے ہلاک کیا گیا میرا دوست فوضی تھا۔ آج فجر کی نماز تک وہ میرے ساتھ ساتھ تھا کل زبردستی اُسے عرکیش کے عرب مکانوں کو ڈھانے کا حکم دیا گیا۔ وہ اپنے گھر اپنے آبائی مکان میں داخل ہوا۔ مانوس در و دیوار سے اپنے آپ کو اس قدر قریب پا کر اُس نے ایسا محسوس کیا کہ اُس کا گھر اپنی آغوش کھولے اُسے اپنے سینہ سے بھینچ لینے کے لئے بے تاب ہو رہا ہے چند ماہ پہلے وہ اپنے گھر میں اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کا باپ اسی مکان میں جان بحق تسلیم ہوا تھا۔ بہت پہلے، جب وہ بچہ تھا۔ ہر جانب سے شناسا پیاری آوازیں آتی ہوئی سُنائی دیں۔ وہ جذبات کی گرانباری سے دیوانہ وار ہو رہا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ خونیں منظر گھوم گیا جب اُس کے بھرے گھر کو تہہ تیغ کیا گیا تھا۔ وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔ بے خبری کے عالم میں وہ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں دیوار کے محراب کے اندر کھونٹی سے آویزاں کئی ملبوس تھے۔ وہ اُن سے دوڑ کر لپٹ گیا۔ اُس کی ماں اور بہن کی خماریں اور اوڑھنیاں اب تک اسی طرح لٹکی ہوئی تھیں جیسے اُن عزیز ہاتھوں نے انہیں لٹکایا تھا وہ ان کپڑوں سے لپٹا رو رہا تھا۔ کہ ایک صیہونی سپاہی نے پیچھے سے آ کر رائفل کا کندہ اُس کے سر پر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔

وہ عرب حلمی کے سامنے زار قطار رو رہا تھا ــــ "صیہونیوں نے عرکیشی نوجوانوں کو مسلسل زد و کوب کیا میرے غیور ہم وطنوں نے اپنے پیارے گھروں کو ڈھانے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ یہی اُن کا قصور تھا۔ رات بھر فوضی میرے پہلو میں کراہتا رہا۔ اور آج وحشی ظالموں نے میرے سب بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار ہی دیا ــــ"

حلمی کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔ لیکن سیلِ اشک اُس کے دِل میں گھُٹ کر ہی رہ گیا۔

معنی خیز التوائے جنگ کی خوں آشامی لیک سیکسس کے شیش محل کی عاقلانہ امن پسندی اور پیرس کے پیلے دی شیاو کی مخمور انسان دوستی نے عرب کے زخمی دل و جگر کا مداوا تلاش کر ہی لیا تھا۔ اور یورپ کے اُکھڑے اُجڑے یہودیوں کے درد کا درماں بھی یوں مل گیا کہ سیلِ یہود کو فلسطین کے تنگ نائے اسرائیل میں سمو دینے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ ساحرانِ سیاست نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اس کے باوجود محمود حلمی جیسے نوجوان خواہ مخواہ کُڑھتے ہی رہے۔ اُن کے آنسو نہ تھے۔ اُن کے دِلوں سے خون رِستا ہی رہا

محمود حلمی نے اپنے آپ کو فوجی راستوں کی تعمیر میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے پایا۔ صیہونی حملہ کی بڑی تیاریاں

کر رہے تھے۔ جنوب، مشرق اور شمال کی جانب ایسے راستے درست کئے اور نئے راستے بنائے جا رہے تھے جن پر ٹینک کے علاوہ میکانکی دستے گذر سکیں۔ ہوائی اڈوں کی تعمیر بھی گھما گھمی سے ہو رہی تھی۔ آخر صیہونیوں نے شیش محل پر پتھر پھینک مارا۔ موسم سرما کے آغاز میں وادئی نغب پر یلغار شروع کر دی۔ سرخ دیوار آہن کے عقب سے لوہا اُڑ اُڑ کر اسرائیل پہنچ رہا تھا۔ مشرقی یورپ سے جنگی طیارے وہاں کثرت سے آ رہے تھے اور یہودی انہیں نارنج و زیتون کے شاداب و گنجان کنجوں میں چھپ چھپ کر گھونسلے بنا رہے تھے تاکہ شیش محل کے نگہبانوں کی نگاہ غلط انداز نہ پڑ جائے۔ اپنے سرمایہ و سامان پر نازاں صیہونی یہود وادئی نغب پر چھلتے ہی گئے۔ مصری دستے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ مشرق اردن کی عساکر عربیہ (عرب لیجن) قدیم یروشلم میں خاموش بیٹھی تھیں اور جیوش شام گلیلی جھیل کے ساحل پر آئینہ آب میں شیش محل کی جادوگری کا عکس مشاہدہ کر رہے تھے۔ صیہونیوں نے بڑے خون خرابے کے بعد بیر شیبا کو فتح کر لیا۔

ایک روز محمود حلمی دوسرے اسیروں کے ساتھ نواحِ بیر شیبا میں کدال اور بیلچے سے ارضِ فلسطین کو صیہونیوں کے حکم سے کوڑ کند رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ فلسطین کی پاک اور پیاری مٹی میں اس کی محنت کا پسینہ مل رہا تھا۔ اُس کا دل پگھل رہا تھا۔ اُس کا خون پانی ہو رہا تھا۔ وہ آرزومند تھا۔ کہ اپنی قبر آپ کھود کر اُس میں دفن ہو جائے۔ کیونکہ اُس سے زبردستی وہ کام لیا جا رہا تھا جس سے اُسے کراہت آتی تھی۔ وہ اپنی ملت، اپنی قوم کی تدفین کے لئے مجبور و مقہور ہو کر زمین کھود رہا تھا۔ مادرِ وطن کا جگر چاک کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کاش وہ لڑتا ہوا مارا جاتا۔ اسیر نہ بنتا۔ کئی دنوں سے حلمی سخت ذہنی اذیت و کرب میں مبتلا تھا۔ اُس کے قلب کو جو سب سے بڑا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ عرب حکومتوں کی آپس کی رقابتیں تھیں۔ عرب محاذِ اتحاد میں رخنہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس دُکھ سے حلمی کا دل چھلنی ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جسمانی صعوبتیں بھولا ہوا تھا۔ کبھی اُسے جانسوز مایوسی ہوتی۔ کبھی وہ شکستِ فریب کی تلخیوں کے گھونٹ پیتا۔ اندوہ و مصیبت کی چٹان اُس کے ذہن و دماغ کو پیس رہی تھی کندھے سے کندھا ملا کر لڑتے ہوئے مارا جانا آسان ہے یہاں تک کہ متحد مقابلہ کے بعد شکست کی شرمساریاں بھی گوارا ہیں۔ مگر جو غم سہا نہیں جاتا وہ قومی خطرہ کے وقت آپس کا اختلاف یا رفقائے کار کا علیحدہ ہو جانا ہے۔ حلمی ایسے ہی درد و سوز میں مبتلا تھا۔ وہ دشمن کے مقابلہ میں سرگرمِ عمل ہو کر اپنے خون کے قطرے قطرے کو شہیدِ آزادی بنا دینا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اپنی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں میں شدت سے سوچ رہا تھا۔ اُس نے اپنے قریب بیر شیبا کے مضافات کے بدوی قبائل کے شیوخ کو بیٹھا دیکھا۔ وہ تیس کی تعداد میں تھے۔ اپنی عباؤں اور کندھوں تک لٹکے سر کو چھپائے ہوئے کسابوں کے ساتھ وہ سب اکڑوں بیٹھے ہوئے مرغوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ جو کسی مطبخ میں ذبح کرنے کے لئے قطار اندر قطار رکھے گئے ہوں۔ اُن کے سامنے چند دو طرفہ دستوں والی صُراحیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مینا کی وضع کی خوبصورت لانبی گردن والی صُراحیاں حلمی ان صراحیوں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ شیخوں کے بے رونق، بجھے ہوئے، شرمندہ چہروں کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ شیوخ کی آنکھیں زمین میں دھنسی جا رہی تھیں یا بے آسرا اُفق میں تھکی ہوئی سرگرداں تھیں وہ پاتال تک کُریدنا چاہتی تھیں لیکن تقدیر کی گتھیاں اُن سے سلجھ نہیں رہی تھیں۔ اُنہیں راستہ کیسے ملتا۔ اُن کی پژمردہ آنکھوں کی شمعیں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ موت کی تاریک وادی میں حیاتِ ابدی کی تلاش سے قاصر تھیں۔ یہ شیوخِ عرب بیر شیبا کے صیہونی ملٹری گورنر سے اپنی جانوں کی امان طلب کرنے آئے تھے۔ وہ اپنے نارنج اور زیتون کے باغات کی بھیک مانگنے آئے تھے۔ وہ اپنے زرکار خیموں کے عیش کی حفاظت کا وسیلہ ڈھونڈنے آئے تھے لیکن آواز اُن کے دلوں میں گھُٹ رہی تھی۔ اُن کے حلقوں میں پھنس رہی تھی۔ بیر شیبا کے یہودی ملٹری ڈکٹیٹر کے حضور وہ یہ عرض پیش کرنے آئے تھے کہ اُنہیں حکومتِ اسرائیل کی وفادار رعایا بننے کا شرف بخشا جائے۔ اُنہیں جو پچیس ہزار بدوی اہل قبائل کے سردار ہیں۔ مگر اُن کے ضمیر کراہ رہے تھے۔ وہ نقیب نہ نوں سے

یہ سوال گدایانہ کر رہے تھے۔ کہ انہیں اُن کے گھروں میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ وہ ظالموں سے یہ التجا کرتے کیوں بے قرار تھے۔ کہ انہیں مظلوم بننے کا فخر عطا کیا جائے۔ اُن کی مضطرب روحوں کی روشنی دم توڑ رہی تھی محمود حلمی نے بدوی شیوخ کی آنکھوں کی شمعِ کُشتہ کی بے نوری دیکھی۔ اُن کے دلوں کے پژمردہ لانوں کا مشاہدہ کیا! اور اُن کے نا اُمید و بے عمل جسموں میں اُن کی مضمحل رُوحوں کی تدفین کو محسوس کیا۔ حلمی کے نفس کے اندر سرسر و سموم چلنے لگے۔ وہ اس منظرِ جانگزا کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اس کے دل کے بیکراں، اعماقِ محبت سے نفرت کا ایک آتش فشاں پھوٹا۔ پرشور، غیر مرئی لاوا اُس کی نگاہوں سے رواں تھا۔ حلمی اُس گھڑی اپنے آپ سے اُن سارے شیوخ سے، صیہونیوں سے، اور مشرق و مغرب کی سرخ و سفید شہنشاہیت و تسلطائیت سے نفرت کر رہا تھا۔ ایک عظیم مقدس نفرت کا جذبہ اُس کے سارے وجود پہ طاری تھا۔ یہ جذبہ سیلابِ رواں کی صورت اختیار کر لینے کو ہانپ رہا تھا۔ ایسا طوفانِ نوح جو سب کو غرق کر دے۔ محمود حلمی نے بیلچے کو اپنے ہاتھ میں مضبوط پکڑ لیا۔ اُس نے شیوخ سے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ــ "کاش صیہونیوں کا خون آشام طائفہ ارگون زوائی لیومی تم سب کو تہہِ تیغ کر دیتا!

شیوخ! تمہاری غیرت و حمیت کو کیا ہوا؟" حلمی کے نوجوان اسیرانِ رفیق کام چھوڑ کر حلمی اور شیوخ کی باتیں سُن رہے تھے وہ سب غیرت و شرم کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ اور اس عار و ننگ کو دور کرنے کے لئے بے چین تھے۔ انہوں نے ایک پچاس سالہ شیخ کا جواب تلملا کر سُنا۔ "ہماری غیرتیں ملکِ عرب کی زردار ہتھیلیوں میں بند ہیں۔ یا پھر پٹرول کے ساتھ دیارِ فرنگ کو بھیج دی گئیں"

"بخدا! بہت سے سینوں میں وہ اب بھی محفوظ ہیں!" محمود حلمی نے کہا اور نعرۂ تکبیر لگاتا ہوا وہ صیہونی نگہبانوں پر ٹوٹ پڑا۔ بہت سے اسیروں نے اس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے کئی صیہونیوں کو مار گرایا اور پھر وہ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں خاکِ پاک فلسطین سے ہم بغل ہو گئے۔ مادرِ وطن نے اُنہیں اپنے زخمی ورخیو[illegible] سینہ سے لگا لیا۔

ایک بوڑھے بدوی شیخ نے زیرِ لب کہا "اُنہیں مرے نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں"

ابو الفضل صدیقی

نیل گائے بند کر دیا! — آدمی کھول دیا

"سرکار! — پرسوں شام نگریا کے بلدیو مراؤ کو نیل گائے نے کھالیا!! — میرے بوڑھے مقدم نے مجھ سے کہا تو میں اچھل پڑا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ کہ یہ مجھ سے تمسخر کرنے کی ہمت کیوں اور کیسے کر رہا ہے۔

اور بیشتر اسکے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکال پاؤں میرا شکاری دوست اور مہمان "سنگھ بابو" چہرے پر سے سیفٹی ریزر ہٹا کر اور صابن کے جھاگوں میں لتھڑا ہوا چہرہ اس کی جانب موڑ کر بولا "ایں کیا کہتے ہو؟"۔

"جی سرکار۔ کنور جی ہون ایک نگریا کے بلدیو مراؤ ہی کو گیا۔ آم نگر کے بھولو بڑھئی کو کھایا! — اس سے پہلے باج گڑھ کے کریا گھوسی کو! — اور اس سے پہلے گلاب کسان کو! — وہ تو سرکار ان دو اٹھواروں میں بڑھ گنگا کی کنڑی میں چار پانچ آدمی کھا چکا ہے! — بڑا خونی نیل گائے ہے! —"

"ایسے کیا بکے جاتا ہے واہی تباہی!" — میں نے اس کی جانب ذرا طنزیہ تیوروں سے دیکھ کر کہا۔ "دیکھتے ہو جی سنگھ بابو۔"

اور سنگھ نے میرے منہ سے بات لیکر کہا۔ "نہ معلوم کیا کہ رہا ہے! نیل گائے نے کھائے آدمی! — ہوں — اونھ — ہیں ہیں — کیا کوئی کیا کوئی آدم خور شیر آمرا کدھر ہے؟"

"نہیں سرکار کنور جی — شیر نہیں — بس یہی ہمارے اپنے جنگل کا ایک پرانا نیل گائے شیر ہو گیا۔ تمام علاقہ میں بے چینی پھیل گئی ہے۔ آدمی پر آدمی مار مار کر کھا رہا ہے"

"نہ معلوم کیا بکے جاتا ہے بیوقوف تمام خدائی کا کیا بھنگ پی کر آیا ہے"۔ میں نے طنزیہ ہنسی ہنسکر کہا اور واقعی اسکے چہرے کو بغور دیکھا کہ کیا معاملہ ہے۔

"سرکار آپ دیکھ ہی لینگے — اور ہمارے اتنے بیچ میں اور کوئی ہے بھی نہیں جو اس معرکہ کو سر کرے سوا آپ دونوں کے —" مقدم نے کہا اور سنگھ نے بڑے غور سے پھر حجامت چھوڑ کر اس کی جانب دیکھا اور کہا "اچھا تم سے کس نے کہا؟

سرکار سن تو دو دن سے رہے تھے۔ ہم پھر جب رات عنایت شیخ آئے اور اپنی آنکھوں سے بلدیو مراؤ کی لاش دیکھ پائے تو ہم نے بھی مان لی اور آپ سے ذکر کیا۔

اچھا تو پھر کیا کہتے تھے عنایت شیخ؟ — کس طرح کھاتا ہے کیسے مارتا ہے؟ کیا کیا دیکھا؟" سنگھ بابو نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو ابھی جرح کر کے سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کئے دیتا ہوں۔

"وہ اب آتے ہی ہونگے انہیں بلا کر آیا ہوں — رات سسرال سے آئے ہیں ادھر نگریا کا رستہ بدل کر بوڑھی گنگا کے کنارے کنارے بچکر پانچ کوس کے چکر سے۔ وہ تو سرکار رستے بند ہیں۔ ادھر پار کے سب۔ اور سرکار یہ لو وہ آگئے عنایت شیخ بھی!" — اور ہم دونوں نے عنایت شیخ کی جانب چونک کر دیکھا۔ سنگھ نے استرا رکھ دیا اور ہمہ تن توجہ بنکر عنایت شیخ کو دیکھنے لگے —" دو تین مرتبہ عنایت شیخ کھانسے اور منہ پر ہاتھ پھیرا اور بولے" چودھویں صدی ہے سرکار چودھویں جو نہ ہو جائے وہ تھوڑا ہے۔ اللہ کی شان ہے کیا سناؤں سرکار۔ اپنی ان آنکھوں سے دیکھ کے آیا ہوں۔ اُس پار کے تمام جنگل میں رستہ بند ہے۔ کل بلدیو کی لاش آنکھوں سے دیکھی ہے۔ سب کی سب بھری تھی۔ ایسا نیل گائے بر جا کہ ناہر مات کر بیٹھے ہیں۔ آم نگر کے بھلو بڑھئی کو کھایا باج گڑھ کے کریا گھوسی کو چٹ کیا۔ اس سے پہلے چار گنواں کے

گلاب کسان کو کھایا۔ اور پھر سرکار بلدیو کی لاش تو کل دیکھ کر آیا ہوں۔ اپنی آنکھوں سے۔ کھوپڑی چبا گیا تھا اور بوٹیاں نوچ نوچ کے کھا گیا تھا۔"

"ارے کوئی شیر ہوگا — تم لوگ نیل گائے نیل گائے بکے جاتے ہو —"

"نہیں سرکار۔ وہ پرسوں شام کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ خاص بلدیو مراؤ کے بھائی نے۔ بلدیو مراؤ کو اُسکے بھائی دُرجن کی آنکھوں کے سامنے کھا گیا ہے۔ اور تھانہ دار کا حکم ہے کہ "نیل گائے بند کر دیا جائے" — دو سپاہی اور ایک ہیڈ نیل گائے کو بند کر نیکو سرکاری بندوقیں لئے جنگل میں تعینات ہیں۔ ساری رپورٹیں تھانہ میں گزر رہی ہیں۔ سپاہیوں نے نیل گائے بند کر دیا اور آدمی کھول دیا۔ بس انہی سپاہیوں کی کیوجہ سے آدمی کھلا ہے اور نیل گائے بند۔"

"کیا بکتا ہے — سنگھ !؟ — سمجھے کچھ ؟"

"ہاں۔ سمجھتا ہوں ابھی" سنگھ نے کہا اور جلدی جلدی دو تین ہاتھ سیفٹی ریزر کے چلا کر حجامت ختم کی اور کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ بلدیو مراؤ کو کہاں پہ مارا ہے —"

"گاؤں سے ایک پٹی کے عرصے پر۔ وہ پانی لگا رہا تھا بڑے تالاب سے پانی آرہا تھا۔ بیڑی والے دن مندھے بیڑی بڑھا کر چلے گئے اور بلدیو مراؤ اپنے کھیت میں توڑ کا پانی درست کرتے رہ گئے۔ پچھائیں ارہروں میں سے دو کارتا کھالا اور آکر بھڑ گیا۔ پہلے جڑ ماری — پھر گرا کر خون پیا اور گوشت کھایا۔ کھوپڑی چبائی اور کچل کچلا کر چلتا بنا۔"

خیر یہ تو سب ماجرا سُن لیا۔ پھر یہ سب ماجرا دیکھا کس نے ؟ —"

"سرکار وہ تو میں نے بلدیو کی لاش بھی دیکھی۔ پھر کھیت پر جا کر جگہ بھی دیکھی۔ کھیت بھی تو گاؤں سے ایسا بہت دور نہیں ہے۔ آدمی بیڑی والے تو سب چلے ہی آئے تھے۔ اور وہ بیچ کھیت میں پانی سنبھالتا ہی رہ گیا تھا۔ اس کی چیخ سنکر باہری چوپال پر سے دُرجنا بھاگا۔ تو اس نے دیکھا کہ اٹھا اٹھا کر پھینکتا ہے، پٹختا ہے، بھنجھوڑتا ہے اور خون چاٹتا ہے! — گوشت کھاتا ہے۔ کھوپڑی چباتا ہے"

سنگھ نے اپنی قافیہ بندی پر آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر وہ سب کچھ کرتا ہے پھر اُس نے کیا نام اس کا ہاں درجنا نے کیا کہا۔"

"کرنا کیا۔ بس اکھاڑہ ہوتے دیکھ کر درجنا چلاتا پکارتا گاؤں میں کو بھاگا۔ اور مونڈیرہ سو جوان اس کی آوازیں لے لے لاٹھیاں چھٹے اور بھاگ کر پہنچے۔ تو سب نے آنکھوں سے پھرا ہوا دیکھا۔ آدمیوں نے شور مچایا تو پھر ارہروں میں بھاگ گیا۔ یہ پرسوں دن مندھے کا واقعہ ہے۔ کل صبح میں پہنچا تو لاش کا پنچایت نامہ بھرا جا رہا تھا۔ اور سب حال حلیہ لکھا جا رہا تھا۔"

"اور یہ گوشت کھانے اور کھوپڑی چبانے کا راوی کون ہے؟"

میں نے تمسخر سے سنگھ کی جانب دیکھ کر عنایت سے جواب طلب کیا۔

"سرکار اپنی آنکھوں سے کھوپڑی کی کرچیں دیکھیں :- چوتڑوں کا چبایا ہوا گوشت دیکھا ! — اور کھیت میں پانچ چھ بیگہ پر گیہوں سرسوں کا تنکا بھی نہ رہا تھا۔ سب فصل گرد ہوگئی"

"اور یہ کچھ پہلی واردات تو نہیں ہے۔ کام ٹھپ پڑا ہے سارا،" مقدم نے کہا۔

"وہ تو داروغہ جی نے سپاہی بھیج دیئے ہیں۔ اور نیل گائے بند کر دیا اور آدمی کھول دیا۔"

"ابے کیا بکتا ہے نیل گائے بند کر دیا۔ آدمی کھول دیا۔"

ہاں سرکار سنتے ہیں کہ اس سال بھادوں سے پیر جنگی نے نیل گائے بند کر دیا اور آدمی کھول دیا ہے۔ بس سرکار یہ سپاہی تھانہ دار نے سپاہی اسی لئے تعینات کئے ہیں۔ کہ نیل گائے بند رہے۔ اور آدمی کھلا رہے۔

اور سنگھ نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے نیل گائے بند کر دیا ہے۔ اس سال بھادوں سے"

"اور آدمی کھول دیا ہے کیوں سنگھ ؟" میں نے لقمہ دیا اور ہم دونوں نے فلک شگاف قہقہے لگانا شروع کئے اور جب ذرا سکون ہوا تو اُس نے کہا "سرکار۔ داروغہ جی نے پیر جنگلی کے حکم سے نیل گائے بند کر دیا اور آدمی کھول دیا سپاہی بھیج دیئے تاکہ نیل گائے ارہروں میں بند رہے اور آدمی ربیع میں کھلا کام کاج کرتا پھرے۔ مگر بھئی شیخ یہ تو بتاؤ داروغہ جی پیر جنگلی کا حکم بر جانتے ہیں اب" سنگھ نے تمسخرانہ سوال کیا۔

"ہاں سرکار کنور جی اب تو سنتے ہیں کہ بھادوں سے چوکیدار

سپاہی، داروغہ اور چھوٹے بڑے کپتان تک پیر جنگلی کے چیلے بنگئے ہیں اور جو حکم وہ دیتے ہیں وہی جنگل میں کرتے ہیں۔"

ہم دونوں نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور پھر سنگھ بابو نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نیل گائے اور آدم خور!! — ذاتی تجربہ تو درکنار شاید یہ شکاری لطیفہ ہو سکتا ہے۔ ایسی گپ بھی کسی شکاری نے آج تک نہ گڑھی ہوگی بھئی میرے نزدیک کسی جنگلی چرندے کا انسانی کھوپڑی چبانے، خون پینے اور گوشت کھانے کا واقعہ نہ صرف مضحکہ خیز ہے بلکہ غیر فطری بھی ہے نیل گائے کی وحشت اور بزدلی کو دیکھتے ہوئے میں تو یقین کر نہیں سکتا کہ جو جانور آدمی کے سایہ سے بھاگے وہ آدمی پر حملہ آور بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھیا میں نے کبھی نیل گائے کا شکار کیا نہیں۔ ہم اس سے محض اسکے نام کی وجہ سے محروم رہے اور کیا تمہارے ساتھ نہیں مارے اکثر میں نے"

ہاں بیسیوں مرتبہ اور پھر میں نے انگریزی کتابوں میں ان شکاروں کے حالات بڑے شوق سے پڑھے ہیں جو مجھ کو مارنا نصیب نہیں ہوسکے اور اب تو ستمبر ۱۹۴۷ء سے نیل گائے ہی بند کر دیا"

"ہاں اور آدمی کھول دیا" اور ہم دونوں نے پھر اس شکاری اصطلاح سے لطف اندوز ہو کر قہقہہ لگایا۔ "مگر بھئی دیکھو سنگھ تمہارا یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح نہیں کہ کوئی سبزی کھانے والا جانور آدمی پر حملہ ہی نہیں کر سکتا۔ جنگلی ارنا بھینسا دیکھتے ہی حملہ کرتا ہے اور جہاں سے دیکھتا ہے وہیں سے سوں سوں کرتا چڑھ سیدھی کرکے ٹکر مارنے کو چلتا ہے"

"اس کی کچھ نہ کہئے۔ آدمی تو آدمی وہ تو شیر پر بھی اسی شان سے جھپٹتا ہے اور اپنے ہم جنس بھینسے پر بھی اسی زور شور سے اور جنگل کے سر چھوٹے بڑے پر گرا سکا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ وہ تو محض جھپٹنا جانتا ہے اور اکثر شکاری کی گولی ٹیکتا کھاتا ہے شیر کے مقابلہ پر شیر سے اپنے چیتھڑے اڑواتا ہے۔ اور جب برابر کا مقابل ہو تو ایک آدھ کپڑا اچھی لے بھی لیتا ہے۔ ہرن، بارہ سنگھے چیتل ہاتھ نہیں آتے اور صاف جاتے ہیں سانبھر کو اکثر مار لیتا ہے، جنگلی بیل بھی کبھی مار کھاتا ہے اور کبھی مار بھگاتا ہے۔ وہ تو جنگلی جانوروں میں عقل اور سمجھ بوجھ سے بالکل ہی کورا ہوتا ہے۔ مگر بھئی نیل گائے کی جبلت اور وحشت کے یہ چیز منافی ہے کہ وہ آدمی کے پاس پھٹکے چہ جائیکہ مار کر کھا جانے کی کھوپڑی چبا جانے کی معتبر روایات! — مجھے تو یہ سب قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

"تو بھئی سنگھ بابو آجکل کے زمانے میں سب کچھ ممکن ہے۔ اب دیکھو نا نیل گائے بند کر دیا اور آدمی کھول دیا۔ پیر جنگلی نے تو پھر کیا تعجب ہے کہ نیل گائے بھی آدم خوری پر اتر آئے۔

سنگھ نے ہنس کر کہا۔ "ہاں بھئی کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ وحشت ذرا دیر میں فرزانگی اور بزدلی اک آن میں شیر دلی بنتی ہے۔ عنایت شیخ ٹھیک کہ رہے تھے۔ بھیا چودھویں ہے چودھویں — "

"تو بھیا چلو۔ پھر کیا دیر ہے۔" میں نے کہا اور آخر یہاں گھر سے نکلے ہی اسی لئے ہیں"۔

مگر بھیا نیل گائے بند کر دیا ہے یہ سمجھ لو۔ پیر جنگلی نے۔

"ہاں اور آدمی کھول دیا ہے" اور سپاہی تعینات کر رکھے ہیں۔ کھولنے بند کرنے کے لئے۔

اور ہم نے پھر ایک مشترکہ قہقہہ لگایا۔ مگر یہ سمجھ لو کہ نیل گائے بند ہے اور آدمی کھلا ہوا ہے اور تم نیل گائے کا ارادہ کرکے جا رہے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بند دن بھی دھر لئے جاتے اور خود بھی دھر لئے جاؤ پیر جنگلی کے حکم سے"

"ذرا چل کر دیکھیں تو کہ معاملہ کیا ہے؟ — کیسا دلاور نیل گائے ہے"

سرکار آپ کی طرف اُدھر سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ علاقہ میں کوئی من چلا نہیں ہے بس آپ ہی مار سکتے ہیں اور سب کے مقدر سے کنور جی بھی یہاں مہمان ہیں۔ اب بچکر کہاں جائیگا سالا" عنایت شیخ نے جیسے کچھ ڈرتے ڈرتے سنگھ بابو کے تیور دیکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اسے احساس تھا کہ سنگھ بابو راجپوت ہے اور نیل گائے نیل گائے ہے۔ سنگھ نے کہا مگر دیکھو تو بھئی مقدم جی۔ ان سپاہیوں کے پاس بندوقیں ہیں"

"جی سرکار ہیں"

"پھر انہوں نے مارا کیوں نہیں اب تک" سنگھ نے کہا اور

مقدم نے عنایت شیخ کی جانب مستفسرانہ انداز سے دیکھا۔

اور عنایت شیخ نے کہا۔ "وہ تو سرکار پیر جنگلی کا حکم ہے" نیل گائے بند کر دیا! — آدمی کھول دیا!" — بس سرکار نیل گائے ارہر کی فصل اور جنگل میں بند ہے اور آدمی میدانوں میں دن دہاڑے کھلا ہوا ہے۔"

ہم دونوں نے پھر پُر معنی قہقہہ لگایا اور مقدم نے کہا۔ "وہ سرکار آپ جا کر تھانہ میں دیکھ لیں اگر شبہ ہو۔ چاروں وارداتوں کی رپورٹیں اور پنچایت نامے لکھے ملیں گے۔"

"ہاں میاں جبھی تو داروغہ جی نے حکم بھیجا ہے کہ "نیل گائے بند کر دیا! — اور آدمی کھول دیا!"

ہم دونوں پھر ہنس دیئے اور سنگھ نے انتہائی تمسخر کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "دیکھو میاں چودہری صاحب — ایک خیال رکھنا۔ نیل گائے بند ہے اور آدمی کھلا! — اور آدمی اور نیل گائے کے درمیان مجادلہ میں حفاظتِ خود اختیاری کا حق بھی نیل گائے کو پہنچتا ہے۔ لہٰذا اگر کہیں سامنے پڑ گئے اور حملہ کر دیا تو بندوق بھی چلا سکے کے نہیں۔"

میں نے اسی انداز میں جواب دیا۔ "ہاں ٹھیک کہتے ہو — ہم تم دونوں بھی اگر آج نیل گائے ہوتے تو اس نیل گائے کے حملہ کے وقت حفاظتِ خود اختیاری میں اسکو مار سکتے تھے۔

"ہاں اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آدمی تو ویسے ہی کھلا ہوا ہے پھر آدم خور نیل گائے کی حفاظتِ خود اختیاری میں آپ کو ردّ و گمّا بھی توڑنے کا کونسا حق ہے۔

"جی اور پھر جب نیل گائے بند کر دیا اور آدمی کھول بھی دیا ہے۔"

"ہاں جی وہ جو بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں۔ ایک تو مُوا کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔"

"تمہیں بار یہ بات کیوں کہتے ہو۔ پہلے گاڑی ناؤ پر تھی اور اب ناؤ گاڑی پر ہے۔ آج نیل گائے کے سینگوں سے آدمی کو بچانے میں نیل گائے کے سینگ توڑنے میں وہی جرم ہے۔ جو پہلے نیل کا سینگ بچانے کے لئے آدمی کا ہاتھ توڑنے میں تھا۔"

اور ہم نے پھر قہقہہ لگایا۔ "مگر یار چودہری شکاریوں کے مذہب میں کفر عائد ہو جائیگا۔" سنگھ نے کہا۔ "اگر اس نیل گائے کو نہ مارا —"

"وہ تو بھی مسئلہ ہے۔ مذہب شکار میں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ جب کسی شکاری کو معلوم ہو کہ بیس بیس فرسنگ تک کہیں پر کوئی آدم خور ہو گیا ہے۔"

مگر بھی اب جہاد جب فرض ہوا کریگا۔ جب شکاری یہ سنے گا۔ کہ بیس بیس کوس تک کہیں پر کسی شکاری نے نیل گائے مارا ہے۔" اور ہم دونوں نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

۲

ہم پشتینی اور پیدائشی شکاری! تمام دن اس عجیب النوع شکار کے ہر پہلو پر غور کرتے رہے۔ جمع تو ہم دونوں شکار ہی کے لئے ہوئے تھے۔ اور پروگرام پہلے سے بنا ہوا تھا۔ مگر پہلے والے پروگرام کو ملتوی کر کے اس نئے شکار کا نیا پروگرام بنایا اور اس جدید اور عجیب النوع قسم کے شکار کی تیاری میں ہجومِ شوق اور وفورِ جذبات میں ہم پر کیا گزری۔ اس کا اندازہ تجھ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو ہماری طرح شکار کے شوقین ہوں۔ جگہ زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ ہم کو اس طرف جانے میں کسی طیاری کی ضرورت نہ تھی۔ حتیٰ کہ اطلاع بھی نہ دی اور دوسرے روز علی الصبح ہم آدمی کی ٹٹی کی آڑ میں آدم خور نیل گائے کا شکار کھیلنے کے لئے چل پڑے ہم یہاں سے بیل تانگوں پر سوار ہوئے۔ جگہ بیس پچیس میل تھی۔ ہم نے جب نصف راستہ طے کر لیا۔ تو کھلم کھلا آدم خور نیل گائے کے خوف و ہراس کے اثرات ملنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے بھانت بھانت کی افواہیں اور طرح طرح کی روائتیں کانوں میں آتی گئیں۔ اور ہم نے اندازہ کیا کہ جتنی مختلف روائتیں ہم نے سنیں وہ سب نیل گائے کو بھوت ثابت کرتی تھیں۔ بوڑھے کاشتکار اور دیہاتیوں نے نصیحتاً ہم کو اس کے شکار کی خام خیالی سے باز رہنے کو کہا اور بعض بعض پر اس قدر خوف و ہراس طاری تھا۔ کہ اسکے ذکر سے کانپ جاتے تھے۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگتے تھے کہ کہیں

آتو نہیں رہا ہے۔ بعض ایسے تذکرہ سے گریز کرتے تھے۔

غرض ہم لوگ صبح کے چلے ہر میل میں بقول شخصے سترہ سو ساٹھ روائتیں ایک سے ایک نئی سنتے نگریا پہنچے اور تمام گاؤں کو شدید خوف اور سخت ذہنی انتشار میں مبتلا پایا۔ اور تقریباً ہر ایک پر بھوت والا مبہم سا خوف طاری دیکھا۔ مگر میں نے چند سنجیدہ اور پختہ کار گاؤں والوں کو بلا کر دریافت حال کیا۔ وہاں کے مکھیا نے کہا "بڑھئی کو مینڈھ سے واپس آتے ہوئے عین راستہ پر مارا ہے۔ اور جب راستہ پر اور آدمی آگئے اور اُنھوں نے شور مچایا تو بھاگا۔ کریما گھوسی شام کے وقت چراگاہ سے بھینس لیکر آرہا تھا۔ وہیں چراگاہ کے کنارے پر گھیر لیا۔ اور مار گرایا بھینس اکیلی گھر پہنچیں اور جب بہت دیر ہوگئی اور کریما گھر نہ پہنچا۔ تو گھر والوں کو فکر ہوئی۔ رات ہوگئی تھی ڈر کے مارے رات کو کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ تو پھر دنو کی نندن مکھیا نے ہمت بندھائی۔ بہت سے آدمی اور مشعلیں جمع کیں اور کھوج لگاتے لگاتے پہنچے تو وہ کھاپی کر جا چکا تھا۔

"گلاب کسان بیسے چارے ارہروں میں گھاس کھود رہے تھے۔ وہیں دبا لئے کچھ لونڈوں نے آکر خبر دی۔"

"ایک خاص بات یہ ہے کہ جس کو کھاتا ہے۔ اُس کے کپڑے کھسوٹ کر گلے میں ڈال لیتا ہے۔"

"ایں کپڑے کھسوٹ کر گلے میں ڈال لیتا ہے!؟" سنگھ نے کہا۔ اور تمسخر کے انداز سے میری جانب دیکھا۔

"ہاں سرکار ہم میں سے اکثر نے دیکھا ہے۔ دُور سے اُسے گلے میں چیتھڑے لٹکائے"

"یہ کیوں؟! — ایں جی مکھیا" سنگھ بابو نے مکھیا کی جانب سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب سرکار یہ کیا بتاؤں — سیانوں نے بتایا ہے۔ کہ وہ کوئی بھوت ہے کسی مُردے کا جس کا کبھی کسی ننگے آدمی نے کفن دنوں کے دنوں میں کپڑے کی مصیبت میں کفن کھسوٹ لیا ہے۔ بس وہ آدمیوں سے بدلہ لیتا پھرتا ہے۔ اور کفن کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ اور خون پی پی کر کپڑے کھسوٹتا ہے۔ بلکہ اب تو اس کی خوراک ہی آدمی کا گوشت اور خون ہے۔

"ہاں جی! اور لباس آدمی کے کپڑے! — کون سے سیانے اُلو کے پٹھے نے بنایا ہے"، میں نے کہا اور سنگھ بابو ہنس پڑے۔

"گیان پانڈے نے، اور مٹھو بیانے نے"، مکھیا نے ہمارے تمسخر کا پورا اندازہ کر کے ذرا سست سا ہو کر کہا۔

"ہوں۔ دیکھیں گے کل فودا۔ بھوت کو ہم بھی۔ ہماری گولی چلتی ہے یا اس کا جادُو!" سنگھ بڑبڑایا۔

صبح تڑکے دو نہایت اچھی قسم کے تازہ دم اور شائستہ بیلوں والے ٹانگے جڑوا کر اور اپنی اپنی ۳۰.۰ اسپرنگ فیلڈ رائفلیں اور بارہ بور بندوقیں لیکر جنگل کو چل دیئے۔ پچاس ساٹھ بہادر قسم کے نوجوان رات ہی کو ساتھ چلنا طے ہو گئے تھے۔ ہمارے ٹانگوں کے ساتھ کان سے اونچی لاٹھیاں باندھے گاؤں سے باہر تک تو خوب اکڑ اکڑ کر اور سینہ تان تان کر چلتے رہے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک اپنی لاٹھی سے بھسم کر دیگا۔ آج آدم خور نیل گائے کو مگر جوں جوں گاؤں دور ہوتا گیا اور جنگل قریب آگیا۔ اُن میں سکرٹ اور ڈھیلا پن نمودار ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے ٹانگے ارہروں کے اس چک کے کنارے پہنچے۔ جس کے اندر نیل گائے کے ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا تو باوجود چار بندوقیں ساتھ ہونے کے بھی ادہر کے اندر گھسنے سے ہر شخص نے انکار کیا۔ سنگھ بابو نے اور میں نے ہر چند ہمت بندھائی۔ بہتری غیرت دلائی، حفاظت کی گارنٹی لی، بندوق اور رائفل کی بے پناہ مار بتائی۔ مگر ہر ایک نے گھسنے سے انکار کیا۔ اور صرف ایک جانب ربیع کے لہلہاتے میدان میں چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یوں تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ مگر سنگھ بابو کو ذرا تاؤ آگیا اور بولے "ہیں نا سب کے سب نیچ، مروٹا، کسنٹا، جولاہا پیٹا، بھنگیلا اگر اتنے ٹھاکر ہوتے تو ایسے ایسے ہزار نیل گائے گھونسوں سے مروا لیتا۔"

راجپوت بچہ کے اس تازیانہ پر نرواں بھنگی اور لونیا پاسی کو تاؤ آیا وہ مجمع سے چھٹ کر علیحدہ ہو گئے۔ اور دونوں ٹانگوں

کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ بقیہ سب آدمی کٹ کر ربیع کے میدان کی
جانب چل دیئے۔ ہم تانگا کرانا چاہتے تھے اگر دو آدمی تانگا کیسے کر
سکتے تھے لہذا مجبوراً تن بہ تقدیر ارہروں کی گھنی اور بلند فصل میں ہم نے
اپنے تانگے ڈال دیئے — سنگھ بابو تانگے میں کھڑے ہو گئے اور
کہا "چودھری صاحب! بھئی ارہریں اتنی بڑی ہیں۔ کہ میری لمبائی
اور ریلوے کی اونچائی مل کر بھی ان کی بلندی کو نہیں پہنچتیں۔ کیا کریں
خیر تانگے کے تو شکل سے دال گلے گی۔ اور یہ بدتو نے سارے ڈر
کے مارے اندر گھستے نہیں"

"موم پھلی کی ارہریں ہیں سرکار" لوہیا پاسی نے کہا۔

"خوب بڑھتی ہے موم پھلی کی ارہر" تروا ھنگی بولا

میں نے اشارہ سے چپ رہنے کو کہا۔ اور ہمارے تانگے
ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دائیں بائیں پھٹنا شروع ہو گئے۔
ہمارے دونوں ساتھی ہمارے تانگوں کے قریب ہی دائیں بائیں
آگے پیچھے کبھی کھوج دیکھنے اور کبھی قیاس آرائی کرنے چل رہے تھے
جوں جوں ہمارے تانگے خاموش و سنسان ارہروں میں بڑھتے
گئے۔ ہمارے ان دونوں ساتھیوں کی ہمتیں بھی بڑھتی گئیں اور
وہ خوف اور جھجک جو ان پر سوار تھی دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ
وہ ہم سے دو دو سو گز تین تین سو گز دور ادھر ادھر ارہروں میں غائب
ہو جاتے۔ اور پھر کبھی آگے سے غائب ہو کر پیچھے اور دائیں سے
غائب ہو کر بائیں پر نمودار ہوتے۔ اور گھنی ارہروں کو جھاڑتے
پر ناپتے چلتے۔ ہمارے تانگے بے راہ روی میں کبھی سو سو گز کے
فاصلے تک ایک دوسرے سے قریب آ جاتے۔ اور کبھی پانچ چھ سو
گز سے بھی زیادہ دور ہو جاتے۔ ہمارے بقیہ ساتھی ہم سے تقریباً
میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر باہر ربیع کے کھلے لہلہاتے میدان میں
چل رہے تھے۔ اور باوجود چپ رہنے کی سخت ہدایت کے بات
چیت کرتے جاتے تھے۔ جن کی مبہم آواز کی بھنبھناہٹ جنگل کی
خاموش فضا میں نہایت صاف ہمارے کانوں میں چلی آ رہی تھی۔
ہوا ساکت تھی، فضا خاموش تھی۔ ارہر کے ریشمیں زرد زرد پھول
ہمارے تانگوں کی حرکت سے جھڑ رہے تھے۔ اور سایہ دار
زمین پر زرد زرد ریشم کا فرش ہوتا جاتا تھا۔ ہم سب کو اندر اور باہر
چلتے ہوئے سبز مخملیں سمندر میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔
ہمارے دونوں ساتھی بدستور کبھی آگے اور کبھی پیچھے کسی وقت دائیں
اور کسی وقت بائیں سبز مخملیں سمندر میں ڈوبتے اچھلتے نظر آ جاتے
تھے۔ اور اکثر ان کی چمک دار پیتل کے گولے والی لاٹھیوں کے
سرے دھوپ میں ہمارے اندازہ اور امید کے بالکل خلاف کسی نئی
سمت سے چمک اٹھتے۔ ان کے دلوں سے کم از کم نیل گائے کے
بھوت اور آسیب ہونے کا خوف تو بالکل ہی نکل گیا تھا۔ اور وہ
اپنی خلقی بہادری اور آزادی کے ساتھ چل رہے تھے۔

اور میرے کان سامنے سے آتی ہوئی ایک عجیب آواز
پر چونکے "دھاں انگ — دھاں انگ — دھاں آں آں
انگ" اور میں نے فوراً پہچان لیا کہ بیل اور گھوڑے کے میل کی
مخصوص سی آواز ہے — آدم خور نیل گائے شاید ہماری بو پا کر
یا ممکن ہے کہ کچھ آوازوں سے اندازہ کر کے مقابلہ کے لئے تیار ہو
رہا تھا۔ میں نے چلتے ہوئے تانگہ میں سے رائفل کے سہارے
کھڑے ہو کر صورت حال کو پرتالا — ارہریں غیر معمولی گنجان اور
بلند تھیں۔ مجھ سے دائیں جانب تقریباً چار فرلانگ کے فاصلہ پر
سنگھ بابو کا تانگا برابر چل رہا تھا۔ اور ان سے تقریباً چار فرلانگ
ادھر تک بائیں جانب برابر ارہروں کا چک تھا۔ اور اس کے بعد ربیع
کا میدان تھا۔ جہاں ہماری رفتار اور رخ کا اندازہ لگا کر ہمارے
بقیہ پچاس ساٹھ ساتھی ہمارے محاذ میں چل رہے تھے۔ اور میں
نے غور کیا کہ سنگھ بابو اپنے چلتے ہوئے تانگے پر کھڑے ہوئے
ہیں اور اپنی چھوٹی سی دوربین لگائے سامنے دیکھ رہے ہیں میں
نے بھی بغور دیکھا مگر یا تو میرے پاس دوربین نہ تھی یا میری نگاہ
نہ سمجھی تھی کہ باوجود چار پانچ منٹ کوشش کرنے کے بھی میں کچھ
نہ دیکھ سکا۔ اب میں نے لوہیا اور تروا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ آواز
سننے سے ذرا دیر پیشتر تک تو لوہیا میرے تانگے کے پیچھے فرلانگ
بھر کے فاصلہ پر نظر پڑتا تھا اور تروا مجھ سے بائیں جانب دکھائی
دیا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس آواز کی جانب ان دونوں کی بھی توجہ

مبدّل کر دوں اور کسی بلند درخت پر چڑھا کر دکھاؤں۔ کہ کہاں پر ڈھار رہا ہے۔ لہٰذا نظر کی کمندیں دائیں بائیں آگے پیچھے برابر پھینک رہا تھا۔ کہ یک دم بالکل سامنے تقریباً پانسو گز کے فاصلے پر مجھے آدم خور نیل گائے اپنی جانب بڑھتا معلوم ہوا۔ اب میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ بھرپور شکاری والی نگاہوں سے ماحول کا گہرا مطالعہ کیا۔ سنگھ بابو دستور کھم کی طرح تانگے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اور اب غالباً دوربین آنکھوں سے علیحدہ تھی۔ جس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ اُنہوں نے بھی خوب دیکھ لیا ہے۔ دور بہت دور گیہوں کے کھیتوں میں گانوں والے لاٹھیاں لئے چل رہے تھے۔ اور سامنے سے الحفیظ! والامان!! نیل گائے کا ہیکو اچھا خاصا سیاہ اونٹ کا اونٹ! —— شیر کی طرح سفید سینہ تانے، ہاتھ بھر کی داڑھی پھٹکارے دندناتا ہماری جانب بڑھتا چلا آ رہا ہے اور ہم اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے تانگوں پر محفوظ، —— اپنے مہلک ہتھیاروں سے آراستہ —— اپنی نشانہ بازی اور چابک دستی پر مطمئن —— اور پھر ہری ہری لچکدار شاخوں اور نرم نرم سبز کاہی پتیوں اور چمک دار پیلے پیلے تتلی نما پھولوں کے اس بحرِ ناپیدا کنار میں میں نے ایک مرتبہ اور اپنے بھنگی، اور پاسی ساتھیوں کو تلاش کیا۔ کہ کدھر ڈوب اچھل رہے ہیں۔ لاؤ انہیں بھی آگاہ کر دوں —— ورنہ چار بندوقوں اور پھر ہم جیسے قادر اندازوں کے ساتھ بھلا خطرے کا تو کوئی امکان ہو ہی نہ سکتا تھا۔ اور پھر ان میں لوہیا پاسی بقول شخصے کہ سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری! شکاری کیڑا، پانچ ہزار سال پرانا شکاری، اور سوائے شکاری کے اور کچھ نہیں نہ برہمن نہ چھتری نہ ویش نہ شدر صرف شکاری ہی شکاری! آدمی پیچھے اور شکاری پہلے! —— اور رتوا بھنگی —— کچھ شہر کا خاکروب یا حلال خور تو تھا نہیں نہ قصبہ کا مہتر یا جمعدار دیہاتی بھنگی، دلیری اور مستعدی کا پتلا زمینداروں کا معتمد باڈی گارڈ —— دونوں کی سامعہ، باصرہ، غیر معمولی ذکی الحس اعصاب مشین کے پرزے۔ چال انتہائی تند، اور ہاتھ میں بس ایک لاٹھی لینے کے بعد طبیعت سے اتنے دلیر اور محفوظ ہو جاتے والے کہ ہم مہذب شہری کھلاڑی ہائی

ولاستی رائفلیں ہاتھ میں لیکر اور کوہ پیکر ہاتھیوں کی عماریوں اور آسمان چھوتے مچانوں کی نشستوں پر بیٹھکر بھی اسکے عشر عشیر دلیری یا حفاظت کا احساس نہیں کر سکتے۔ تاہم میری محتاط طبیعت بار بار انہیں تلاش کرتی تھی کہ لاؤ آگاہ کر دوں۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ ان دونوں نے ہم دونوں سے پہلے بھانپ لیا ہوگا۔ میرا گاڑیبان جو قوم کا چمار تھا۔ نیل گائے کی آواز سنکر سہما جا رہا تھا۔ اگرچہ اُس کی پشت پر ایک بارہ بور اور ایک 30. اسپرنگ فیلڈ لگی ہوئی تھی۔ نیل گائے میرے اور سنگھ بابو کے تانگوں کے درمیان فاصلہ کی سیدھ میں ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ اور ہمارے تانگے آہستہ آہستہ ترچھے ترچھے اس کی جانب بڑھ رہے تھے ادھر رفتہ رفتہ دونوں تانگوں کے درمیان کا فاصلہ بھی کم ہوتا جا رہا تھا اور نیل گائے سے بھی ہمارا فاصلہ نہایت سرعت کے ساتھ گھٹ رہا تھا۔ آواز ہر لحہ واضح تر ہوتی جا رہی تھی۔ نیل گائے اینٹھ اینٹھ کر اور تن تن کر آڑا آڑا ہو کر بڑھ رہا تھا۔ اور جب کہیں ذرا نیچا ادہر میں سے گزرتا تو غیر معمولی اٹھی ہوئی گردن کے نیچے سے سینہ کا سفید حصہ زیادہ نمایاں نظر آ جاتا۔ اور میں نے سمجھ لیا۔ کہ بس یہی کفن کھسوٹ بھوت کی وجہ تسمیہ ہے۔ لوگ اسے غور سے دیکھتے ہیں۔ یوں بھی عام نیل گایوں سے بہت زیادہ بڑا نیل گائے ہے۔ ہمارے تانگے تقریباً ایک ہی رفتار سے بڑھ رہے تھے۔ جیسے ایک مخصوص نقطہ پر جمع ہونے کے لئے ہم تینوں مثلث کے ایک ہی زاویئے پر مل جانیکے لئے بڑھ رہے ہیں۔ اور میں نے غور کیا۔ کہ نیل گائے اپنے دائیں اور بائیں دونوں جانب سے بڑھتے ہوئے تانگوں کی ذرا بھی پروا نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ دونوں تانگوں کے درمیانی فاصلہ کی جانب تمام تر توجہ مرکوز کر کے عجیب شانِ تغافل کے ساتھ سیدھا چلا آ رہا ہے۔ میری بارہ بور تانگے میں رکھی ہوئی تھی۔ میں اطمینان سے رائفل کی ٹیک لئے تانگے کے چوبی فرش پہ کھڑا تھا۔ تانگہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ رائفل کی میگزین میں پانچوں کارتوس 180 گرین کی پھٹنے والی گولیوں کے بھرے ہوئے تھے۔ بیل شائستگی کے ساتھ ہری ہری کونپلیں کترتے کھاتے چل رہے تھے۔ نم ریتلی زمین پر

تانگے کے پہیئے یک روی کے ساتھ ایسے حرکت کر رہے تھے۔ کہ جیسے ان میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ مشہور آدم خور نیل گائے ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ ہاتھ پر بھروسہ! ہتھیار پر بھروسہ! اور پھر شکار سامنے! اور نہ صرف سامنے بلکہ ایسا اندھا کہ دونوں شکاریوں کے درمیان بڑھا چلا آ رہا ہے۔ چکی کے دو پاٹوں میں پسنے کیلئے۔ شکار ہماری جانب بڑھ رہا ہے اور ہم شکار کی جانب جیسے شکاری اور شکار دونوں کسی مخصوص ساعت کے لئے متحرک ہیں۔

میرا دل خوشی اور اطمینان کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہروں میں ڈوب اچھل رہا تھا۔ بازو اور کندھے میں گدگدی محسوس ہو رہی تھی ——— اب نیل گائے نہایت واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ بار بار دُم پھول کر پٹھوں پر آ پڑتی تھی ——— ایال کھڑے ہو ہو جاتے تھے۔ ہمارے دونوں تانگے بھی ایک دوسرے سے بالکل قریب آ چکے تھے اور درمیان کا فاصلہ تقریباً ایک فرلانگ رہ گیا تھا۔ میرا گاڑیبان متوحش سا تھا۔ اور ہم ہنوز معمولی اندازہ بھی نہ کر پائے تھے۔ کہ ہم دونوں میں سے اچھا چانس کس کو ملیگا۔ اگرچہ پہلے فیر کا حق مہمان ہونے کی حیثیت سے سنگھ بابو کا تھا اور مجھے اس کا احساس بھی تھا۔ اب آدم خور نیل گائے ہمارے دونوں تانگوں کے درمیان کے فاصلہ میں آ گیا تھا۔ اور نہایت اچھے رینج میں تھا۔ یہاں پر ارہر بہت گھنی اور لمبی تھی۔ میں سنگھ بابو کے لئے سائڈ چھوڑنے کا اشارہ اپنے گاڑیبان کو دے رہا تھا۔ سنگھ بابو اپنے تانگے پر ایک مستعد جرنیل کی طرح رائفل تانے اہری وردی پہنے نہایت نمایاں کھڑے تھے۔ اور جیسا کہ انتہائی اطمینان کے وقت ان کی عادت تھی کہ فیر کرنے سے پیشتر بار بار لاشعوری طور پر ان کا ہاتھ اپنی راجپوتی وضع کی اٹھی ہوئی مونچھوں پر جاتا تھا۔ سیدھے ہاتھ میں رائفل پکڑے الٹے ہاتھ سے مستقل مونچھیں بٹ رہے تھے۔ اور میرے سائڈ چھوڑنے کے اور نیل گائے کا کوئی اچھا رُخ ملنے کے منتظر تھے۔ میرا گاڑیبان اب اس قدر ہراساں ہو چکا تھا کہ بمشکل میرا مخصوص اشارہ سمجھ سکا۔ درمیان میں پہنچنے اور اس قدر قریب ہو جانے کے باوجود بھی نیل گائے نے ہمارے تانگوں کی جانب توجہ مبذول نہ کی۔ اللہ

میرے! نشۂ طاقت زعمِ بہادری!! ایسا اُترے گا۔ کہ پھر کبھی نہ چڑھیگا۔ دکھا لو خوب شانِ تغافل! شوں شوں کر کے، اکڑ اکڑ کے، ترچھے ہو ہو گئے۔ اور میں مسکرا پڑا۔ کیونکہ سامنے سنگھ بابو مونچھیں بٹتے ہوئے مسکرا کر میری جانب دیکھ رہے تھے، اور گویا کہہ رہے تھے۔ کہ سائڈ چھوڑ دو اور بس لاد لو گاڑی منگا کر ———

میں نے نہایت شدت کے ساتھ گاڑیبان کو جلدی سائڈ چھوڑنے کا اشارہ کیا اور وہ بیلوں کا رُخ بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ سامنے ارہر کے گھنے درختوں میں خونی نیل گائے کے بالکل مقابل لوہیا پاسی کو پینترا بدلتے اور لاٹھی گھماتے دیکھا یا اللہ! یہ کہاں سے نکل پڑا کم بخت!! نیل گائے نہایت پھرتی سے وار کر رہا تھا اور لوہیا نہایت تیزی سے پینترا بدل بدل کر مقابلہ کر رہا تھا۔ پوری پوری خود مختاری اور بھرپور سپر مندی کا مظاہرہ تھا۔ حیرت ہے تو ہمیں پہلے ہی وار اور پہلے ہی بچاؤ پر خلاصی ہو گئی۔ اور ہم نے سمجھ لیا کہ صورتِ حال کس درجہ نازک ہے مگر ہمارے فیر کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ پہلی چیز تو یہ تھی۔ کہ ہم سائڈ نہ چھوڑنے پائے تھے اور ہمارے تانگے بالکل آمنے سامنے ایک دوسرے کی ٹھیک ٹھیک زد میں تھے، دوسرے خود ہمارے بیل بھی بھڑک رہے تھے۔ اور ہمیں ایک سیکنڈ بھی فیر کرنیکے لئے سکون کا نہ ملتا تھا، تیسرے خونی نیل گائے اور لوہیا ایک دوسرے پر اس طرح حملہ کر رہے تھے۔ کہ ہم اطمینان کے ساتھ شست لیکر یہ گارنٹی نہیں کر سکتے تھے۔ کہ گولی کس پر پڑے گی۔

لوہیا متواتر نہایت بہادری سے نیل گائے کو ڈانٹ رہا تھا اور لاٹھی گھما گھما کر ڈرا رہا تھا۔ اور اس اچھل کود میں ایک آدھ آواز مدد کی درخواست کی بھی ہمارے کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ ڈکرا ڈکرا کر اچھل اچھل کر اور جھک جھک کر نیل گائے خونیں حملے کر رہا تھا اور گھوم گھوم کر اور پینترے بدل بدل کر لاٹھی اور بنوٹ کے فن کی پوری صلاحیتیں استعمال کر کے لوہیا خالی دے رہا تھا۔ اور ایک مرتبہ غالباً ہماری جانب مدد کی درخواست

کے لئے لوبیا کی نگاہ چوکی اور منظر بدل گیا۔ نیل گائے کے سر پر ایک جیتھڑا سا اچھلتا دکھائی دیا۔ اور نیل گائے کی خونی آواز کے جواب میں ہم نے بجائے ڈانٹ کے ایک دل دوز چیخ سُنی اور ہم دونوں نے بھی اس دل دوز چیخ میں لاشعوری وفطری طور پر اُس کا ساتھ دیا۔ بدنصیب لوبیا! — کم بخت اونچی اونچی گھنی ادہر میں نہ تو نیل گائے کی آواز ہی سن سکا! اور نہ اسے دیکھ ہی سکا! اور نیل گائے شروع ہی سے اپنی جبلت سے اندازہ کر کے صرف اس کی جانب بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ بھڑ گیا اور بدقسمت شامت زدہ نوجوان کو احساس نہ ہوا۔ ہم دونوں بدستور مجبور اپنی رائفلیں تانے ہوئے تھے۔ ہمارے گاڑیبانوں پر بجلی سی گر گئی تھی۔ اور ہمارے بیلوں میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ ہم بدستور ایک دوسرے کی زد میں تھے اور ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے سے تھے۔ بیل بے قابو تھے۔ بار بار رائفلیں کندھے تک چڑھتی اترتی تھیں۔ یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے اک آن میں بیس بیس گز لمبی چوڑی جگہ میں ادہر کا ایک پودا بھی کھڑا باقی نہ رہا۔ اور ٹہنیوں اور پتیوں کا دبیز فرش سا ہو گیا۔ اور تانگے متحرک تھے — ایک دوسرے کی زد میں تھے — اور وہ بھی متحرک — سیمابی کیفیتوں کا تسلسل تھا۔ بیل بے قرار تھے۔ اور گاڑیبانوں کے لرزاں ہاتھ ان کی رسیوں کو قابو میں لانے سے قاصر تھے غرض کسی زاویہ سے کوئی شکل فیر کرنے کی نہ تھی اب ہمارے ساتھی کا قیمہ کیا جا رہا تھا۔ اور ہم بیسویں صدی کے مہلک ترین ہتھیاروں سے مسلّح ہوتے ہوئے بھی حرکت کرنے سے بدستور عاجز رہے، سارا فن بیکار تھا اور ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

میں نے گاڑیبان کی پشت پر گھٹنا مارتے ہوئے گالی دیکر کہا: "ابے . . . . موڑ پیچھے جلدی سے" اور شاید یہی عمل سنگھ بابو نے کیا۔ حادثہ کی ستم ظریفی! ایک دوسرے کے قریب پہنچنے کی کوشش میں تقریباً مجھے سنگھ کی جگہ پر اور سنگھ کو میری جگہ پر پہنچا دیا گیا — ہم بدستور مجبور رہے۔ اضطراب، تلوّن اور خوف کی ایک عجیب ناقابلِ بیان کیفیت ہم پر طاری تھی۔ ہمارے چاروں بیل اور گاڑیبانوں کے چاروں ہاتھ کی حرکات میں ذرا سا بھی ربط وضبط نہ تھا۔ غیر مناسب اور غیر معیّن حرکتوں کا تسلسل اور تواتر تھا۔ اور ہم اس میں بُری طرح گرفتار تھے۔ بس ایک منٹ کے چہارم حصّہ کے محتاج! — ہمارے بیل ایک مرتبہ کچھ ایسے اُچھلے کہ ہمارے دونوں تانگے ایک دوسرے کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ مجھے گاڑیبانوں کے اعصابی انتشار کا پورا پورا احساس تھا۔ سیدھے ہاتھ سے رائفل پر جھک کر میں نے اُلٹے ہاتھ سے بیلوں کی رسیاں پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچ لیں۔ سنگھ بابو نے بھی میری تقلید کی۔ اور ہمارے تانگے ایک دوسرے سے بالکل ملحق ہو گئے۔ اتفاق سے نیل گائے ہاتھ پر بھی سنگھ بابو کے تھا اور مہمان کی حیثیت سے حق بھی انہیں کا تھا میں نے کہا "لگے ہاتھ سنگھ!" — وہ ذرا جھجکے اور کچھ رُکتے ہوئے کہا "مگر — واں — واں، پر — وہ — و — لوبیا! — لوبیا جو ہے —"

اس وقت آدم خور نیل گائے کا کوئی رُخ معیّن نہ ہو سکتا تھا۔ اور نہ ایسے وقت پر کوئی حرکت صحیح ومتناسب قائم رہ سکتی ہے — سینگھوں کے برچھیوں سے جھنجوڑ رہا تھا، نوکدار کھروں کی کناروں سے دھجیاں اڑا رہا تھا، کوہ شکن ٹکروں سے ریزہ ریزہ کر رہا تھا۔ مختلف زاویوں اور غیر معیّن رُخوں سے مار رہا تھا۔ دھاردار پنجوں سے نہیں! نوکدار کچلیوں سے نہیں!! خونخوار جبڑوں سے نہیں!!! چیرنے اور پھاڑنے والی فطرت سے نہیں، مارنے والی پنجر سے نہیں۔ بلکہ سبک رفتار پھٹے کھروں سے جگالی کرنے والے چپٹے دانتوں سے، میخ جیسے کھٹلے سینگوں سے بھاگنے والی خلقت سے خدا تعالیٰ کے شاہکار کی دھجیاں اڑا کر ریزہ ریزہ و شکست وشبت کا غیر فطری ڈرامہ کھیل رہا تھا۔

میں نے قدرے جھنجلا کر کہا "کہاں ہے اب وہاں لوبیا"

سنگھ بابو کا رائفل کندھے کی جانب اُٹھا۔ اور وہ پھر کچھ جھجکے۔ اور دبی زبان سے کہا "اور — ہ — اور — ہ نیل گائے تو! —"

"آدمی تو کھلا ہے! — میں نے کہا۔

لوہیا کی اُڑ گئے سہی — کوئی پوچھے گا تو کہدینگے - کہ آدمی کا شکار کر رہے تھے - نیل گائے پر دھوکے سے پڑ گئی" میں نے کہا اور سنگھ بابو پر ایک مرتبہ اور شکاری حملہ والی کیفیات طاری ہوئیں مگر رائفل اس چابک دستی سے نہ اٹھا جیسا کہ اس وقت اٹھنا چاہیئے تھا - اور میں نے اس کا اندازہ کر کے ذرا ترشروئی کے ساتھ کہا" کیا غضب کرتے ہو، ذرا دیر میں یہ ہم سب کو مار ڈالیگا - لوہیا کی طرح ہم بھی کھلے ہوئے ہیں - کوئی داد ہوگی نہ فریاد — " اور سنگھ بابو نے جلدی سے مونچھوں پر آخیر مرتبہ ہاتھ پھیرا — اور نہایت فنکارانہ انداز میں شست لیکر اپنے .30 اسپرنگ فیلڈ رائفل کا ۱۸۰ گرین والا اسپیل رسید کیا - گولی ہزاروں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے آدم خور نیل گائے کے آہنی تاروں جیسے بال کاٹتی ، لوہے کی چادر سی کھال پھوڑتی ، پتھریلے اعصاب اور فولادی رگ و ریشوں کو توڑتی اور سنگین ہڈیوں کو سرمہ کرتی عقب سے اندر گئی اور پھٹ گئی - خونی نیل گائے نے بڑے زور سے چھال ماری - اور لوہیا کو چھوڑ کر دوسری جست میں ادہر کی سبز قناتوں میں غائب ہوگئی -

روز قیامت یہ چار پانچ منٹ گزر گئے - تمام جنگل زیر و زبر ہوگیا — لوہیا جیسے مضبوط اور بہادر اسپورٹس مین کا قتل !! اور پھر دو رائفلوں بیچ !!! دونوں گاڑی بان تانگوں پر بُت سے بنے ہوئے دم بخود تھے ، ہم دونوں ذہنی اعتبار سے کلیتاً مفلوج سے تھے ، لوہیا کی لاش کا لوتھڑا ادہر کی ٹوٹی ہوئی کلیوں اور مسلی ہوئی پتیوں کے سبز فرش پر خاموش تھا ، کاسۂ سر پاش پاش ، بھیجا بکھرا ہوا اور خون کا چھڑکاؤ لگا ہوا - شکاری جذبہ ، انتقامی جذبہ ، حفاظتی جذبہ سب کچھ مفقود تھا ، جنگل کی چمکدار فضا بسیط اور روشن وسعت خاموش تھی - کائنات پر ٹھیک ٹھیک موت والا سناٹا طاری تھا — اور اس جمود کو ہمارے پیچھے کچھ دور ایک ببول کے درخت پر چڑھے ہوئے بھنگی کی آواز نے توڑا -

"سرکار ٹھہر گیا ، ٹھہر گیا" اس نے کہا - اور جدھر کو نیل گائے بھاگی تھا ادھر کو اشارہ کیا - اب ہم کچھ کچھ صحیح حالت پر آگئے اور ہم نے اپنے گاڑی بانوں کو تانگا بڑھانے کا حکم دیا - مگر ان کی تو حالت ہی دگرگوں تھی - ڈر کے مارے تمام بدن پر رعشہ تھا ، ہمارے دوبارہ کہنے پر گھگھیا کر اور سفید سفید دانت آگے کو نکالتے ہوئے صرف انداز سے معذوری ظاہر کی - کیونکہ قوت گویائی سلب تھی -

اور بھنگی کی آواز پھر سنائی دی " رک گیا سرکار ! رک گیا — ارے ! ! چوٹ کھا گیا ! ! " یہ سنکر میں نے سنگھ بابو سے مخاطب ہو کر کہا " سن رہے جی سنگھ ! — وہ کہہ رہا ہے چوٹ کھا گیا — اور دوست اس کا اندازہ غلط نہیں ہوسکتا - میرے ساتھ اس کی تمام عمر شکار ہی میں کٹی ہے "

مجھ پر تو کچھ خوشی کی ہلکی لہر سی آئی بھی مگر سنگھ بابو بدستور متاسف رہے اور بولے " خیر وہ گولی تو پڑ گئی - مگر بیچارہ لوہیا ! — اسے بچا نہ سکا میں ! "

اچھا اب ماتم کا وقت نہیں ہے - ابھی چل کر دوسرا لو — نہیں تو اور بھی منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی " اور دور میدان میں سے ہمارے بقیہ ساتھیوں کی آوازیں دریافت حال کے لئے ببولوں پر سے ہمارے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح چلی آرہی تھیں -

" مگر چلیں گے کیسے ایں — وہ — اوں - یہ چمار تو بڑھتے ہی نہیں — اور بڑھیں بھی تو کس کام کے — ابھی دیکھا نہیں تھا حال وہ تو مجھے ہمیں سب کو مروایا ہی تھا "

اجی لعنت بھیجو سالوں پر - ادھر آجاؤ اس تانگے پر میں ہانکتا ہوں -

" ارے تم — واہ ! کیوں تو پھر اتر ہی نہ لیں " سنگھ بابو نے کچھ خفیف سا ہو کر کہا -

کیا اب بھی پیدل جانے کی ہمت کر رہے ہو ، دیکھا نہیں بیچارہ نوجوان کام آگیا — ورنہ اگر ذرا سی بھی جھلک دیکھ لیتا تو کیا ہو جاتا "

" ہاں اور دیکھو دو رائفلوں بیچ آنکھوں کے سامنے ختم

ہوا اور ہم کچھ نہ کر سکے! — وقت کی بات ہے — اور پھر کتنی دیر تک! — اوہو!! — "

میں نے اپنے گاڑیبان سے کہا کہ اتر کر دوسرے تانگے پر بیٹھ جائے اور اسکے ہاتھ سے رسیاں خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔" مگر میرا گاڑیبان اس درجہ خائف تھا کہ تانگے سے اترنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی اور حالت اس قدر قابلِ رحم تھی۔ کہ سختی کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ آخر میں اپنی بندوق اور رائفل لیکر خود اتر پڑا اور جس تانگے پر سنگھ بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب پہنچا۔ تو وہ گاڑیبان بھی تانگا چھوڑنے کو طیار نہیں تھا۔ مجھے تاؤ تو آہی گیا تھا رائفل کا کندا رسید کیا اور گاڑیبان سے پکڑ کر تانگے سے نیچے کھینچ لیا" وہ دونوں ایک تانگے پر جمع ہوگئے۔ اور ہم دونوں ایک تانگے پر جمع ہوگئے۔

میں نے بیلوں کی رسیاں لے لیں اپنی بندوق اور رائفل پچھے "تانگے میں رکھ دی اور ہانکنے کا ہنٹر ہاتھ میں لیکر بیلوں کو ادھر ہانکا جدھر نیل گائے بھاگ کر گیا تھا۔ ہمارے دماغوں پر خوف، افسوس غصہ اور انتقام کے عجیب و غریب ملے جلے احساسات طاری تھے اور ان تینوں کیفیات میں بڑے زور سے کشمکش ہو رہی تھی۔ اور ان میں سے ہر کیفیت ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ SPORT کا احساس بالکل محو تھا۔ ورنہ میں رسی پکڑ کر بیل ہانکتا ہوا اور سنگھ بابو پیچھے بیٹھ کر شکار کھیلتا ہوا اس فینسی ڈریس قسم کے شکار سے ہم دونوں بچپن کے ساتھی نہ معلوم کتنے لطف اندوز ہوتے۔ مگر در اصل میں گاڑیبان تھا۔ اور سنگھ بابو شکاری —— اور ہم اس وقت شکار نہ مار سکنے کی خفت مٹانے جا رہے تھے۔ خفت کا احساس اس قدر شدید تھا۔ کہ ہم دونوں کی ایک دوسرے سے آنکھیں چار نہ ہوتی تھیں۔ نہ بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ سنگھ بابو نے بھنگی کی بات پر پورا یقین نہ کیا تھا۔ اور انھیں ہنوز شبہ تھا۔ کہ فیر خالی گیا اور نیل گائے ہمارے ساتھی کو آنکھوں کے سامنے مار کر راجگر نکل گیا۔ اور یہ چیز ایک پختہ کار شکاری اور خاندانی راجپوت کو جتنی گراں گزرنی چاہیئے گزر رہی تھی۔ اُنھوں نے اپنی آواز درست کرتے ہوئے حلق میں جمے ہوئے جیپ کو صاف کرتے ہوئے نہایت آہستہ سے کہا، "جو دوسری بار ہاتھ خالی گیا —— میں نے ۱۸۰ گرین والا شیل مارا تھا۔ صاف جا نہیں سکتا تھا معلوم ہوتا ہے بچ گیا" اور جوں ہی اُنھوں نے اپنا جملہ ختم کیا ایک دم میری نگاہ ادہر کے پیڑوں کی خون آلود پھنگیوں پر پڑ گئی اور میں نے کہا "کیا بکتے ہو! یہ دیکھو! — اور پھر نیچے کھوج کی جانب غور کر کے کہا اور دیکھو اگلے نقش پا کی سیدھ میں اوپر کے درخت کی پھنگی پر خون لگا ہوا ہے۔ شانہ پر پڑی ہے گولی — نہایت کاری" اور یہ کہتے ہوئے جب میں نے پیچھے مڑ کر ذرا اوپر نگاہ اٹھائی تو سنگھ بابو کا سانولا چہرہ وفورِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور میں نے انکے جذبات کا احساس کرتے ہوئے کہا" ویل شاٹ!!" —

"ہاں تو میں نے شانہ تو لیا ہی تھا، بڑا مضبوط معلوم ہوتا ہے" — ۱۸۰ گرین کا شیل!! اور لیکر صاف گیا!!" — سنگھ بابو نے فخریہ انداز میں کہا۔ اور خوب تن کر پوری لمبائی تک کھڑے ہوگئے۔

ہاں مگر نیل گائے کیا ہے، پوری دیوار کی دیوار ہے میں نے خون آلود ادہر کی پتیوں میں نیل گائے کے راستہ پر بیلوں کی رسیاں موڑتے ہوئے کہا —— بیل ابھی تک خائف تھے اُنھوں نے راستہ چلنے کھانا چھوڑ دیا تھا —— بھنگی برابر رہنمائی کر رہا تھا۔ جس کی تصدیق خون آلود راستہ کرتا جاتا تھا۔ سنگھ بابو بار بار اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر شاید اب تک ہمارے میدان والے ساتھیوں کو یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ کہ آدم خور نیل گائے زخمی ہوگیا ہے۔ لوہیا کے مارے جانے کی خبر تمام جنگل میں پھیل چکی تھی۔ بھنگی کی رہنمائی کی بھی ہمیں چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ خون کے قطرے جو اب رفتہ رفتہ چھینٹوں کی شکل اختیار کر رہے تھے ہمیں بہ آسانی اس راستہ پر چلا رہے تھے۔ جس پر نیل گائے گیا تھا۔ ہم پر لوہیا کی موت کا احساس نہایت تیزی کے ساتھ ذہنی کوفت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

بڑا بھاری قلق اس بات کا تھا۔ کہ وہ ہمارے سامنے اس بیرحمی سے قتل کردیا گیا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔ کم از کم ہماری شکاری زندگی میں تو یہ پہلا واقعہ تھا۔ ہم دونوں بہت معمولی شکاری ہیں۔ مگر چونکہ اس تمام دس بارہ میل لمبے چوڑے علاقہ میں کوئی اور شکار کھیلتا ہی نہ تھا۔ لہذا ہم ملک الموت خیال کئے جاتے تھے۔ اور سال میں دو چار مرتبہ جب ہم دونوں جمع ہو جاتے تھے۔ تو پھر تمام جنگل میں کھلبلی مچ جاتی تھی۔ جو جانور سامنے آجاتا تھا۔ بچکر جاتا ہی نہ تھا۔ نیل گائے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے ساتھی کو مار کر چلا جائے! اور ہماری بندوق کے سامنے سے بچکر نکل جائے! ہم کو تو چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام تھا ہی مگر تمام دیہاتیوں میں بجز ہمارے بھنگی دیدبان کے بھوت والا عقیدہ راسخ ہو رہا تھا۔ مگر بھنگی نے ادہروں میں کھڑے ہوئے ببول پر سے اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا۔ کہ وار پورا پڑا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہمیں خون زیادہ ملتا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ ادہر کے پودے تمام کے تمام خون میں نہائے ٹپک رہے تھے — موت کا خاموش راگ تمام جنگل میں گونج رہا تھا — خون، اور موت، جائے وقوعہ سے لیکر تمام چک میں خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ نیل گائے کے خون کو دیکھ کر ہم پر جدائی کیفیت طاری نہ ہوئی — یک دم ہمارا تانگہ مڑا۔ کیونکہ اب خونی راستہ ہمارے بالکل سیدھی جانب جا رہا تھا۔ ہمارے دیدبان نے اشارہ کیا۔ اور چلا کر کہا "بس سرکار یہی یہی! —" اور ہم نے اپنے تانگے سے پچیس تیس گز کے فاصلے پر ادہر کی گھنی نمو کے درمیان دیوار کی دیوار نیل گائے کھڑا دیکھا۔

میں نے مڑ کر اوپر کھڑے ہوئے سنگھ بابو کا چہرہ دیکھا اور چونکہ نیل گائے کی ہماری جانب پشت تھی۔ لہذا نشانہ لینے کے لئے ذرا ایک جانب موڑنے کو بیلوں کی رسیاں کھینچیں۔ اور تانگے کو نشانہ کے رُخ پر لگا کر میں نے سنگھ کو پھر اشارہ کیا اور اشارہ ہی اشارہ میں تانگہ روکنے کی اجازت طلب کی۔ تا کہ وہ اطمینان سے نشانہ لگا سکیں۔ سنگھ نے جھک کر میرے کان پر ہونٹ رکھ دیئے اور کہا دیکھتے نہیں ادہر بہت گھنی ہے۔ گولی اُس تک نہیں پہنچے گی۔ ادھر ہی پھٹ جائے گی لگ کر پودوں میں شیل ہی شیل ہیں سب میری میگزین میں "

"کیا کوئی سالڈ بال کا کارتوس نہیں ہے؟"

"میرے پاس تو نہیں ہے"

"میرے بیگ میں شاید کچھ ۲۵۰ گرین والے سالڈ پڑے ہیں اور غالباً ایک دو ۲۲۰ گرین والا ہے نکال لو۔"

مگر میری میگزین بھری ہوئی ہے۔ اسے خالی کروں۔

اور ہماری اس کانا پھوسی میں، نیل گائے چوکنا ہو کر چل دیا: لاحول ولا قوۃ! یار سنگھ تم بھی نرے وہی ہو چار بندوقیں پڑی ہوئی ہیں۔ اور یہ نیل گائے بس ایک فیر کا محتاج ہے۔ کوئی جما دی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"جما کیا دیتا۔ بھئی سب کے پاس نرے شیل ہیں۔ میری میگزین شیلوں سے بھری ہوئی تمہاری میگزین شیلوں سے بھری ہوئی ایسی گھنی ادہر میں شیل چلانے سے فائدہ؟ بس لکڑیوں میں لگ کر ہی پھٹ جاتا۔"

"تو یار تم نے بارہ بور اٹھالی ہوتی اور یہ" پہلے سے سوچا ہوتا —"

"اس بارہ بور! اور کیا بارہ بور کی ان چوک نالوں میں شیل کے علاوہ سالڈ بھی مِل جاتا — اور شاید دو چار لیتھل کے کارتوس پڑے ہونگے۔ دونوں تھیلوں میں۔ اگر سالڈ ہوتا بھی تو چوک نال میں بیکار تھا۔

"ایل جی رکھ کر کنپٹی پر رسید کرتے۔"

"خیر چھوڑو — اور یہ کہہ کر سنگھ بابو نے رائفل رکھ کر بارہ بور اٹھالی۔"

"ہاں جی کیوں گولی چلاؤ۔ بس اب کی مرتبہ موقع پر آئے تو ۳۰۰ لگاتا لانگ رینج کا کارتوس جما کر کنپٹی ملا کر — بس ایک فیر کا محتاج ہے ایک فیر کا۔"

اور جب ہم اس جگہ پہنچے۔ جہاں خونی نیل گائے کھڑا

رہا تھا تو ہم نے دیکھا کہ جیسے پورا مشک بھر خون بکھرا پڑا ہے
"آہو بڑی بھاری گولی پڑی ہے۔" میں نے کہا اور تازہ خون کے بہتے ہوئے راستہ پر ہمارا تانگا بدستور چلنے لگا۔

"بڑی اونچی ارہریں ہیں" سنگھ بابو نے کہا۔ اور دور تک خون سے رنگین ارہر کی پھنگیوں کی جانب اشارہ کیا۔
"مگر نیل گائے بھی کچھ کم اونچا نہیں ہے" میں نے کہا۔ جس وقت چونکتا ہے تو سر اور گردن کا بالائی حصّہ صاف ہی پھنگیوں سے اوپر نظر آتا ہے۔ بس وہیں پر جما دینا ٹن ٹن دونوں فیر ایک ہی لپشت پر"

"ہاں مگر چودھری تم کہہ تو رہے ہو بک شاٹ کو مگر گردن اور کنپٹی، انچ بھر موٹی کھال میں لپٹی ہوئی ہے نیل گائے کی۔"
"ارے ٹھاکر صاحب بک شاٹ سے دھوئیں اڑتے ہیں ٹڈیاں سرمہ ہوتی ہیں جانتے ہوئے ایسی بات کہتے ہو، انچ بھر موٹی کھال کیا چیز ہے۔ اور خون کی مقدار بڑھتی معلوم ہوئی اور میں نے غور کیا کہ یہاں پر رفتار پھر ہلکی ہوئی ہے۔ قریب کہیں ہی کھڑا ہوگا لہٰذا سنگھ کو خاموش رہنے اور طیار ہونے کا اشارہ کیا اور چند ڈگیں بیلوں نے بڑھا پائی ہونگی کہ سامنے نہایت گھنے حصّہ میں سے یکدم پھنگیوں کے اوپر سینگ کان اور گردن ظاہر ہوئی۔ میں نے یکدم بیل روک لئے۔ اور تانگے پر کھڑے ہی کھڑے بڑے اطمینان سے سنگھ بابو نے "تڑ" اور "تڑ" دونوں فیر بک شاٹ کے کر دیئے، زخمی نیل گائے نے گراپ کی چوٹ کھا کر جیسے مکھیاں اڑانے کے لئے دو مرتبہ گردن جھٹکی۔ اور ایک جست کرتا دکھائی دیا اور غائب، کچھ دور گھنی ارہروں کے درخت متحرک دکھائی دیئے اور پھر سکون اور سناٹا۔ خون آلودہ شاہراہ سامنے تھی۔ اور ہماری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی۔

"بھئی چودھری صاحب میں نے بہت ہی جانچ کر کنپٹی لی تھی۔ پھر یہ کیا ہوا!!؟"
"ہوتا کیا۔ اٹھا گیا۔ صاف!"

"اہو! گولی کے بعد بھی اٹھا گیا!!"
"بھیا ٹھاکر جی وقت اور گھڑی کی بات ہے اور تم نے پھر S.G لگایا تھا جناب S.G اور S.S.G اسے کنپٹی کا مارا ——— نیل گائے الٹ کر جا پڑتا ہے جہاں کا تہاں۔ اب کم سے کم تمہارے دونوں فیروں کے بارہ دانوں میں سے اس کے چار پانچ دانے تو ضرور ہی پڑے ہیں"

"مگر چودھری انچ بھر موٹی کھال ہوتی ہے۔ کہاں تک توڑے S.G بھی"
"دوست وقت کی بات ہے۔ یہ کوئی نرالا ہی نیل گائے تو ہے نہیں ہاں بڑا ضرور ہے۔ اور یہ جو کچھ دنوں سے بند کر دیا ہے سرکار نے سو منتی پر آگیا ہے اور کچھ نہیں۔ کیا آج تک نیل گائے نہیں مارے"

"مگر اب نکل کے جائیگا نہیں آج ہم کھول کر ہی رہینگے۔ نیل گائے" سنگھ نے ذرا سے مذاقیہ انداز میں کہا۔
"یہ کچھ مت کہو اس کا نام شکار ہے۔ چھری تلے سے گردن نکال کر بھاگتے دیکھا ہے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا خیر ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے ہیں۔ جائیگا کہاں تک سالا نکل کے شام دور ہے"

مگر ہمارے تمام ساتھیوں کے دل میں بھوت والا عقیدہ راسخ ہو گیا تھا۔ اور ببولوں پر چڑھے ہی چڑھے وہ آپس میں بآواز بلند ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے ہم اب زخمی نیل گائے کا پیچھا کرتے ہوئے رمیج کے میدان سے کافی قریب ہو گئے تھے:
"ارے مت کٹی ہے مت۔ جے بھوت ان کے پٹکن دٹیاخوں سے ناہیں مرئیے دمریگا)
"نہ معلوم کون بلا ہے! نیل گائے ہوئے تو مرتے!"
"ارے ہوا اور آسیب پہ گولی اثر ناہیں کرت۔ کنور جی ہنن چوٹیں کر چکے ہیں بکت ناہیں ہوت"
اور ان آوازوں کو سنکر سنگھ بابو دانت کٹکٹا کر بڑبڑا اٹھتا۔ تیری ایسی تیسی۔ دیکھتا ہے کہاں جاتا ہے نکل کے

اب کی، پہلے تو جذبہ شکار۔ پھر جذبہ انتقام، نیل گائے کھولنے اور آدمی بند کرنے کے مصلحانہ عمل کی تکمیل کا جذبہ اور ان گنواروں کا مغالطہ دور کرنا۔ جن کی آوازیں ہمارے اوپر تازیانہ کی طرح پڑ رہی تھیں۔ ہم پر اسکے شکار کرنے کا بھوت سا سوار تھا۔

سنگھ بابو نے کہا "چودہری کہیں بچکر نکل گیا اور ہاتھ نہ آیا تو موُنھ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی میں تو رائفل لے کر کسی کنوئیں میں پھاند پڑونگا۔ آنکھوں سامنے ہمارے آدمی کو مار کر نکل جائے" اور سنگھ بابو کا چہرہ امید و بیم کا مرکز بنا ہوا تھا۔

خیر درست یہ سالا بچ تو سکتا نہیں۔ اگر آج نہ مرا تو کل مگر دس پانچ کوس پر جاکر مریگا تو ہماری کرکری ہو جائے گی۔ خیر جاؤ یہ طے رہا کہ اگر آج شام تک نہ مار سکے تو ہم تم دونوں بندوق چھونے کا زندگی بھر کو عہد کرلیں گے"

"مریگا کیسے نہیں سالا — ابھی لو ابھی —" سنگھ بابو کا چہرہ سرخ ہوگیا — ذرا جھلک نظر آجائے اب کی مرتبہ"

ہمارا تانگہ سرخ راستے پر بڑھ رہا تھا اب ربیع کا میدان سامنے تھا اور ببولوں پر بیٹھے ہوئے گنواروں کے طنز کے تیر نمایاں طور پر کانوں میں آرہے تھے۔ اور وہ کیوں نہ بھوت سمجھنے لگتے۔ جب ان کی روایات میں نیل گائے کا شکار بالعموم رائفل کی ایک گولی سے ہوتا رہا تھا۔ اور یہ تو تین کھا چکا تھا۔ نیل گائے بند ہونے کے بعد سے یہ پہلا شکار تھا جو اُن کے سامنے ہو رہا تھا۔ اور تڑاتڑ فیر ہو رہے تھے۔ قانون تحفظِ نیل گائے کے نفاذ کے بعد شاید نیل گائے یہاں تک خونخوار ہو گئے تھے کہ آدمی کو کھا جائیں اور اتنے مضبوط ہوگئے تھے کہ تین تین فیر کھا جائیں!

ہم خون میں لتھڑے ہوئے قدِ آدم ارہر کے پودوں کے درمیان اپنا تانگہ ہانکتے رہے یہاں تک کہ ارہر کا چک ختم ہوکر ربیع کے میدان کا کنارہ آگیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ ربیع کی مینڈھ سے دس بارہ گز ہماری جانب کو ہم سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر آدم خور نیل گائے کھڑا ہے۔ سر سے پاؤں تک خون میں نہایا ہوا — ہمارے اتنے قریب پہنچنے پر اس نے چلنے کا انداز بنایا — بیل خوب جم کر کھڑے ہو گئے۔ سنگھ بابو نے بہت اچھی نشانہ لیکر پھر تڑاتڑ — دو فیر داغ، ون ایک ہی نشانے پر جائے۔ ایکی مرتبہ بائیں کنپٹی سامنے تھی مگر وہاں پھر مکھیاں ہی جھاڑیں اور غائب — سنگھ بابو معنت میں خفیف سے ہوتے اور بولے "اوہو! نیل گائے ہے یا ہاتھی!! کم بخت! دیکھا تم نے چودہری یار ایسا گیا ہے۔ جیسے کارتوس میں گراپ ہی نہیں تھے۔

"بھیا وقت کی بات ہے پانچ چوٹیں جھاڑ گیا۔ سخت جانی کی انتہا ہے"

"وقت کی بات کچھ نہیں ہے۔ تم نے ہمیں وہیں بتادیا تھا۔ کہ تمہارے تھیلے میں سالڈ بال کے کارتوس ہیں ایک 250 گرین والی سالڈ کے مارے تو کھوپڑی اڑی چلی جاتی علیحدہ! غلطی ہماری ہوئی جو بارہ بور اور ریک شافٹ کے چکر میں پڑ گئے یار اتنی دیر سے اور معنت میں"

"توپ ہی کیوں نہ جھاڑ نے بھیا وقت کی بات ہے۔ ایسے سچے ہاتھ پڑ رہے ہیں .... نیل گائے ہے کہ آسیب؟!"

"ہاں یار کچھ کہہ نہیں سکتا! — رائفل اور بندوق سب ہی فضول ثابت ہو رہے ہیں! —"

اب ہم نے پھر اپنا تانگہ اسی طریقے سے جدید تر خونی رہنمائی پر ڈال دیا۔ اب ہمارے ایک ہاتھ پر ربیع کا وسیع لہلہاتا میدان تھا اور دوسرے ہاتھ پر ارہروں کا سبز کاہی چک — راستہ پر بمشکل چند منٹ چلے ہونگے۔ کہ یک دم ذرا سے تعجب کے ساتھ سنگھ بابو نے کہا "اوہو وہ تو بڑی لمبی دوڑ پر ہے۔ بڑا سخت جان نکلا" اور جب میں نے ان کے اشارے پر قدرے اچک کر نگاہ اٹھائی۔ تو تقریباً پانسو گز کے فاصلے پر ربیع کے کھیتوں میں دوڑنے اور چلنے کی درمیانی چال چلتا دکھائی دیا میں نے کہا سنگھ بابو یار یہ تو جنگل چھوڑ جانے کی سیدھ ملا رہا ہے۔ دیکھتے [illegible] — آج [illegible]ت خدا کے ہاتھ ہے۔ اللہ خیر کرے"

"وہ تمہاں بڑی تیزی سے جارہا ہے۔ مگر یار یہ دیکھو۔ مُونھ سے گھڑا بھر خون بھی پھینکتا چلتا ہے۔ کہاں تک نبھے گا اس صورت سے۔"

"بہ مت کہو۔ ممکن ہے کہ شام ہو جائے اور ہمیں بالکل نہ ملے،،

"پھر بھئی ہمارے ہاتھ میں بھی کیا ہے۔ اس وقت زد سے ہماری باہر ہے۔ چال اُس کی تیز ہے۔ اور ہمارے پاس آخر کو بیل گاڑی ہی تو ہے،،

"اور اگر ٹھہرے تو اب کی مرتبہ وہ 250 گرین والی سافٹ میرے بیگ میں سے نکال کر مارنا شانے پر،،

"بھئی وہ آڑ چھوڑ آیا اب رُکنے کا نہیں۔ اور میدان میں چاہیں سالڈ مارو یا شیل وہ تو وہاں گھنی ادبروں میں اندیشہ تھا کہ گولی اس تک پہنچنے سے پہلے ہی پھٹ جائے گی۔ اب اگر موقع ہوا تو شیل ہی ماریگے۔ مگر بھیّا نوبت آتی معلوم نہیں ہوتی دیکھے گا نہیں"۔

"جبراب تانگہ روک کر ہمیں چند منٹ اس کا رُخ دیکھنا چاہیئے"۔ میں نے کہا۔ اور ایک منٹ بعد وہ ایک ببول کے قریب سے گزرا جس پر ایک نوجوان پاسی بیٹھا ہوا تھا۔ اور تو تمام ساتھی اپنے اپنے ببولوں پر سہمے ہوئے تھے۔ مگر چونکہ پاسی کی قدیم ترین ہندوستانی قوم پر تمدن کا سایہ سب سے کم پڑا ہے وہ بزعم خود بھوت سے کشتی لڑنے کے لئے ببول سے کودا اور اپنی لاٹھی جو نیچے تنے سے ٹکی ہوئی تھی اٹھالی، نیل گائے اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ مگر سر اور گردن زخمی تھی لڑتا تو کاہے سے — نوجوان پاسی نے نہایت بہادری کے ساتھ للکار کر لاٹھی ماری ادہر اُسکے کودتے ہی آناً فاناً سب کے سب کود کر دوڑ پڑے۔ پاسی کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب میں حکم سلطانی کا بھوت اتر گیا۔ نیل گائے پہ درجنوں لاٹھیوں کا مینہ سا برس رہا تھا۔ اوچھل اوچھل کر، دھما دھم، کود کود کر تراخ پڑاخ، آگے لاٹھی پیچھے لاٹھی دائیں لاٹھی بائیں لاٹھی، بیحساب پڑ رہی تھیں۔ اور ہماری پارٹی کے پچاس

ساٹھ آدمیوں کے علاوہ جنگل کی زمین نے نہ معلوم کتنے آدمی اگل دیئے تھے۔ پرانی پرانی لوہے کی سلاخ سی لچک دار لاٹھیاں موٹے موٹے کالے کالے لٹھ تیلی تیلی لوچدار لمبی اور گٹھیلی ڈانڈیں ہر صورت اور ہر قسم کی بے بہاؤ کی پڑ رہی تھی! گاجر سی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں، موٹے موٹے برسوں کا تیل پئے ہوئے بھاری تیام والے لٹھ جیسے چپکا مٹی کے تودے پر پڑ رہی ہیں۔ مضبوط ہاتھ جھنجھنا اٹھتے تھے، کلائیاں اور پہنچے چیخ اٹھتے تھے۔ مگر آدم خور نیل گائے ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ یا علی اور بجرنگ بلی کے نعرے اور جنکارے آج ایک ہو رہے تھے۔ جنتا کی ضربیں سڑک کوٹ رہی تھیں۔ پیر جنگلی کے قانون کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر آدم خور نیل گائے جہاں کا تہاں سب ضربیں اس طرح اتارے چلا جا رہا تھا۔ جیسے ٹین کے سائبان پہ اولا پڑتا ہے بندق کی پے بہ پے ضربوں نے اسے حملہ کے قابل تو چھوڑا ہی نہ تھا مگر گاؤں والوں کی لاٹھی کے مقابلہ میں وہ مجسم مدافعت بنا کھڑا تھا۔ جیسے پتھر کا اسٹیچو ہے، جس پر لاٹھی کی ضرب اثر ہی نہیں کر سکتی — اس کی زخمی گردن کڑے سے کڑے جوانوں کی ضربوں سے ذرا بھی نہ جھکتی تھی — ہم دونوں تیز تیز بیل بڑھاتے قریب پہنچ گئے۔ اب عام دیہاتیوں کا میلہ لگ چکا تھا سنگھ بابو نے کہا کہو یار چودہری اب کیا کہتے ہو؟ اس غدر میں بندق تو چل نہیں سکتی اور دیکھو پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔ چھت کی کٹائی سی ہو رہی ہے اور گرنے کا نام نہیں لیتا۔ اور وہ دیکھو وہ دیکھو رائفل کی گولی کا یہ بڑا سوراخ ہے۔ کیسی سچی چوٹ پڑی ہے۔ اور دونوں کنپٹیاں علیحدہ چھوٹی پڑی ہیں۔ اور سب ہضم کر گیا۔ اور اتنی لاٹھیاں اوپر سے اور کھا گیا اور ٹس سے مس نہیں ہوتا"۔

"ہاں دیکھو ذرا تم بیلوں کی رسّیاں کھول لو۔ فیر کرنے کا موقع نہیں دیکھو نا — یہ کہ کر میں نے تمام جنگل میں بھرے ہوئے آدمیوں کی جانب اشارہ کیا۔ اور پھر میں نے اشارہ سے مارتے ہوئے دیہقانوں کو روک کر اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔ مگر فضول۔

میں نے کہا "اگر شام تک ایسے ہی کوٹتے رہوگے۔ تو بھی تمہیں نہیں گرا ملے گا۔"

"خونی نیل گائے آج اپنے خون کی دلدل میں کھڑا ہوا تھا اور جسم سے لال لال سوتے جاری تھے۔ آنکھوں سے بدستور غیض ٹپک رہا تھا۔ بڑی مشکل سے چند مقتدر آدمیوں نے نوجوانوں کو روکا۔ جن کی حسرتیں بھی مٹ چکی تھیں۔ اور کس بل بھی ٹوٹ چکے تھے۔ میں اور سنگھ آگے بڑھے دیوار میں زلزلہ ضرور تھا۔ مگر انہدام کی کوئی شکل نہ تھی۔ — آدم خور نیل گائے آہستہ آہستہ کانپ ضرور رہا تھا۔ مگر اس کی چاروں ٹانگیں مضبوط ستونوں کی طرح گڑی ہوئی تھیں میں نے سنگھ بابو کے ہاتھ سے بیلوں کی رسیاں لیں۔ جو وہ کھول کر لائے تھے۔ اور ایک شاطر پاسی کی جانب بڑھا کر کہا "یہ لے ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر گرا لے" اور پاسی نے نہایت پھرتی سے ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ پھانس کر سرک پھندا بنایا۔ اور نہایت ہنرمندی کے ساتھ ترچھا ہو کر کھینچ لیا بندوق کی ضربوں اور لاٹھی کی سمتوں سے جو عمارت نہ گر سکی تھی وہ رسی کے پھندے کی ترکیب سے اڑاڑا دوں نیچے آ رہی اور اس طرح پیر جنگلی کے حکم کا سند کیا ہوا نیل گائے مریدانِ دشتی کی رسیوں سے باندھ کر کھول دیا گیا۔ اور پھر آخری عمل ہمیشہ شکاری چاقو نے پورا کیا:۔ لوہے کے تاروں کے گچھے جیسے موٹے موٹے بالوں کو کاٹ کر، انچ بھر دبیز کھال میں گھس کر، موٹی موٹی نسوں پٹھوں اور سخت رگ ریشوں میں پیر کر اور حلقوم کی ہڈی کے کریوں کو علیحدہ کر کے میرے چاقو کی دھار نے ہمت اور رائے کے اشتراکِ عمل سے نیل گائے کھول دیا اور آدمی بند کر دیا

مصنّف: لوئیگی پراندیلو
مترجم: شاہد احمد دہلوی

اچھا جی

(۱)

۱۲ فروری ۱۸۶۱ء کی رات کو "کوردیرا فرانسسکو اور یلیو" اور اس کی بیوی علوریدا کے ہاں لڑکا (کوسموانطونیو کوردیرا) پیدا ہؤا۔ بچّے کو ناخوشگوار خیر مقدم سے دوچار ہونا پڑا ــــ اُسے خوب پیٹا گیا۔ وہ بغیر روئے دُنیا میں داخل ہؤا تھا۔ جاپے میں اتنی دیر لگی کہ اُس کا سانس گُھٹ گیا تھا۔ اس لئے دائی نے کچھ دیر اُسے اُلٹا لٹکا کر خوب ٹھکائی کی۔ یہاں تک کہ وہ رونے لگا۔ کیونکہ دُنیا میں داخل ہوتے ہی رونا پڑتا ہے۔

۱۳ فروری ۱۸۶۱ء اور ۱۵ مارچ ۱۸۶۲ء کے درمیانی عرصے میں اس پر پانچ انّائیں مامور کی گئیں۔ پہلی دو اس لئے علیٰحدہ کی گئیں کہ ان کے دودھ کم تھا۔ تیسری اس وجہ سے نکالی گئی کہ ایک دفعہ نہلاتے میں وہ پانی سمونا بھول گئی اور پکتے پانی ہی میں بچّے کو جھکولا دے دیا۔ بچّہ جُھلس کر رہ گیا اور مرتے مرتے بچا۔ اللہ ہی نے جان رکھ لی، مگر اُنہی دنوں میں اُس کے بدلے اُس کی ماں رخصت ہوگئی۔ چوتھی انّا نے اُسے تین دفعہ پلنگ سے نیچے گرنے دیا ــ زیادہ نہیں۔ ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ وہ بچّے کو گود میں لئے لئے سیڑھیوں پر سے لُڑھک گئی۔ یوں دو چار دفعہ گرنے میں کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ سب سے بڑی چوٹ یہ آئی کہ ناک کا بانسا ٹوٹ گیا۔ بس نو سال کا ہوتے ہوتے "کوسموانطونیو کوردیرا آمیدی" اُن تمام بیماریوں کو بُھگت چکا تھا۔ جو گویا سیڑھیاں ہیں زندگی کے زینے کی ــــ یوم پیدائش سے بچپن کی ہوشیاری تک۔ اَدویہ بھی اس طرح کہ ایک طرف سے ڈاکٹر نے سہارا دے رکھّا ہو اور دوسری طرف سے دوا فروش نے۔ جب وہ نو برس کا ہؤا تو مذہبی جذبات سے سرشار ہو کر گرجے کے مکتب میں داخل ہوگیا۔

مکتب جانے سے چند روز پہلے خیرات کے متعیّنہ سات کاموں میں سے ایک کی بلفظ تکمیل کر دی تھی۔ سمندر کے کنارے اُسے ایک غریب لڑکا ملا جو مادر زاد ننگا تھا۔ باپ نے نیپلز سے جو ایک اچھا سوٹ لا کر اُسے دیا تھا۔ کوسمو نے جھٹ اُتار کر ننگے لڑکے کو پہنا دیا۔ اور خود صرف ملاّحوں جیسی ٹوپی پہنے ننگ دھڑنگ گھر واپس آگیا۔ مگر افسوس! اس نیک کام کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ باپ نے اُسے احمق "گدھا" اور پاگل کہا۔ اور اِس زور سے اس کے کان کھینچے کہ تعجب ہے وہ کیسے لگے رہ گئے۔ اور صاف اُکھڑ کیوں نہ گئے۔

مکتب میں کوسمو مذہبی تعلیم میں بڑے ذوق و شوق سے منہمک ہوگیا۔ اس درجہ منہمک کہ سولہ سال کی عمر میں پہنچتے پہنچتے اُسے دِق کا شدید خطرہ لاحق ہوگیا۔ اس نے پہلا مقدّس درجہ حاصل کر لیا تھا۔

رومن کیتھولک دینیات کہتی ہے کہ یہ اصول ہر شخص کو پہلے مان لینا چاہیئے۔ کہ نیک کاموں میں استواری ایک سعادت ہے جو خدا اُن کو بخشتا ہے جنہیں وہ عزیز رکھتا ہے۔ چاہے اُن میں کیسی ہی خوبیاں یا خامیاں کیوں نہ ہوں۔

کوسمو اس مسئلے پر کئی ہفتے غور کرتا رہا۔ اس عرصے کے اختتام پر اُسے ایک رات اس حالت میں پایا گیا کہ ہاتھ میں موم بتّی ہے اور صرف قمیص پہنے حجرے میں گھوم رہا ہے۔ اُس کا چہرہ تمتا رہا تھا۔ اور اُسے بخار چڑھا ہؤا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اُن میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ دریافت کرنے پر اُس نے بتایا "مَیں کُنجی تلاش کر رہا ہوں" جب پوچھا گیا "کس کی کُنجی؟" تو اُس نے کہا "استواری کی" وہ بالکل دیوانہ ہوگیا تھا۔ خوش قسمتی سے دماغی بخار شروع ہوگیا۔ اسے گرجا کے مکتب سے ہٹا دیا گیا اور ایک مہینے تک اُس کی زندگی خطرے میں رہی۔

آخر جب وہ اچھا ہؤا تو اس کے عقائد زائل ہو چکے تھے۔ اور صرف یہی نہیں۔ اُس کے بال بھی زائل ہو گئے تھے گویائی غائب ہو گئی، آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ اَور بھی بہت کچھ زائل ہوگیا تھا۔ حافظہ بالکل جاتا رہا تھا۔ اور تقریباً سال بھر وہ بالکل گم سم ہو کر رہ گیا تھا

حمام مغز میں پچکاریاں دینے کے علاج سے وہ بتدریج صحت یاب ہوا۔
جب وہ کچھ اوپر بائیس سال کا ہوا تو میٹرک کا امتحان دینے اور پنجاب یونیورسٹی
میں جانے کے قابل ہوا۔ یہاں ادب و فلسفہ کی فضیلت کے لئے اُس نے
پڑھنا شروع کیا۔ وہ گنجا اور آدھا اندھا ہو چکا تھا۔ اور بچپن میں گرنے
سے اُس کی ناک پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔

اکتوبر ۱۸۸۵ء میں وہ مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا اور سسماری
کے لوئر سکنڈری اسکول میں اُسے اسسٹنٹ ماسٹر کی جگہ مل گئی۔ لڑکے
زندہ دل اور شریر ہوتے ہیں اور اگر اُن کا اُستاد بدقوارہ اور نیم بنیا ہو
تو مدرسے کا کمرہ چڑیا گھر بن جاتا ہے۔ اس لئے جماعت کی بدانتظامی کی
وجہ سے ہیڈ ماسٹر اپنے اسسٹنٹ سے ہمیشہ شکایت ہی کرتا رہتا۔

سسماری کے گلی کوچوں میں بھی پروفیسر کوسمو کو بچے چھیڑا کرتے
تھے۔ آخر اس کے ایک ساتھی استاد نے ۔۔ ڈالفوڈالفی نے جو نیچرل سائنس
کا پروفیسر تھا ۔۔۔ اسکول کے اندر اور سکول کے باہر بھی کوسمو کو بچانے
کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ وہ ایک قدم اور بھی آگے بڑھ گیا کہ کوسمو
کو اپنے گھر میں آ کر رہنے کا بلاوا بھی دے دیا۔

ڈالفوڈالفی نے معلمی کا پیشہ خاصی بڑی عمر میں اختیار کیا تھا۔
اس کے پاس تعلیم کی کوئی سند نہیں تھی۔ اور بغیر کسی امتحان یا مقابلے
میں بیٹھے اُسے ملازمت مل گئی تھی ۔۔۔ ایک بہت ذی اثر ممبر پارلیمنٹ
کی مہربانی سے۔ اس سے پہلے وہ افریقہ میں تجسس کرتا پھرتا تھا اور
پھر جنیوا میں کئی سال تک اخبار نویس رہا تھا۔ ایک درجن سے زیادہ
طمنچے کے مقابلے لڑ چکا تھا۔ اور بیشتر میں کامیاب رہا تھا۔ وہ بڑا آزاد
خیال تھا اور اپنی حرامی لڑکی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اِس کا شاندار نام
اس نے شیطانیہ رکھا تھا۔

ڈالفوڈالفی کی سرپرستی میں کوسمو کو اُمید تھی کہ چین کا سانس لیگا
مگر یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس کے محافظ نے اُسے اِس کا موقع
ہی نہیں دیا۔ کوسمو کا سارا فرصت کا وقت وہ اپنے سفر کے واقعات
سُنانے، اخبار نویسی کے زمانے کی چالبازیاں بیان کرنے اور مجادلوں
کی کیفیت بتلانے میں صرف کر دیتا تھا۔ اپنے کارنامے سنانے کا اُسے بڑا
شوق تھا۔ فلسفہ، مذہب وغیرہ پر بحث کرنے میں اُسے لُطف آتا تھا۔ ان
بحثوں میں صرف ایک ہی آدمی مسلسل بولے جاتا تھا۔ ٹانگیں پھیلائے،
سینہ اُبھارے وہ گھنٹوں گندے گندے قصّے سناتا رہتا اور چہرے پر
بے شمار مسّوں پر اُگے ہوئے بالوں کے گچھوں کو مروڑیاں دیتا رہتا۔

یہ جتنی ڈینگیں مارتا اُتنا ہی کوسمو بھینچتا جاتا۔ ہمیشہ ہاں میں ہاں ملاتا
اور کبھی بھی ایک لفظ مخالفت میں نہ کہتا۔ کوسمو اب خاصا محفوظ و
مامون ہو گیا تھا اور یہ حالت مشکوک بھی نہیں تھی۔ اُس کے شاگرد
اور گلی کوچوں کے بچے اب اُسے نہیں چھیڑتے تھے۔ اس ڈر سے کہ نہ
جانے ڈالفوڈالفی کیا کر ڈالے! لیکن دوسری طرف اُسے خود اپنے
اوپر بالکل اختیار نہیں رہا تھا۔ نہ تو وہ اپنی فرصت کو صرف کرنے کا
مجاز تھا اور نہ اُس حقیر مشاہرے پر اُسے تصرف حاصل تھا جو لوئر سکنڈری
اسکول میں پڑھانے کا اُسے ملتا تھا۔ اگر کوئی ایسی ہی ناگزیر ضرورت
پیش آ گئی تو اُسے شیطانیہ سے چند تانبے کے سکوں کی درخواست کرنی
پڑتی۔ وہ لڑکی ۔ اب پندرہ برس کی تھی ۔ اِس گھر کی ماں کے
فرائض انجام دے رہی تھی۔ وہ کوسمو کو پیسے تو دے دیتی مگر اس
انداز سے جیسے چوری چھپے دے رہی ہو۔ اور تاکید کرتی کہ تم اس کا
جو چاہو کرنا مگر "ابّا" کو معلوم نہ ہو ورنہ وہ بھی مانگیں گے اور پھر
خیریت نہیں۔"

شیطانیہ اچھی لڑکی تھی۔ اتنی اچھی کہ کوسمو اُس کا نام مختصر
کر کے صرف تیہ رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس میں زیادہ دل کشی تھی۔ مگر
ڈالفوڈالفی نے اس تجویز کو سرے سے پسند ہی نہیں کیا۔

"یہ کیا بے لغو! اس کا نام شیطان ہے صرف شیطان! سمجھے؟

زندہ باد شیطان!

زندہ باد بغاوت!

اور عقل کی انتقامی قوّت!

یہی شب و روز تین سال تک جاری رہے۔ پروفیسر کوسمو
سے اکثر پوچھا جاتا کہ تم اس بڑبڑیے ڈالفوڈالفی کے ساتھ آخر
کیسے گزارہ کرتے ہو؟ مگر وہ جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتا۔ کندھے جھٹک
کر اور نیم بنیا آنکھوں کو نیم وا کر کے وہ اپنے ہاتھوں کو اس طرح جنبش
دیتا جیسے راضی بہ رضا ہو اور چہرے پر مسکراہٹ کا جو شائبہ سا پیدا

ہوتا تو اُسے دیکھ کر ترس آنے لگتا۔ یہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس سوال کا مقصد اس حقیقت کو اس پر واضح کرنا ہوتا کہ لوگ اُسے پاگل سمجھتے ہیں۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اور مجبور کیا جاتا تو کوسمو یہ مان لینے کو تیار ہو جاتا کہ ہاں میں پاگل ہوں۔ لیکن اس بات کا اُسے پورا پورا یقین نہیں ہو سکا تھا۔ کیونکہ عرصۂ دراز تک غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ کہ عام زندگی خود مجھ سے زیادہ دیوانی ہے۔ اس لئے حقیقت میں یہ کوئی خوبی نہیں تھی کہ بڑی سوجھ بوجھ پیدا کی جائے یا آدمی تیز دماغ ہی ہو۔ بالخصوص جبکہ زندگی کو یہ ضد ہی ٹھہری کہ انسان کو اپنے چنگل میں بھینچتی رہے۔ ایسی حالت میں تو یہی بہتر ہے کہ زندگی کے رحم و کرم پر اپنے آپ کو ڈال دے اور مزاحمت بالکل نہ کرے۔ کیونکہ یہ تو طے ہی ہے کہ زندگی کی نظر میں کوئی انجام ضرور ہے۔ دکھائی دے یا نہ دکھائی دے، اور کسی نہ کسی طرح ایک نہ ایک دن زندگی انجام پذیر ضرور ہو گی — اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اور واقعی زندگی انجام پذیر ہو گئی — ایکا ایکی — مگر افسوس کہ کوسمو کے لئے نہیں۔ یہ ڈالفوڈالفی تھا جس پر اسکول میں پڑھاتے ہی میں دل کا دورہ پڑ گیا۔

ڈالفوڈالفی کے یکایک مر جانے کا کوسمو کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس کے لئے گھر ایک دم سے خالی ہو گیا — حیرتناک طور پر خالی۔ گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں تھی اور کوئی ذی روح ایسا نہیں تھا جس سے اُسے مخلصانہ وابستگی ہو۔ گھر کی سب چیزیں افسوس کے ساتھ اُس شخص کی واپسی کی منتظر نظر آتی تھیں جو کبھی واپس آنے والا نہیں تھا۔

شیطانیہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ شروع شروع میں کوسمو نے اُسے دلاسا دینے کی کوشش نہیں کی۔ یہ سمجھ کر کہ کسی بات سے اُس کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ پھر ہیڈ ماسٹر اور دوسرے ساتھیوں نے اُس سے دریافت کیا کہ تم نے آئندہ اُس غریب لڑکی کے لئے کیا سوچا ہے۔ جو یکایک یتیم ہو گئی اور وراثتاً اُسے کوئی وظیفہ بھی نہیں مل سکتا۔ اُس کے گزارے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور اُس کے کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھے نہ پاس کے اور نہ دُور کے۔ پروفیسر نے فوراً جواب دیا "میں اسے اپنے پاس رکھونگا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں کہ میں اس کا اچھا باپ ثابت ہونے کی کوشش کروں گا۔" مگر ہیڈ ماسٹر اور اُس کے ساتھیوں نے کندھے جھٹک کر اس تجویز کو ناپسند کر دیا۔ اور کوسمو یہ سوچتا ہوا وہاں سے چلا کہ میں نے کوئی غلط بات کہدی ہے۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر ناپسندیدگی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس تجویز میں غلطی کیا ہے؟ اس نے شیطانیہ سے اپنی تجویز بیان کی اور یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ اُس نے بھی اِسے ناممکن بتایا کہ اُس کے ساتھ وہ ایک ہی گھر میں رہے۔ وہ تو جلدی سے جلدی گھر سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"تم کہاں جاؤ گی؟"

"ارے۔ کہیں بھی۔۔۔"

"مگر تمہارا جانا کیا ضروری ہے؟"

اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

اس کے ساتھی ماسٹروں نے بعد میں اُسے وجہ سمجھائی۔ انہوں نے جتایا کہ تم کچھ اُوپر تیس کے ہو گئے۔ اور شیطانیہ اٹھارہ کی ہو چکی ہے۔ اس لئے تم اتنے بڑے نہیں ہو کہ اُس کے باپ بن سکو۔ اور نہ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ تمہاری بیٹی بن کے رہے۔ ہے نا سیدھی سادھی سی بات؟

پروفیسر کوسمو نے اپنے جوتے کے پنجوں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی اُنگلیوں کے پوروں کو اور گلے میں جو نوالہ سا پھنس رہا تھا۔ اُسے نگلنے کی کوشش کی۔ کیا میرے ساتھیوں کا مقصد یہ ہے کہ مجھے — مجھے شیطانیہ سے شادی کر لینی چاہئے؟ اس تصوّر کے آتے ہی اُس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ نہیں جی وہ یقیناً "مذاق کر رہے ہوں گے مجھے شیطانیہ سے پھر بات چیت کر کے اُسے سمجھانا چاہئے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اسے قائل کرنا چاہا کہ تم جو "کہیں بھی" چلے جانے کا ارادہ کر رہی ہو تو یہ دیوانہ پن ہے۔ نرا دیوانہ پن۔ اس پر شیطانیہ نے بھی اسے سمجھایا کہ میں تمہارے ساتھ صرف ایک شرط پر رہ سکتی ہوں۔ اور وہ — یا اللہ! — وہ یہ کہ میں تمہاری بیوی بن جاؤں۔

کوسمو کو اس اندیشے سے ڈر لگنے لگا۔ کہ کہیں میری عقل تو زائل نہیں ہو رہی؟ یا تو میں فاتر العقل ہو رہا ہوں یا پھر سب کے سب نے مجھ سے پُر اذیت مذاق کرنے کی سازش کر لی ہے۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں کسی طرح نہ آتی تھی کہ اس جوان لڑکی نے سنجیدگی کے

۔ساتھ اس نے کیسے ضروری سمجھ لیا کہ میری بیوی بن جائے؟ گویا ایک ہی گھر میں ساتھ ساتھ رہنے سے سارے دیہات میں ان کی بدنامی پھیل جائے گی! کیا یہ ممکن ہے کہ مجھ سے شادی کرنا اُس کے نزدیک ایک مضحکہ خیز چیز نہیں ہو سکتی۔ میں تو ہر لحاظ سے نفرت انگیز ہوں! وہ اپنے آئینہ کے قریب جا کر اپنی شکل دیکھنے لگا اور حقیقتاً وہ بدشکل تھا۔ اس سے بھی زیادہ اپنے کو بدشکل سمجھنے لگا۔ اُس کا چہرہ بیماروں کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا ۔ بُری صحت اور بدنصیبی کی وجہ سے۔ وہ گنجا تھا اور نیم بینا بھی۔ شیطانیہ آ! کیسی چمکیلی اور تندرست ہے! اور اس خیال سے اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ بھلا مجھ سے شادی کرے گی! کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ وہ شیطانیہ کے پاس پھر گیا اور ہکلا ہکلا کر اُس سے پوچھنے لگا "کیا تم واقعی مجھے قبول کر لوگی؟" اور وہ بیوقوفوں کی طرح دنگ رہ گیا۔ جب اُس نے کہا "ہاں" اور جواب دینے میں نہ تو وہ کچھ جھجکی اور نہ شرمائی بلکہ یہاں تک کہہ گئی کہ "اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو میں ساری عمر تمہارا احسان مانوں گی۔"

کاسمو نے احتجاجاً اپنے ہاتھ اُٹھائے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ اس کی منتیں کر رہا تھا کہ "تم احسان کا ذکر مت کرو۔ کیسی اُلٹی اُلٹی بات تم کہہ رہی ہو! احسان مند تو مجھے ہونا چاہئے" سوچو تو سہی قسمت کس قدر عظیم مسرت سے اُسے دوچار کرنے والی تھی! یہ بات ناقابلِ عمل معلوم ہو رہی تھی.....

کئی دن تک پروفیسر کا شیرازہ بکھرا رہا۔

شادی جلدی ہونی چاہئے کیونکہ بیاہا جانے والا جوڑا ایک ہی گھر میں رہنے پر مجبور تھا۔ ہیڈ ماسٹر کو یہ بھی اُمید تھی کہ شادی ہو جائے تو بیچارا اسسٹنٹ اُس سرمدی وارفتگی سے بھی چھٹکارہ پالے گا۔ جس میں وہ مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اُمید بے سود ثابت ہوئی۔ رسم شادی ۱۴ مارچ ۱۸۹۲ء کو ادا ہوئی اور یہ تقریب نجی طور پر ادا کی گئی۔ کیونکہ کئی سال قبل جو گرجے میں کاسمو نے حلفاً حلفی کی تھی اُس بنا پر گرجے میں شادی کی رسم ادا نہیں کی جا سکتی تھی۔

شادی کے بعد پروفیسر اور بھی زیادہ خوش رہنے لگا۔ اور نتیجے کے طور پر اور بھی زیادہ احمق ہو گیا۔ سالہا سال کی ناخوشی سے جو بات نہ ہو سکی تھی۔ وہ خوشی سے چٹکی بجاتے میں ہو گئی۔ کاسمو نے جو کچھ بھی علم حاصل کیا تھا۔ وہ سب محو ہو گیا۔ یہاں تک لاطینی صرف و نحو بھی اور بالکل بُدھو ہو گیا۔ اسے کچھ نہ سوجھتا تھا سوائے شیطانیہ کے۔ کوئی خواب نہ دیکھتا تھا سوائے شیطانیہ کے۔ اگر شیطانیہ اصرار نہ کرتی تو وہ کھانا کھانے کی بھی زحمت گوارہ نہ کرتا۔ اگر اس کی دلہن کھانے کی میز پر بیٹھی دکھائی دیتی رہتی۔ تو اسے اس منظر سے اس درجہ سیری ہو جاتی کہ اُسے بھوک کی پروا بھی نہ ہوتی اور وہ خوش بھی رہتا۔ وہ تو خوشی خوشی اپنے بے ہنگم جسم کی بوٹی بوٹی اُسے کھلا دیتا۔ بشرطیکہ وہ اپنے خوبصورت دانتوں کے لائق اسے سمجھ لیتی۔

اب چونکہ ڈالفو دانفی تو رہا ہی نہیں تھا کہ اسکول کے لڑکے اور گلی کوچوں کے بچے دبے رہتے اس لئے اسکول کے اندر اور باہر جو ہنگامے برپا ہوئے تو اس زور شور کے ساتھ کہ پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر اپنے اسسٹنٹ پر چیختا چلاتا اور بڑی بُری طرح ڈانٹتا مگر سب بیکار — پروفیسر کاسمو صرف تپاک سے مسکراتا رہتا۔ گویا اس تہدید کا تعلق خود اس سے کچھ نہیں تھا۔ مجبور ہو کر شیطانیہ نے پارلیمنٹ کے ممبر کو۔ جو اس کے باپ کا بڑا عزیز دوست اور سرپرست تھا ایک خط لکھا۔ اس میں درخواست کی کہ اپنا اثر ڈال کر پروفیسر کو فوراً اسکول سے نکال کر کسی اور پُرسکون ملازمت پر مامور کرایا جائے چاہے یہ جگہ کتب خانہ عامہ میں ہو چاہے ہدایت کاری عامہ کی وزارت میں۔ چنانچہ دو مہینے بعد کاسمو روم روانہ ہوا تاکہ حکم نامے کے مطابق وزارت میں اپنی موجودگی کی رپورٹ کرے۔ اس کے شاگرد اس روانگی پر بہت افسردہ ہوئے کیونکہ اور چاہے جو کچھ ہو وہ سب اپنے اُستاد کو پسند کرتے تھے ہیڈ ماسٹر اور اس کے ساتھی اپنا پنڈ چھوٹنے پر خوش تھے شیطانیہ اب دوجیا تھی۔ سمندر کے سفر میں خوب بیمار پڑی۔ لیکن بندرگاہ پر اُترتے ہی وہ اپنی بیماری بھول گئی۔ اطالوی سلطنت کا قُرب حاصل ہوتے ہی اُس پر ایسا عمدہ اثر پڑا کہ ساری دُکھ بیماری جاتی رہی۔ اُسے یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ مہمات سر کرنے والے باپ کا خون اُس کی رگوں میں کس زور شور سے گردش کر رہا ہے۔

ہدایت کاریٔ عامہ کی وزارت میں محکمۂ نقول سے پروفیسر کو وابستہ کیا گیا۔ دفتر کی نگرانی اس کو سونپی گئی۔ لیکن اس کی نگرانی قطعی بیکار ثابت ہوئی۔ کم تنخواہ کے کلرکوں نے دو ایک ہی دن میں بھانپ لیا کہ کس قسم کے آدمی سے اُنہیں سابقہ پڑا ہے۔ اگر ان کا نگران کوئی مشہور مُعمر گھاگ ہوتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی۔ خوب جُھک جُھک کے سلام کئے جاتے اور کام بھی تیزی سے ہوتا۔ مگر اس طرح کے ایک سیدھے سادھے شریف آدمی کی تعظیم سے حاصل؟ یہ نہیں کہ وہ اُسے ستاتے ہوں۔ پس جب ذرا کام کم ہوتا تو بے ضرر مذاق کرتے۔ اور اگر نقل نویسی میں کوئی غلطی ہو جائے تو ظاہر ہے کہ سارا الزام پروفیسر کو تمو پہ آتا۔

"کیوں صاحب، کیا آپ مہربانی فرما کر اپنی نقلیں ذرا مجھے دکھائینگے؟ سُنئے! از راہِ کرم توجہ سے سُنیئے! جب آپ "وجہ" لکھیں تو چھوٹی "ہ" سے لکھیں۔ آپ کی عنایت ہوگی"۔

"پروفیسر صاحب! بڑی میں بہرحال چھوٹی سے زیادہ فائدہ رہتا ہے۔ اس لئے بہتر تو بڑی ہی رہے گی۔ یوں بھی یہ معاملہ "وجہ" کا ہے"۔

"اچھا جی" کہکر پروفیسر اپنی گردن لمبی کرتا اور اپنے کندھے چڑھا لیتا۔ نیم بند آنکھیں آدھی آدھی بند ہو جاتیں۔ جو پہلے ہی موٹے موٹے شیشوں کی عینک میں نظر نہ آتیں۔ شیشے سے شیشے تھے! بوتل کی تلی جتنے موٹے!

جب پروفیسر کے مُنہ سے آہ سرد کے ساتھ کلرک "جی اچھا" سنتے تو کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ پروفیسر کبھی معلوم نہ کر سکا کہ وہ آخر کیوں اس طرح ہنستے ہیں؟ جب کوئی کام پروفیسر سے بگڑتا تو اس کی عادت تھی کہ یہی دو لفظ روتے ہوئے کہتا "اچھا جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور اب سارے کلرکوں نے مل کر اس کا نام "پروفیسر اچھا جی" رکھ دیا تھا۔ اور اُس کا تذکرہ اسی نام سے کرتے۔ جب پروفیسر نے اپنا نیا نام سُنا تو مسکرایا، اپنی گردن لمبی کی، کندھے چڑھائے اور روتے لہجے میں کہا "اچھا جی" یہ اس کی عادت ہو گئی تھی اور اس تکیۂ کلام کا اُسے کبھی احساس نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدتوں تک بدنصیبی کی ٹھوکروں پر قانع رہنے کا یہ نتیجہ تھا۔ مگر اب آخر کار اُسے اپنی سب تکلیفوں کا بدلہ مل گیا تھا۔ اُن تمام تکلیفوں کا جو اُس نے جھیلیں اور اُن کا بھی جو اُسے آئندہ ہوگی تھیں۔ اس لئے پروفیسر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چاہے ساری دُنیا کے کلرک اس کی ہنسی اُڑائیں اور چاہے سب کے سب اُسے کچھ ہی کہیں۔ اُسے کیا؟ اُس کے پاس اس کی شیطانیہ تھی اور بس۔ طعنے تشنوں کی پھر بھلا وہ کیا پروا کرتا؟ جب وہ وزارت کے دفتر میں ہوتا تو اُس کا دھیان شیطانیہ ہی میں پڑا رہتا۔ وہ ہمیشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی چاہے کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے غریبانہ فلیٹ کے کسی کمرے میں کام کرتی ہوتی اور پروفیسر اپنے دفتر میں ہوتے ہوئے بھی اپنے تصور میں اس طرح دیکھتا رہتا جیسے آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

۱۵ اگست ۱۸۹۳ء کو شیطانیہ ساتھ خیر کے ہاتھ پیر سے فارغ ہوئی اور لڑکے کا نام ڈانفینور رکھا گیا۔ باپ مارے خوشی کے دیوانہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایک بات البتہ اُسے پریشان کر رہی تھی شیطانیہ میں اتنی قوت نہیں تھی کہ بچے کو دُودھ پلا سکے۔ اس لئے بچے کو پہاڑی علاقے کے ایک دُور کے گاؤں میں انّا کے پاس چھوڑنا پڑا۔ پروفیسر نے محسوس کیا کہ اس انتظام کو گوارہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شکار، کافی کی پیالی اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی خوش عیشیاں چھوڑنی پڑیں گی۔ اس طرح انّا کا خرچ نکل سکے گا۔

آپ نے دیکھا ہوگا نٹ تماشہ کر رہے ہیں اور ایک مجمع حیرت سے سانس روکے اُنہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک بڈھا نٹ کہتا ہے۔ "مَیں نہ مانوں، مَیں نہ مانوں" تو ایک جھمورا انہی میں سے نکل کر آگے آتا ہے۔ اور بازی گر کہتا ہے "لو۔ اب ہمارا سب سے اچھا تماشا ہوتا ہے"۔ اور جھمورا مضحکہ خیز پلٹیاں کھانے لگتا ہے۔ اور سب اس کی احمقانہ حرکتوں پر ہنستے ہیں۔ بس بالکل اسی طرح قسمت کا گھاگ نٹ جھمولے کو تمو کو پیدا ہونے کے دن سے برابر پلٹیوں پر پلٹیاں کھلائے جا رہا تھا۔ مگر سب سے اچھا تماشہ ابھی ہونا باقی تھا۔ یہ تماشہ ۳۰ مئی ۱۸۹۴ء کو ہونے والا تھا۔

اُس دن پروفیسر کو تمو روزانہ کی طرح ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام کو اپنے گھر واپس آیا۔ راستہ میں سے کچھ مٹھائی خریدی۔ کیونکہ مٹھائی شیطانیہ کو بہت پسند تھی۔ لمبے لمبے زینے طے کر کے اُوپر

پہنچا جیبیں ٹٹول کر کنجی نکالی۔ اور ٹٹول ٹٹول کر قفل کھولا۔ کمرے کے اندر گیا۔ شیطانیہ گھر پر موجود نہیں تھی۔ بھلا کہاں چلی گئی ہو گی اس وقت؟ یہ وقت تو اس کے کہیں جانے کا ہے نہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی ہی بات ہو گئی ہو گی۔ جواب تک وہ نہیں لوٹی۔ میز پر دسترخوان بھی نہیں لگایا اور نہ کھانا پکنے ہی کے کچھ آثار ہیں۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا اور برتن ویسے کے ویسے ہی دُھلے دھلائے رکھے ہوئے تھے۔ صُبح جو ملازمہ آیا کرتی تھی وہ برتن بھانڈا بھی صاف کر جاتی تھی اور جھاڑو بہارو بھی۔ چنانچہ گھر صاف ستھرا پڑا تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہو شیطانیہ کو؟ شاید ڈالفینو کی انّا نے کسی ضروری کام سے بلوایا ہو؟ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا کہ مجھے دفتر میں اطلاع بھجوائے بغیر وہ وہاں چلی جاتی۔ سارے زینے پھر اُتر کر وہ چوکیدار کے پاس گیا۔ اُس سے دریافت کیا۔ برابر میں جو چھوٹی سی دکان تھی اُس پر پوچھا اور پڑوسی کے ملازم سے معلوم کرنا چاہا۔ مگر کوئی بھی اُسے کچھ نہ بتا سکا۔ اُوپر اُس کے تینوں کمرے اور اُن کا سارا فرنیچر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب صبر سے منتظر ہیں کہ پُرسکون زندگی کا دَور دیکھئے پھر کب شروع ہوتا ہے؟ ان کی سلیقہ وار ترتیب اور اپنی ذہنی بے ترتیبی میں اس قدر تضاد اُس کے لئے اس درجہ اجیرن ہو گیا۔ کہ وہ وہاں نہ ٹھہر سکا۔ اور کوئی ٹھکانہ معلوم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اس نے تار گھر جا کر ایک اشد ضروری جوابی تار ڈالفینو کی انّا کو دیا۔ اس کے بعد پھر اِدھر اُدھر بے ارادہ جدھر منہ اُٹھ گیا گھومتا پھرا۔ اُس کا سر پنکھے کی طرح چکر کھا رہا تھا۔ اور اُسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ رات خاصی ہو گئی ہے جب اس نے اندازہ کر لیا کہ اب تار کا جواب آ گیا ہو گا تو یہ اُمید کر کے گھر پہنچا کہ شیطانیہ بھی آ گئی ہو گی۔ لیکن چوکیدار نے اُسے دیکھتے ہی جو اطلاع دی اُس سے ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور پروفیسر کو ایک دم سے معلوم ہوا کہ وہ تھک کر چور ہو گیا ہے۔ اور اب اُس سے یہ لمبے لمبے زینے کیسے طے ہوں گے؟ کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا وہ اُوپر پہنچ ہی گیا اور اندھیرے میں ٹٹولتا گھر میں داخل ہو گیا اور اندھیرے ہی میں ایک کُرسی پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد ایک عجیب طرح کی بھنبھناہٹ نے اُسے ستانا شروع کیا۔ یہ سارے جسم میں ہو رہی تھی سر میں، پیٹ میں، گھٹنوں اور تلوؤں تک میں۔ اس کی تیز گردش نے اُسے بولا دیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس بھنبھناہٹ نے خیالات اور احساسات تک کو غارت کر دیا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر کھڑکی کے قریب گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ شائد تار کا جواب لئے کوئی لڑکا گھر کے بڑے دروازے کے آگے نیچے نہ کھڑا ہو۔ کھڑکی میں سے جھانکنے پر اُسے معلوم ہوا کہ یہ ملعون بھنبھناہٹ — خدا اسے غارت کرے — نیچے گلی میں سے آ رہی تھی اور بجلی کی روشنی کی کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور اس کے ساتھ ہی انّا کے ہاں سے تار کا جواب بھی آیا — انکاری۔ اُمید کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی۔

چند گھنٹے کے بعد ملازمہ گھر کی صفائی ستھرائی اور سودا سلف لانے کے لئے آ گئی۔ یہ ٹسکنی کی عورت تھی اور اس کا پکّا پکا سا ناک نقشہ تھا۔ یہ بڑی تیز دماغ اور زبان زور تھی۔

گھر کے مالک کو اس نے دیکھا کہ اُٹھا بیٹھا ہے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئیں جیسے دماغ ماؤف ہو گیا ہو۔ بولی:-

"ابھی سے اُٹھ گئے؟"

"وہ نہیں ہیں۔ کل سے — یہاں نہیں ہیں۔"

"نہیں" آپ بہکا رہے ہیں۔ بڑی بھیانک خبر سنائی آپ نے!"

پروفیسر کوسمو نے بیچارگی سے ہاتھ پھیلائے اور پھر آہستہ آہستہ کُرسی میں جم گیا۔ چہرے پر پھر وہی مسلوب الحواسوں کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

بمشکل بولا "ساری رات"

عورت نے پوچھا "کہاں گئی ہوں گی بھلا؟"

اس نے ہاتھوں کی جنبش سے پھر اپنی بے چارگی کا اظہار کیا۔ عورت نے کہا "ذرا آپ تلاش تو کیجئے۔ ذرا وہاں بھی جا کر

دیکھ لیجئے ۔ نیچے جہاں وہ ...... وہ پردیسی رہتے ہیں —
وہی جو رنگتے ہیں ۔ مجھے معلوم ہے ۔ اُن میں سے ایک انکی .....
ان کی تصویر بنا رہا تھا ۔"

پروفیسر چونکا اور عورت کو گھورنے لگا ۔

"میری بیوی ؟ اس کی تصویر ؟ کب ۔

"میں سمجھی آپ کو معلوم ہوگا ۔ بیگم وہاں روز صبح کو جایا کرتی تھیں ۔ اور پھر دوپہر کو کھانے کے بعد ۔"

وہ بیٹھا رہا ، بالکل ساکت ، مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا ۔ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں سے ٹانگیں سہلانے لگا ۔

"آقا آپ کہیں تو میں جاکر معلوم کروں ؟ دو قدم پر تو ہے ہی ...... میں اُسے جانتی ہوں ...... اُس فرانسیسی مصور کو ۔"

عورت نے جو کچھ کہا غالباً اُس نے نہیں سُنا ۔ اس لئے وہ جلدی جلدی وہاں سے چل دی اور چند منٹ میں ہانپتی اور تمتماتی ہوئی واپس آگئی ۔ جب اُس کا سانس ذرا قابو میں آیا تو بولی "دیکھا ! میں تو پہلے ہی سمجھ رہی تھی ۔ وہ بھی غائب ہے ...... کل سے .....
معاملہ ایک سا ہی ہے ..... ہے نا عجیب سی بات ؟"

پروفیسر گم سم خاموش بیٹھا رہا ۔ اس کا چہرہ ساکن تھا اور وہ پاگلوں کی طرح گھبرایا ہوا تھا ۔ مشین کی طرح بس اپنے پاؤں سہلائے جا رہا تھا ۔ عورت کچھ دیر تک اُس کی طرف ترس بھری نظروں سے دیکھتی رہی ۔ پھر آپ ہی آپ گھروالی پر بڑبڑانے لگی ۔

"احمق کہیں کی ۔ بہتے جاتی اپنے میاں کے ساتھ ۔ بچارا ایسا اچھا سلوک کرتا تھا ۔ اس کے ساتھ بولنا تک نہ جانتا تھا ۔ جیسے مُنہ میں زبان ہی نہ ہو ..... چلو آؤ تم فکر کیوں کرتے ہو ؟ اس کا رنج نہ کرو ۔ یوں مت بیٹھے رہو ۔ اپنا خیال بٹاؤ ۔ وہ ایک نہایت کم عقل عورت تھی تم کیوں پریشان ہوتے ہو ؟ رہی محبت ! میں بتاؤں کیا ہوتی ہے محبت ؟ ایسی ہی ہوتی ہے جیسے آگ پر دودھ رکھ دو پہلے اس میں جوش آتا ہے ۔ اور پھر وہ اُبل کر برتن سے باہر آجاتا ہے ...... چلو اٹھو ہمت سے کام لو ۔ اپنے دل کا بوجھ کم کرنے کی تدبیر کرو ۔ آقا اس طرح یہاں بیٹھے مت رہو ۔"

لیکن پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ ان سیدھی سادھی دوستانہ تسلیوں پر بچارے نے ذرا سا سر ہلا دیا ۔ اُس نے آنسو نہیں بہائے ۔ اُسے اس سے بالکل دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے غم کا اظہار دوسروں پر کرے ۔ وہ ضبط کئے رہا اور اسے اُس نے گوارا نہیں کیا ۔ دوسرے اسے دلاسا یا تسلی دیں ۔ اس کے دل کی گہرائی میں استعجاب تھا کہ وہ شدید تکلیف اُسے کیوں نہیں پہنچ رہی جس کا اُسے اندیشہ تھا کہ اگر کبھی نامعلوم مصیبت کی وجہ سے شیطانیہ اُس سے چھن گئی یا اُس کی محبت ہی سے محروم ہو گیا ۔ تو اس صدمے کی تاب کیسے لا سکے گا ؟ یہ خیال جو کبھی کبھی اُس کے تصور میں آکر اس کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا ۔ اب حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا ۔ مگر اُسے کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا ۔ قطعاً کچھ نہیں ۔ اُسے کچھ ایسا گمان تھا کہ اگر یہ سانحہ کبھی ہوا تو آس پاس کی دُنیا ڈھے جائے گی ۔ ورنہ میں تو اس صدمہ ہی سے مرجاؤں گا ۔ اور ہوا کچھ بھی نہیں —— بالکل کچھ نہیں ۔ اس نے ملازمہ کی تنخواہ ادا کر کے اُسے جواب دے دیا اور جب اس نے جاتے ہوئے ہمت دلانے کے لئے دو چار باتیں اور کہیں ۔ اور اُس نے حسب دستور جواب دیا :۔

"اچھا جی"

جب وہ اکیلا رہ گیا اور پھر بیٹھ گیا تو یکایک اُسے معلوم ہوا کہ مجھ میں اتنی قوتِ ارادی ہی باقی نہیں رہی کہ اپنی کسی انگلی کو بھی جنبش دے سکوں ۔ اچھا ، تو واقعی دُنیا ڈھے گئی تھی — مگر صرف میری ذات کی دُنیا ۔ مگر یہ سب کچھ اتنے چپکے سے ہو گیا ۔ کہ مجھے معلوم بھی نہ ہوا ! کرسیاں جوں کی توں موجود تھیں کپڑوں کی الماری بھی کھڑی تھی ۔ پلنگ بھی موجود تھا ...... مگر آئندہ یہ کسی کے کیا کام آئے گا ؟

وہ اپنی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتا رہا اور غیر شعوری طور پر قدرے زور سے بھی کیونکہ اُسے محسوس ہو چلا تھا کہ ایک سردی سی اُس پر چھائی جا رہی ہے — ایسی عجیب سردی جو ہڈیوں میں سے نکل رہی تھی ۔ وہ اپنی کرسی سے نہیں ہلا ۔ بلکہ وہیں بیٹھا ملازمہ

کی اطلاع کے منتشر الفاظ بڑبڑاتا رہا "اس کی تصویر — ایک فرانسیسی مصوّر — روز صبح کو وہ اس کے ہاں جایا کرتی تھی . . ." تپ سے اُس کے دانت بجنے لگے۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ بلا ارادہ اپنی ٹانگیں زور زور سے دباتا رہا۔ حالانکہ ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ تین باتیں اُس کے ذہن پر جم گئی تھیں — تصویر، فرانسیسی آرٹسٹ اور یہ حقیقت کہ وہ روز صبح کو اس کے ہاں جایا کرتی تھی۔ یہ باتیں تین پنکھوں کی طرح گھومے جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ انہیں دیکھتے دیکھتے چکرا گیا۔ ایک زور کے لرزے کے ساتھ وہ غش کھا کر کرسی ہی سے گر پڑا۔ اور فرش پر پڑا کا پڑا رہ گیا۔

—— × ——

مارچ ۱۹۴۷ء میں نو سال اور دو مہینے گزر چکے تھے۔ پروفیسر کو ٹھیک ٹھیک یاد بھی نہیں تھا کہ قسمت کے بلندی کرتے اپنے نٹ کا جواکبھی شکل تماشہ دکھایا تھا اُس کے بعد وہ کس طرح ہسپتال میں پڑا موت کی راہ تکتا رہا۔ دُور پہاڑی علاقے کے ایک دیہات میں جو اس کا ایک ننھا سا بچہ تھا اُسی کے خیال نے پروفیسر کی جان بچالی تھی۔ اب اس کا ڈالفینو اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ بچارا بچہ اب کچھ اوپر دس سال کا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ بڑی مشکل سے اُسے زندہ رکھا گیا تھا۔ باپ کی مسلسل شفقت بھری خدمت ہی کا یہ نتیجہ تھا۔ وہ بہت دُبلا اور نازک تھا۔ اور اسی بیماری کے لاحق ہونے کے خطرے میں تھا جس کا اندیشہ گرجے کے مکتب میں اُس کے باپ کو بھی بچپن میں تھا۔

آٹھ برس کی عمر تک ڈالفینو کو یقین تھا کہ اس کی پیدائش کے دن ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر دو سال اُدھر ایک دن اس کے باپ تو دفتر گئے ہوئے تھے، ایک عورت عجیب طرح کے کپڑے پہنے اور خوب رنگ اور غازہ ملے گھر میں آئی اور رو رو کر اُسے سمجھانے لگی "یہ بالکل غلط ہے کہ تمہاری ماں مر گئی۔ میں یہاں موجود ہوں — تمہاری ماں — دیکھ لو زندہ ہوں" ہاں بے شک وہ اس کی ماں ہی تھی اور اُس سے بڑی خوفناک محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ ہمیشہ ہمیشہ اُسی کے ساتھ رہے۔ اس کی دیکھ بھال کرے، دن رات، اور اُسے پیار کرتی رہی جیسے اب کر رہی تھی۔ اپنے چاند کو، اپنے دُلارے کو۔

اس وقت لڑکے کی اَنّا بھی گھر میں آ گئی۔ وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور اپنے پالے ہوئے بچے کی تلاش میں روم آئی تھی۔ اب وہ پروفیسر کے ہاں ملازم ہو گئی تھی۔ صبح جب وہ باہر سے سودا سلف لے کر گھر واپس آئی تو اس نے لڑکے کو اُس بیہودہ عورت کی گود میں دیکھا۔ اُس نے دوڑ کر لڑکے کو اُس سے زبردستی چھین لیا۔ ڈالفینو غریب سہما ہوا اُن گالیوں اور کوسنوں کو سُن رہا تھا جو انّا اُس عورت کو دے رہی تھی — عورت جو کہہ رہی تھی کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ پھر دونوں عورتوں میں مارپیٹ ہوئی اور ایک قیامت برپا ہو گئی جس کے بعد بچے کو بڑا تیز بخار چڑھا اور پلنگ پر پڑا کا پڑا رہ گیا۔

پروفیسر کو سمو نے تھانے میں جا کر شکایت درج کرائی کہ اس نفرت انگیز عورت نے میری زندگی غارت کی۔ مگر اس پر بھی اُسے صبر نہ آیا۔ اب بچارے بچے کے پیچھے پڑی ہے۔ کہ اُسے بھی برباد کر دے۔

شیطانیہ بہت پہلے چاہتی تھی کہ دُنیا میں "کہیں بھی" گھومتی پھرے اب تک وہ خوب گھوم چکی تھی۔ اُس فرانسیسی مصوّر کے ساتھ جو اس کی تصویر بنا رہا تھا۔ وہ بھاگ کر چار سال تک پیرس، ناٹیس اور پھر تورن اور میلان میں پھرتی پھری اور اس کی اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اُسے روم پہنچے چند ہی روز ہوئے تھے کہ اُس کے شوہر نے اسے دیکھ لیا۔ اکثر اپنے تصوّر میں پروفیسر نے اُسے بد سے بدتر حالت میں دیکھا تھا۔ مگر جب اُس نے اب اُسے واقعی دیکھا تو اُس کی حالت دیکھ کر اُسے ایسا صدمہ ہوا کہ وہ بازار ہی میں ڈھیر ہو گیا اور راہگیروں نے اُسے اٹھا کر ایک دوا فروش کی دکان میں پہنچایا۔

پروفیسر ایک سادہ دینی پادری کے ہتھے چڑھ گیا تھا جسے وہ سمساری سے جانتا تھا۔ اس پادری نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ کئی سال پہلے کی بھٹکی ہوئی بھیڑ کو گرجے کے گلے میں ضرور لاؤں گا۔ وہ پروفیسر کو مذہبی کتاب پر کتاب دیئے جاتا تھا کہ دفتر کے خالی وقت میں پڑھتا رہے۔ پادری نے پروفیسر پر ثابت کر دیا تھا اور منوا لیا تھا کہ جتنی مصیبتیں بھی پروفیسر پر آئی ہیں وہ سب اس وجہ سے کہ جوانی میں اپنی ماں مقدس گرجے سے اس نے نہایت نالائقی کے ساتھ انحراف کیا تھا۔ اور اس میں بھی ایک گہری مصلحت ضرور تھی۔ کہ اپنے فرشتوں اور ولیوں میں شامل کرنے

کے لئے اللہ نے نیک ڈالفینو کو منتخب کر لیا تھا حقیقت میں یہ ایک مقدس آگاہی تھی کہ مردود پروفیسر کو بسمو جب دُنیا میں اکیلا رہ جائے۔ تو کسی راہب خانہ میں داخل ہو جائے۔ مثلاً ایک راہب خانہ تری فونتین میں ترا لیست کا تھا۔ یہ ایک رحمت باری کا مسکن تھا۔ یہ ٹھیک وہی مقام تھا۔ جہاں کفارہ ادا کیا جا سکتا تھا۔

یہ دلاسے سُن کر پروفیسر کو بسمو اپنی گردن لمبی کرتا اور کندھے چڑھاتا اور نیم وا آنکھوں سے دیکھ کر چپکے سے کہتا۔

"اچھا جی"

بعض دن جب وہ اپنے دفتر سے اُٹھتا تو سانتا ماریا کی سیڑھیوں پر ایک طرف اُسے پادری منتظر کھڑا دکھائی دیتا۔ اور دوسری طرف پین تھیون کی سیڑھیوں کا سہارا لئے اس کی بیوی کھڑی ہوتی۔ پادری اور بیوی دُور ہی سے ایک دوسرے کو بُری بُری نظروں سے دیکھتے۔ پادری اپنی ٹھوڑی اور گالوں کو سہلاتا رہتا۔۔۔ وہ چاہے جتنی دفعہ ڈاڑھی مونڈتا ان پر کھونٹیاں ہمیشہ نکل آتیں عورت کے رنگے ہوئے لبوں پر ایک عیارانہ مُسکراہٹ ہوتی۔

شام کو پروفیسر جب برآمد ہوتا تو وہ کنکھیوں سے ہمیشہ گرجے کی طرف دیکھ لیتا کہ بیوی تو نہیں کھڑی ہوئی۔ وہ سیدھا پادری کی طرف چلتا گو جانتا تھا کہ جب تک اس کے پاس پہنچے گا۔ اس کی بیوی اُسے پکڑ لے گی اور خرچ کے لئے کچھ مانگے گی۔ اس درخواست کو وہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرح ٹالے۔ لیکن جب کبھی وہ اپنے قصور کی اُس سے معافی مانگتی تو پروفیسر بڑی حقارت سے اُسے دھکا دیتا پادری سے ملنے پر اُسے یہ فکر ہوتا تھا کہ دیکھئے وہ کس کس طرح سے بُرا بھلا کہتا ہے۔ اپنے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے اور راضی برضا ہونے کے انداز سے وہ کہتا:۔

"اچھا جی ۔۔۔۔۔ اچھا جی؟"

اب موسمِ بہار قریب آ چکا تھا۔ دق کے مریضوں کے لئے سب سے خطرناک موسم۔ ڈاکٹر نے پروفیسر کو مشورہ دیا تھا کہ ڈالفینو کو ساحلی علاقے میں لے جاؤ۔ کم سے کم موسمِ بہار کے پہلے مہینے تک، کیونکہ روم کا موسم مریض کے لئے اس مہینے میں بہت سخت ہوتا ہے۔

اس لئے پروفیسر کو بسمو نے ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست دی۔ اور ۵ مارچ ۱۹۰۴ء کو تو نور روانہ ہو گیا۔ تاکہ سمندر کے رُخ ایک چھوٹا سا فلیٹ مع ضروری سامان کے کرایہ پر لے لے۔

—— (۲) ——

آرام کے لئے ایک مہینے کی چھٹی کا ٹھیک وقت آ پہنچا۔ کل تک مینہ برستا رہا تھا۔ لیکن اب مارچ کا سورج خوب چمک رہا تھا۔ اور ہوا کا دھیما پن بتا رہا تھا۔ کہ بہار کے آ جانے میں اب کوئی شبہ نہیں رہا۔

اور واقعی پروفیسر کی گاڑی اسٹیشن سے نکلی جب اس نے کھڑکی میں سے روم کے مضافات کو دیکھا۔ تو گزرتے ہوئے سبزہ زاروں کی ہلکی سبزی میں اُسے بہا ہلکے گلابی رنگ میں کپکپاتی دکھائی دی۔ یہ کیا چیز ہو سکتی تھی؟ شاید خوبانی کے درختوں کا دھندلا پھولوں میں لدا رہا ہو۔ ہاں، ہاں، لو یہ ایک اور آ گیا۔ ہاں، یہی بات تھی۔۔ پھر ایک اور آ گیا۔ آخر موسم بہار آ ہی پہنچا تھا۔ یوں بہار کو دیکھے۔ ٹھیک بہار کی پیدائش کے وقت کہ خوبانی کے درخت سُرخ اور خوش دکھائی دے رہے ہوں۔ پروفیسر کو سالہا سال ہو گئے تھے۔

اُس نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیا۔ اور ستھری شیریں ہوا میں سانس لینے سے اُسے ایک نیا لُطف آیا۔۔ اتنا کہ اُسے نشہ سا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے محسوس کیا جابر قسمت نے اپنی سخت گیری میں کچھ کمی کر دی ہے کہ اس دلکش منظر سے لُطف اندوز ہو سکے۔ اُس کی رُوح سرشار ہو رہی تھی۔ کسی نامعلوم طریقے پر وہ حال سے بہت دُور چلا گیا۔ ماضی میں دُور بچپن کے تفکرات سے آزاد زمانے میں، اپنے دیہات کی بھولی بسری نازک فضاؤں میں۔ اس لمحے میں وہ اپنی ساری مصیبتوں کو بھول گیا۔ دونوں پہلی اور اب کی ۔۔۔ اُس کا بچہ خطرناک علالت میں مبتلا تھا۔ وہ بدبخت عورت جس نے اس کے نام کو بٹہ لگایا تھا۔ وہ پادری جو اُسے چین لینے نہ دیتا تھا۔ یہ بات کہ اپنی قلیل آمدنی سے کہیں زیادہ اُسے خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس اُمید پر کہ شائد بیچارا ڈالفینو اچھا ہو جائیگا۔ اُمید بھی وہ جو شائد فریب ہی ثابت ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی تاریک و تلخ زندگی کو بھول گیا۔ زندگی کے ناقابلِ برداشت بوجھ کو جس کے اندر تاریکی ہی تاریکی ہو گی۔ لیکن باہر تو کاہستان کی سبزی تھی۔ آسمان

کی نیلاہٹ تھی۔ اور ہوا کی وہ ملائم تازگی تھی جو بہار کا گرم سانس تھا مسرت میں کھویا ہوا وہ منظر کو تکتا رہا۔

ہاں، زندگی حقیقتاً حسین ہو سکتی ہے لیکن صرف وہاں باہر کھلے دیہاتوں میں جو اس تمام سبز شادابی سے گھرے ہوئے ہوں۔ وہاں واقعی بے رحم قسمت اس طرح اس پر ظلم نہیں توڑ سکتی تھی جس طرح تنگ تنگ گلیوں والے شہر میں مقید ہونے کے بعد اس ستم رانی کی اس نے ایک محسوس شکل بنالی تھی اور سمجھتا تھا کہ وہ اسے اپنا پیچھا کرتے ہوئے اسے دیکھ سکتا ہے — ایک بھیانک سایہ جیسی چیز جس کی موجودگی سے اسے اس طرح جھک کر چلنا پڑتا تھا۔ جیسے خوف کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو یہ شکل جو اس کے دم کے ساتھ سایہ کی طرح لگی رہتی۔ اس کی بیوی تھی۔

اس نے جلدی سے اپنی بیوی کی تصویر کو اپنے سے دور کیا تاکہ اس حسین منظر میں حائل نہ ہو۔ اب دیہات اسے پھر دکھائی دے رہے تھے دیکھو! وہ نمبے البان پہاڑ۔ وہ آسمان میں گھسے جا رہے تھے پہاڑ اتنے ہلکے معلوم ہو رہے تھے کہ مشکل سے یقین آتا تھا کہ یہ ٹھوس پتھر کے ہیں۔ وہ ہانٹی غار ہے جس پر درخت ہی درخت چھائے ہوئے ہیں۔ اور اس سے آدھے راستے اوپر زرد درختوں کے جنگل میں راہب خانہ ہے۔ اور وہاں اس کے پیچھے فراس کاٹی ہے — دھوپ میں نہائی فراس کاٹی۔ ریل کے شور سے گھبرا کر چڑیوں کی ایک ٹکڑی اڑی اور ان کے اوپر ایک لوا اپنے چمکدار پروں پر ہوا میں معلق دکھائی دے رہا تھا۔ لوے کو دیکھ کر پروفیسر کو لاطینی گرامر کا پہلا فقرہ یاد آیا — کتنے سال ہو گئے اسے پڑھے ہوئے! اس نے اپنا سر ہلایا۔ ہاں، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اسکول ماسٹری کے ابتدائی سال بھی اچھے ہی تھے، مگر بس اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہنے سے پہلے پہلے ہی۔

اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "اچھا جی"۔ اور پھر اس کا مزاج مکدر ہونے لگا۔

اس کی طبیعت کا اضمحلال دیر تک باقی نہیں رہا، کیونکہ کیرا کسٹیو اسٹیشن سے گزرتے ہی اسے محسوس ہونے لگا۔ کہ سمندر قریب آ گیا ہے۔ اور اس کی روح میں اس خیال کے ساتھ ہی سرخوشی پیدا ہونے لگی۔ وہ بڑے شوق سے انتظار کرنے لگا۔ سمندر کی ناپیدا کنار پہنائی کسی لمحے بھی اس کی نظر کے سامنے آ جائے گی۔ آہ! سمندر، پیارا سمندر — کتنے برس گزر گئے تھے اسے دیکھے! کیسی تیز، کیسی شدید تھی۔ سمندر کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش! لو وہ رہا۔ وہ رہا! پروفیسر اس قدر بے قابو ہوا کہ کھڑے ہو کر اس نے کھڑکی میں سے اپنا سر باہر نکال دیا۔ نمکین ہوا میں اس نے بے تابی اور مسرت سے اس نے سانس لئے کہ جلدی ہی اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ اپنی جگہ پر پھر بیٹھ گیا۔ اور اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

اینزیو پر گاڑی چند منٹ ٹھہری۔ یہ چھوٹا سا خوشنما شہر تھا جہاں پروفیسر کبھی نہیں گیا تھا۔ سٹیشن سے جو کچھ دکھائی دیتا تھا اسے دیکھنے میں پروفیسر نے اپنا وقت صرف کیا۔ تھوڑی دیر بعد نیٹونو آ گیا۔ اور وہ اتر پڑا۔ اس کی طبیعت اب بھی قابو میں نہیں آئی تھی۔ سمندر کو دیکھتے ہی اس نے جو گہرے گہرے سانس لئے تھے ان سے دماغ چکرا گیا تھا — سالہا سال سے اس نے اتنے گہرے سانس نہیں لئے تھے۔

دفتر کے نقل نویسوں نے اس شہر کے بارے میں اسے چند باتیں بتائی تھیں۔

ریل سے اتر کر وہ بڑے چوک میں پہنچا اور دریافت کرنے لگا کہ ایک ایسا فلیٹ کہاں مل سکتا ہے۔ جو بہت مہنگا نہ ہو اور سمندر کے رخ بھی ہو یہ رہائش گاہیں واقعی اس کی حیثیت سے زیادہ تھیں۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان میں سے ایک کا خرچ تو برداشت کرنا ہی تھا۔ گھر کا رخ چوک کی طرف تھا اور سامنے بندوقچیوں کی بارکیں تھیں۔ ان میں فوجیوں کے دستے باری باری سے آتے اور نشانہ بازی کی مشق کر کے چلے جاتے۔ اس کے سامنے کی کھڑکی بہت نیچے تھی۔ اور پچھلے کمرے کی کھڑکی جو سمندر کے رخ تھی اتنی اونچی تھی جتنی کہ دوسری منزل کی ہوتی ہے۔ باہر دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ سمندر کمرے کے اندر اب آیا کہ اب آیا۔ سوائے سمندر کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پروفیسر نے دکاندار کے پاس روپیہ جمع کرا دیا اور کہا "کل میں آ کر اس کا قبضہ لے لوں گا"۔ وہاں سے رخصت ہو کر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔

گھر کے مغربی رخ ایک پرانی گڑھی تھی۔ یہ سولہویں صدی کی ایک پر عظمت عمارت تھی۔ زمانے نے اس کی دیواروں کا رنگ سیاہ

کردیا تھا اور یہ دیواریں پانی کے کنارے تک پہنچی ہوئی تھیں۔ گڑھی کے نیچے جہاں پانی ٹکراتا اور اُچھلتا تھا۔ پروفیسر اُس حصّے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور ایک گھنٹے تک سرمدی نشاط کا لطف اٹھاتا رہا۔ مودر سانٹی کرسیتو کی خاکنائے تھی۔ جو خواب کے جزیرے کی طرح نیلے سمندر میں سے اُبھری ہوئی تھی اور اس قدر نازک کہ معلوم ہوتا ذرا سی ٹھیس میں آبگینے کی طرح ٹوٹ جائے گی۔ اس کے پیچھے ساحل پر اسٹورا کی گڑھی تھی۔ اس کے برابر میں سیدھے ہاتھ کو آنزیو کی بندرگاہ تھی جس میں جہاز بھرے پڑے تھے کوئلے سے کالے ہوئے۔ اور ان کے پیچھے پانی کی لامحدود وسعت تھی، دھوپ میں جھل جھل کرتی، اتنی خاموش اور ساکن کہ شائد ہی کوئی لہر کنارے پر آتی ہو۔ اس مسحور کن منظر سے اُس نے بہ جبر اپنے آپ کو علیحدہ کیا۔ اور شہر جا کر تھوڑا سا کھانا کھایا۔ یہ جان کر کہ پانچ بجے سے پہلے کوئی گاڑی روم نہیں جاتی اس نے طے کیا کہ بورگھیس کا شاندار باغ دیکھنے میں تین گھنٹے صرف کئے جائیں۔ تاکہ وقت اچھا کٹ جائے۔ یہ باغ آنزیو اور نتونو کے بیچ میں تھا۔

پروفیسر کو یاد نہیں تھا کہ اس سے زیادہ دلکش دن اُس نے اپنی عمر میں کبھی گزارا ہو۔ سنہری دوپہر میں سبز کھیت اور جنگل ایک طرف اور سمندر دوسری طرف، جس چٹان پر وہ چل رہا تھا۔ عین اس کے نیچے ایسی خوشی پہلے کبھی اُسے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ باغ کا دروازہ کھُلا ہوا تھا اور وہ اس میں داخل ہو کر گھومنے لگا۔ قدم قدم پر اس کا دل بہجت سے اُبلا پڑتا تھا۔ ایک چڑھائی پر اُسنے چڑھنا شروع کیا ہی تھا۔ کہ کسی نے آواز دی:-

ٹھہرو! تمہارے پاس ٹکٹ ہونا چاہئے ..... پانچ سولدی!

اس نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک ٹھنگنی سی عورت دوڑی چلی آتی ہے یہ عورت باغ کی رکھوالی تھی۔ پروفیسر نے اپنا خرچ زیادہ سے زیادہ گھٹانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن جو رقم اس سے اب طلب کی گئی۔ اس نے فوراً ادا کر دی۔ اور گھومتا پھرا اُن تنہا راستوں میں جو گویا سایہ دار سُرنگیں تھیں جنگلوں میں۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہو ایسے شاندار درخت خوابستان ہی میں ہو سکتے ہیں۔ یہ درخت اس طرح کھڑے تھے جیسے خاموش استغراق میں محو ہوں چڑیوں کے نغموں سے بھی خاموشی کا جادو نہیں ٹوٹتا تھا۔ بلکہ تحیّر آفرینی میں ان سے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا۔ کہ اس ویرانے میں بہت سی بُلبُلیں بھی تھیں اور کان لگا کر جو اُس نے سُنا تو معلوم ہوا کہ دُور کہیں ایک بُلبُل گا رہی تھی۔ وہ اس کے نغمے پر چلا اور جنگل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔ اور بہت دیر تک چلتے رہنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو ایک نہایت خوبصورت چیڑ کے بن میں پایا۔ اُن کے سیدھے سیدھے تنے کسی عالی شان گرجے کے ستون نظر آرہے تھے۔ دور اُوپر سر پر سر درختوں اس قدر گنجان اور دست و گریباں تھیں کہ کہیں سے بھی آسمان کی جھلک تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اس چیڑ کے بن کا اپنا ایک خاص ماحول تھا۔ تانبے کے رنگ کا جس میں کچھ ایسی عجیب سی خوشبو بسی ہوئی تھی جو ٹھنڈے تاریک گرجاؤں کے لئے مخصوص ہے۔

پروفیسر اس سے آگے نہ چل سکا۔ اُس نے اپنی ٹوپی اُتار دی اور بیٹھ گیا پھر لیٹ گیا۔ اور ہاتھ پاؤں پھیلا کر سوچنے لگا۔

سالہا سال تک پے در پے مصائب اور مسلسل رنج و غم نے جیسے اُس کی رُوح پر اجیرن بے بسی کا ایک غلاف چڑھا دیا تھا معذانہ زندگی کی پریشانیوں سے تنگ آکر اُس کی رُوحِ پرواز کی اُن بلندیوں تک پہنچنے سے اب عاری ہو گئی تھی جہاں جوانی میں تخیّل اُسے اُٹھا لے جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ عقل عارضی طور پر ماؤف ہو گئی تھی اور اس کے بعد مذہبی عقائد بھی متزلزل ہو گئے تھے۔ لیکن آج کے دن ساری کشمکش رُک گئی تھی۔ اور اس صداقت کی ایک جھلک اُسے دکھائی دے گئی تھی کہ زندگی لُطف اٹھانے کے لئے ہوتی ہے لیکن یہ صرف ایک جھلک ہی تھی۔ کیونکہ اس کے دل یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ ایک بار پھر دن کی روشنی کو دیکھنے کی کوشش کر دیکھے۔ اُن تحیّر کے اُلجھے ہوئے چھتناروں میں سے جن پر وہ پہلے خوب غور و خوض کر چکا تھا۔ اُس نے اپنے دل سے پوچھا "قسمت نے مجھی کو پتھروں اور تیروں کا نشانہ بنانے کے لئے کیوں انتخاب کیا؟ میں نے تو کبھی بھی کسی کو جان بوجھ کر دُکھ نہیں پہنچایا۔ بلکہ میں نے تو ہمیشہ وہی کیا ہے۔ جو ٹھیک ہو۔ پادری بننے کے عہد کو جو میں نے توڑا تو اس میں بھی حق بجانب تھا۔ کیونکہ گرجے کے پادریوں کی باتوں اور عقلِ سلیم میں مجھے کوئی مطابقت ہی نظر نہ آئی۔ یہ بھی میں نے ٹھیک

کیا کہ ایک یتیم لڑکی سے اس لئے شادی کی کہ اُس کا کوئی ٹھکانہ ہو جائے۔ خود اُسی نے اس شرط پر اصرار کیا تھا۔ حالانکہ مَیں نے اس کے بغیر بھی معزز طریقے پر، نہایت ایمانداری کے ساتھ اس کے رہنے سہنے کا انتظام کرنا چاہا تھا۔ اور اب جبکہ میری زندگی اُس عورت نے اپنی ذلیل فریب کاری اور فراری سے برباد کردی ہے۔ اب میری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ اپنے بچے کو سسک سسک کر مرتے دیکھنے کا عذاب برداشت کروں جو سکونِ قلب کا واحد سہارا ہے۔ چاہے کتنا ہی مضمحل سہارا کیوں نہ ہو! ایسی باتیں کسی کی قسمت میں کیوں ہوتی ہیں؟ کیا یہ سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں؟ نہیں خدا کی جانب سے ایسے احکام نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی خدا موجود ہے تو اُسے مہربان ہونا چاہئے۔ اچھے بندوں پر اگر ایک ظالم و جابر خدا کے وجود پر ایمان رکھا جائے تو پھر اس سے بڑھکر اور کیا کفر ہوگا! پھر کون ہے؟ کون ہے جو کارخانہ عالم چلا رہا ہے؟ جو بدنصیب انسانوں کی قسمتوں پر قادر ہے؟

چیڑ کا ایک خشک پھل . . . . . کیا چیڑ کا پھل تھا؟ ہاں، یہ چیڑ کا بڑا سا پھل تھا جو اسی وقت ٹہنی سے الگ ہوا۔ اور پروفیسر کے سر پر گرا۔ پروفیسر کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ بچارا پروفیسر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ بے ہوش۔ جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو جب اُسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ خون میں لت پت۔ پڑا ہے۔ سر کے بیچ میں سے ہوتا ہوا کان کے پیچھے تک ایک لمبا زخم ہو گیا تھا۔ اور اس میں سے خون ابھی جاری تھا۔ بے حواسوں کی طرح لڑکھڑاتا وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور بمشکل تمام پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر باغ کے دروازے تک پہنچا۔ جب باغ کی رکھوالی ٹھنگنی نے اُسے خون میں نہایا ہوا دیکھا تو خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

"اللہ! تمہیں کیا ہو گیا؟"

اُس نے اپنا کپکپاتا ہاتھ اٹھایا اور چہرہ بگاڑ کر دانت کچھ اس طرح نکوسے کہ ان سے درد یا شاید مسرت کا اظہار کرنا مقصود تھا، بولا:۔

"یہ . . . . . . یہ . . . . . . چیڑ پھل . . . . . . چیڑ پھل ہے۔ جو کارخانۂ عالم چلا رہا ہے۔ . . . . . . یہ اُسی نے کیا ہے۔"

عورت سمجھی کہ یہ کوئی دیوانہ ہے۔ وہ اپنے پڑوسی کو الائے کو بلانے بھاگی۔ تاکہ اُس مستری کو ساتھ لے جو باغ کے دروازے کے قریب ریل کی پٹڑی ٹھیک کر رہا تھا اور زخمی آدمی کو آرسینگو ہسپتال پہنچا دیں۔ جو قریب ہی تھا۔

وہاں پروفیسر کا سر مونڈا گیا اور زخم میں پانچ لمبے لمبے ٹانکے دئے گئے۔ اور پھر پٹی باندھ دی گئی۔ پروفیسر کو جانے کی جلدی لگ رہی تھی کہ کہیں ریل نہ چھوٹ جائے جب ڈاکٹر نے سنا کہ زخمی کو سفر کرنا ہے۔ تو اس نے سوچا کہ احتیاط زیادہ کرنی چاہئے۔ اس لئے پٹی کے علاوہ اس نے روئی کے پہل رکھ رکھ کر اور پٹی اس طرح باندھی کہ پگڑی سی بن گئی اور ٹوپی پہنا پروفیسر کے لئے ناممکن ہو گیا جب سارے کام ٹھیک ہو گئے تو گوسمو نے اپنے کندھے چڑھائے اور بہت آہستہ آہستہ اپنی گردن لمبی کرنے کی کوشش کی اور آدھ کھلی آنکھوں سے دیکھ کر ایک بار پھر آہ سرد کے ساتھ کہا:۔

"اچھا جی!"

——— ۳ ———

"پیاری بہار۔

مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ خاص طور پر اس سال تم کو اُس وقت سے پہلے آجانا ایسا کیا ضروری تھا جو وقت کہ لوگوں نے اپنی تقویم میں تمہارے لئے متعین کر رکھا ہے۔ جاڑا اب کے کچھ کم رہا اور اس سے پہلے کہ وہ دم توڑے شاید تھوڑا بہت نقصان تو پہنچانا چاہتا ہے۔ اس ضرر رسانی کا اُسے حق حاصل ہے۔ اس لئے وہ چاہے گا کہ تم اتنا وقت اس کے لئے چھوڑ دو کہ دو چار برساتی جھکڑ چلا کر اپنا دل ہلکا کرلے۔ اگر یہ عذر تمہیں نہیں بھاتا تو میں یہ کہوں گا کہ شاید وہ اس بات کا اندیشہ کرتا ہو کہ جب تم فاتحانہ داخل ہو تو سڑکوں پر بارش سے کیچڑ پانی نہ ہو جائے۔ اس سے تمہارے گلابی پاؤں میلے ہو جائیں گے۔ جاڑا بچارا تمہیں یہ اطلاع دینا چاہتا ہے کہ ہوا اس کے اندر اب بھی پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ اور وہ تم سے درخواست کرتا ہے کہ از راہِ مہربانی اُسے اتنا وقت کسی نہ کسی طرح دے دو۔ کہ وہ اس سے چھٹکارا پالے۔ وہ تم سے وعدہ کرتا ہے۔ کہ ہوا کی خنکی کم کر دے گا۔ اور زمین کو اُس تمام گندگی سے صاف کرے گا جو اُس نے زمین پر ڈالی ہے۔ اگر تم اس کی یہ درخواست منظور کر لو گی تو تم اس کے لئے بے اندازہ خوشی کا باعث ہو گی اور اس سے زیادہ میرے لئے۔ ہاں، میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ایک شخص

ہے ۔ خاص اچھا — جس کی میں نگرانی کر رہی ہوں ، خاص طور پر، اس کے پیدا ہونے سے اب تک، تم سمجھ سکتی ہو کہ مجھے کتنا لطف آرہا ہے۔ اُسے تکلیف پہنچانے میں ، لو، کل ہی کی بات ہے۔ تم سے لطف اندوزی میں جب وہ سرشار ہوگیا — چیڑ بن کے ایک نہایت حسین حصّے میں — اور زمین پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا تو میں نے اُس کے سر پر ایک عمدہ دو بڑا سارا چیڑ پھل گرا دیا۔ بڑا لطف آیا مجھے۔ وہ مرتے مرتے بچا۔ میں اُسے جان سے مارنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ تم تو خوب جانتی ہی ہو کہ میرے طغرے میں جو بلّی بنی ہوئی ہے۔ وہ چوہے سے کھیلتی رہتی ہے۔ اُسے مارتی نہیں . . . . "

پروفیسر کوسمو نے کسی پرانی کتاب میں ایک ایسی ہی اپیل پڑھی تھی اُسی ڈھنگ پر یہ ہوتم اپیل اُس نے لکھی تھی۔ قسمت کے ظالمانہ سلوک کی توضیح کرنا اس کا مقصد تھا۔ پندرہ دن سے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ اپیل قسمت کی طرف سے بہار کی دیوی کو لکھی گئی ہے۔ اور اسے دیوی نے فوراً منظور کر لیا۔ اپنی پگڑی پہنتے پروفیسر سالے وقت ڈالفینو کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ مسلسل بخار نے بچے کو کھٹیا سے لگا دیا تھا۔ پرسا اُترتے ہی اُسے بخار چڑھ گیا تھا پہلے — روم میں۔ بخار صرف رات کو ہو جاتا تھا۔

لیکن ہوا، ہوا، ہوا! پندرہ دن سے دن رات ایک لمحے کے لئے بھی ہوا نہ تھمی تھی۔ ہوا سیٹیاں بجاتی، چیختی چلاتی، ہر سُر میں۔ بعض جھونکے تو اتنے زور کے آتے کہ معلوم ہوتا کہ مکان جڑ بنیاد سے اکھڑ کر اُڑ جائیں گے اندیشہ تو یہی رہتا تھا مگر اتنا شدید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہوتا یہ کہ چند کھپریلیں اڑ جاتیں چند تار کے کھمبے اور درخت گر جاتے اور چند کھڑکیاں ٹوٹ جاتیں۔ سمندر میں بڑی بڑی موجیں اٹھا کر خوش ہوتی اور یہ پہاڑ کے پہاڑ ساحل پر سے ہو کر گھر کی دیواروں سے اس زور سے ٹکراتے کہ شورِ قیامت بپا ہو جاتا۔ پروفیسر کو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی جہاز میں بیٹھا ہو۔ اور طوفان جہاز کو اچھالے دے رہا ہو۔ بچارا ڈالفینو سہم گیا تھا۔ باپ پیار اور محبت کی باتوں سے اُسے دلاسا دینا چاہتا مگر بات مُنہ سے نہ نکلتی۔ موجوں کا شور اتنا خوفناک نہیں تھا جتنا کہ دھاڑتی ہوا کا — معلوم ہوتا کہ وہ اُس کے تن بدن میں گھس رہی ہے۔ اور صرف اُس کی آواز ہی کو سلب نہیں کر رہی۔ بلکہ اس کا سانس بھی گھونٹ رہی ہے۔ مایوسی میں غرق وہ اپنے خیالات کی

نزجانی کے لئے بار بار انّا کے گلے کی طرف دیکھتا۔ بدنصیبی پر بدنصیبی، وہ بچاری خود پلنگ پر پڑ گئی تھی، کیونکہ شدید نزلے سے اُس کا گلا بھینچ رہا تھا۔

جب پروفیسر ایک ہاتھ میں کاربالک کی شیشی اور دوسرے میں پھریری لے کر انّا کے قریب جاتا تو وہ بڑی لجاجت سے کہتی "بہت احتیاط کیجئے جناب، بہت احتیاط کیجئے"۔

انّا اپنے پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور مُنہ کھول دیا۔ سارا حلق لال لال اور سُوجا ہوا تھا۔ پروفیسر بہت احتیاط کرتا لیکن شائد ہوا سے اُس کا ہاتھ ہل جاتا تھا جب وہ گلے میں پھریری لگانا چاہتا تو ہاتھ کہیں کا کہیں جاتا اور یہ اُس بچاری انّا کی خوش نصیبی ہی تھی۔ جو اُس کی آنکھوں میں پھریری نہیں لگی اور وہ اندھی ہونے سے بچ گئی۔

"اب تھوک دو، تھوک دو"

پروفیسر یہ کہہ کر ڈالفینو کی طرف پلٹتا اور اُسے وحشیوں کی طرح گھورتا۔ کاربالک کی شیشی اُس کے ہاتھ میں لرزتی۔ کاربالک . . . . زہر . . . . نہیں، بہت کم مقدار ہے اور وہ بھی کم قوّت کا . . . . اس سے کیا فائدہ ہوگا . . . . پھر ڈالفینو کو اُس کی موجودہ حالت پر کیسے چھوڑ دیا جائے؟ نہیں یہ نہیں کرنا چاہئے۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے . . . . ہوا نے اُسے پاگل بنا دیا تھا۔

مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑانے لگا۔ "واہ کیا آرام ہو رہا ہے سمندر کے کنارے!"

آدھا مہینہ گزر چکا تھا۔ یہاں آنے سے فائدہ کیا ہوا؟ دُہرا تو گھر کا کرایہ دینا ہے، گھر کا آرام الگ چھوٹا۔ انّا کی بیماری مستزاد اور ڈالفینو کی بیماری میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور ہاں، ابھی تو اور کئی باتیں رہ گئیں — اُسے اپنا اور دونوں بیماروں کا سارا کام خود کرنا پڑتا تھا، آگ جلانا، بازار سے سودا سلف لانا۔ کھانا پکانا . . . . پھر یہ دیکھو کہ اُسے ایک منٹ کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ کہ اپنے بچے کو سمندر کے کنارے لے جاتا۔ تین کمروں میں قیدیوں کی طرح بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اور سمندر اور ہوا کے تازیانے پڑ رہے تھے۔ یہ تو بہت ہی ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

دروازے کو کسی نے آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے ؟"

پروفیسر حیرت زدہ سا رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ شیطانیہ داخل ہوئی۔ شیطانہ جو ممتا کی ماری ماں بننا چاہتی تھی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اسے اپنے بیمار بچے کو ضرور دیکھنا تھا۔

اُس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے بے ڈھنگے تھے۔ وہ بھاگ کر پروفیسر کے قدموں میں جھک گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ اُس نے پروفیسر کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا۔ اور گڑگڑا گڑگڑا کر کہنے لگی:۔

"کوسمو کوسمو خدا کیلئے! مجھے میرا بچہ دکھا دو۔ مجھے معاف کر دو مجھے بچا لو مجھ پر رحم کرو!"

پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ پڑا۔ سچے آنسو جو شاید کبھی نہ رکیں۔ روتے سے اُس کا سارا جسم ہل کھا رہا تھا اور اس کی سسکیاں آنسوؤں سے کچھ کم حقیقی نہیں تھیں اُس نے زمین سے اُٹھنے سے انکار کر دیا۔ ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ التجائیں کرتی رہی:۔

"میں چوموں گی ...... میں اُس زمین کو چوموں گی جس پر تم چلے گے کوسمو اگر تم مجھے صرف معاف کر دو صرف مجھے بچا لو۔ میں اس زندگی کو اب برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اب سے ڈالفینو ہی کے لئے وقف ہو جاؤں گی۔ مجھے اس کی خدمت کرنے دو۔ مجھے اس کی دیکھ بھال کرنے دو۔ خدا کے لئے۔ بس تم سے بھیک مانگتی ہوں ...."

پروفیسر ایک کرسی میں گر پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا منہ چھپانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ رات ہو گئی تھی اور کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ شام کی عبادت کی گھنٹی بجی اور انا نے اونچی آواز میں زور زور سے ایک حمد پڑھنی شروع کر دی تاکہ بچہ اپنی ماں کے قریب میں نہ آجائے۔

پچھلے کمرے میں سے ڈالفینو کی آواز سنائی دی "ڈیڈی! ڈیڈی!" کمرے میں سے اُسے جو آوازیں سنائی دی تھیں۔ اُن سے وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اُس کی آواز سنتے ہی شیطانہ اُچھل پڑی اور لپک کر بچے کے کمرے میں گھس گئی۔

پروفیسر کرسی میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ ڈالفینو کے کمرے میں ساری آوازیں اُس کے کانوں میں آ رہی تھیں ــــ ماں کے بار بار پیار کرنے کی آواز اور محبت کی باتیں۔ باہر ایک بڑی تبدیلی ہو گئی تھی ــــ ایک پُراسرار

خاموشی، جیسے ساری دنیا ایک دم سے ساکت و خاموش ہو گئی ہو۔ پروفیسر نے اپنا سر اُٹھایا اور تعجب سے سننے لگا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ اب بھی ہل رہا تھا۔ مگر بہت آہستہ آہستہ۔ ہائیں! کیا یہ وہی ہے ــ ہوا؟ تو آخر ہوا بند ہو گئی تھی۔ کیا یہ بھی ممکن تھا؟ پروفیسر اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا! باہر نظر ڈالی۔ گلی میں روشنی ہو رہی تھی۔ افسروں کے کوارٹروں کے سامنے باغ دکھائی دیا۔ ہاں، ہوا رک گئی تھی۔ یکایک۔ فوجی دستے کے افسر کھانا کھا کر خوشی خوشی باہر نکل رہے تھے۔ اور اُن کے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس عرصے میں ڈالفینو اندھیرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ اور شیطانیہ اُس کے ساتھ تھی۔ پروفیسر روشنی لانے چلا۔

شیطانیہ نے ایک دم سے کہا: "لاؤ مجھے دو۔ میں جلائے دیتی ہوں۔ موم بتی کہاں ہے؟ دوسرے کمرے میں ہے کیا؟"

اور روشنی لینے جلدی جلدی نکل گئی۔

ڈالفینو نے چپکے سے کہا "ڈیڈی۔ ڈیڈی، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے .... ان میں سے سینٹ کے بھبکے آ رہے ہیں ....."

"تم نہ گھبراؤ بیٹا، تم نہ گھبراؤ"۔

مگر ڈیڈی آپ کہاں سوئیں گے؟ آپ کے لئے تو کوئی پلنگ خالی نہیں ہے۔ آپ میرے پاس یہیں سوئیں گے ڈیڈی۔ سوئیں گے نا ڈیڈی؟

"ہاں بیٹا..... تمہارے ہی پاس سوؤں گا بیٹا، تم پریشان مت ہو۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر شیطانیہ کہاں رہ گئی؟ اب تک واپس کیوں نہیں آئی؟ کیا اُسے موم بتی نہیں ملی؟ کہاں رہ گئی؟ پروفیسر نے کان لگا کر سنا۔ پھر اُس کے پیروں کو ہوا کا ایک سرد جھونکا لگا۔ شاید اس نے دوسرے کمرے کی کھڑکی کھول لی ہے۔ مگر کیوں؟

پروفیسر کھڑا ہو گیا اور بچے کے پلنگ سے ہٹ کر پنجوں پر چپکے چپکے چلا۔ دوسرے کمرے میں کھڑکی تھی جو اُس میدان پر کھلتی تھی جو افسروں کی بارک کے سامنے تھا۔ ہاں، شیطانیہ نے کھڑکی کھول رکھی تھی اور وہ اس میں سے جھانک رہی تھی۔ وہ باتیں کر رہی تھی نیچی آوازیں

باہر کوئی ضرور تھا۔ کون ہو سکتا تھا؟ کیا وہ بے حیا عورت اب بھی وہی ذلیل حرکتیں کر رہی تھی؟ پروفیسر شیر کی طرح دبک کر چپکے چپکے اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ شیطانیہ نیچے والے کسی افسر سے کہہ رہی تھی "نہیں گرگی پیارے۔ آج نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ ہاں کل ..... کل کا میں وعدہ کرتی ہوں۔"

یہ سُن کر پروفیسر اور بھی دبک گیا۔ شیطانیہ کے پاؤں پکڑ کر زور کے جھٹکے کے ساتھ اُس نے شیطانیہ کو کھڑکی میں سے باہر پھینک دیا اور چیخ کر بولا:۔

"یہ لو لفٹنٹ! اسے لپک لو۔"

شیطانیہ کی چیخ اور افسر کا شور سن کر پروفیسر تھر تھر کانپتا کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔ اُس نے کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی۔ باہر فوجیوں اور افسروں اور راہگیروں کی بھیڑ لگنی شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے لڑکھڑاتے قدموں سے وہ بیٹے کے کمرے میں واپس آ گیا۔ واپسی میں اُسے انا ملی جو گھبرا کر اپنے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ انا اُسے روک کر پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں اتنا شور مچ رہا ہے؟ پروفیسر نے اُسے دھکا دے کر بچے کے پلنگ کا رُخ کیا اور جھک کر ڈالفینو کو پیار کیا۔

بچے کے پوچھنے پر اُس نے گھبراہٹ میں کہا "کچھ نہیں ہے ..... بالکل کچھ نہیں ..... واقعی کچھ نہیں ہے ..... تم مت ڈرو۔ ایک کھپریل چھت پر سے اُکھڑ کر لفٹنٹ کے سر پر گر پڑی ..... بس!

سامنے کے دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ انا نے جلدی سے کپڑے پہن کر دروازہ کھول دیا۔ دو بندوقچی اور ایک پولیس سارجنٹ اور اُس کے پیچھے فوجیوں، افسروں اور راہگیروں کی ایک بھیڑ داخل ہوئی۔ انا نے گھبرا کر کہا "ذرا ٹھہریئے ..... میں موم بتی جلاتی ہوں۔"

سب نے دیکھا ڈالفینو اپنے پلنگ پر جُھکا ہوا دعا مانگ رہا ہے۔ اور پروفیسر کو سموا اُسے اپنی گود میں لئے ہوئے ہے۔

پولیس والے نے آواز دی "اے سنتے ہو؟ تم میرے ساتھ چلو۔" پروفیسر نے اپنا سر گھما کر اُدھر دیکھا۔ مجمع جو کمرے میں گھس آیا تھا۔ حیرت اور ہراس سے دنگ رہ گیا۔ سامنے ایک مُردے کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس پر ایک بڑی سی عینک لگی ہوئی تھی۔ اور سر پر پٹیوں کی پگڑی۔

پروفیسر نے پوچھا "کہاں چلوں؟"

پولیس افسر نے اُس کا کندھا پکڑ کر بدتمیزی سے کہا "میرے ساتھ اور زیادہ بکواس مت کرو"

"اچھا جی۔ مگر میرا بچہ! اس کا کیا حشر ہوگا؟ یہ بہت بیمار ہے۔ اِسے کس پر چھوڑوں؟ جناب ذرا میری بات بھی تو سُنئے ....."

پولیس افسر نے غصّے سے کہا "بکواس بند کرو۔ تمہارے بچے کو ہسپتال پہنچا دیا جائے گا۔

تم چلو میرے ساتھ"۔

ڈالفینو خوف سے کانپ رہا تھا۔ پروفیسر نے اُسے پلنگ پر پھر لٹا دیا۔ بڑی ہمت سے اُس نے اپنے آنسو ضبط کئے۔ بار بار پیار کیا کان میں چپکے چپکے کہتا رہا "بیٹا ہمت سے کام لو۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ہے۔ مَیں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں"۔ بندوقچیوں میں سے ایک صبر نہ کر سکا اور آگے بڑھ کر اس نے پروفیسر کا بازو پکڑ لیا۔

پروفیسر نے پوچھا "کیا تم میرے ہتھکڑیاں بھی لگاؤ گے؟"

جب ہتھکڑیاں پڑ گئیں تو پروفیسر ڈالفینو پر پھر جُھکا اور بولا:۔

"بیٹا ... میری عینک ...."

بچہ اب تک مرنہ رہا تھا۔ سہما ہوا بولا "کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈیڈی؟"

بیٹا میری عینک اُتار لو ..... ہاں، بس ٹھیک ہے .....

نہایت عمدہ ..... اب مَیں تمہیں نہیں دیکھ سکتا ...."

پروفیسر نے اب مجمع کی طرف رُخ کر لیا۔ اُس کی آنکھیں چُندھی ہو گئی تھیں اور اپنا منہ ٹیڑھا کر کے اس طرح مُنہ کر لیا کہ اُس کے سارے زرد زرد دانت دکھائی دینے لگے۔ پھر کندھے چڑھاتے اور اپنی گردن لمبی کی۔ سگما ب کے گلے میں نہ جانے گولا سا کیا پھنس گیا کہ اپنی عادت کے مطابق نہ کہہ سکا۔

"اچھا جی"۔

دیوانخانے کا ایک حجرہ :-

عقب میں ایک جھروکا ہے جس میں سنگِ مرمر کی خوشنما جالی لگی ہوئی ہے جھروکے کے دونوں جانب متصل محراب کے طاق ہیں جن میں چینی کی منقش صراحیاں سجی ہوئی ہیں۔ دائیں جانب وسطِ دیوار میں ایک دروازہ ہے جس پر مخمل کا دبیز پردہ آویزاں ہے۔ یہ دروازہ باہر دالان میں لے جاتا ہے۔ بائیں جانب دیوار میں تین طاق بنے ہوئے ہیں جن میں آرائش کے لئے نادر اشیاء سجی ہوئی ہیں۔ اس دیوار کے ساتھ ملا ہوا ایک بڑا تخت بچھا ہوا ہے جس پہ مسند اور گاؤتکیہ رکھا ہے فرش پر قالین بچھا ہوا ہے چھت میں فانوس آویزاں ہے۔

رات کا وقت ہے۔ حجرے میں بائیں جانب کونے میں قدِآدم شمع روشن ہے۔ عالی حجرے میں ٹہل رہا ہے۔ عالی نوجوان خوبصورت مرد ہے۔ اس کا قد لمبا اور بدن پتلا ہے۔ خدوخال سیک ہیں۔ اس کے بال بے ترتیب ہیں اور انگرکھے کے بند کھلے ہوئے ہیں۔ عالی کے چہرے پہ شاعرانہ کیف ہے۔ وہ ایک شعر گنگنا رہا ہے۔

"عالی کوئی مقامِ تمنّا نہیں مگر
کچھ دیر تیری رہگزر دیکھتا چلوں"

عالی جھروکے کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔ بڑے کاکا دائیں جانب سے حجرے میں داخل ہوتے ہیں۔ داڑھی اور سر کے بال تِل چاولے ہیں لباس سادہ اور صاف ہے۔ کمر سے مخصوص قسم کا پٹکا بندھا ہوا ہے۔ جو غلام ہونے کی نشانی ہے۔ بڑے کاکا کا رنگ صاف ہے۔

بڑے کاکا (آہستہ سے) عالی میاں! (کھانستا ہے) عالی میاں!!

(عالی دھیان نہیں دیتا تو دوسری بار بہت زور سے کھانستا ہے)

اجی عالی میاں!!!

عالی - (غصّہ سے) تم دیکھتے نہیں ہو۔ اس وقت میری طبیعت موزوں ہے۔ فکرِ شعر کر رہا ہوں۔

بڑے کاکا - میں طبیعت موزوں دیکھ کر ہی تو آیا ہوں!

عالی (غصّہ سے) چلے جاؤ! ...... جاؤ!!

بڑے کاکا - اچھا جاتا ہوں (جاتے ہوئے) میں تو یہ کہنے آیا تھا۔ کہ آپ کی منسوبہ .... (بات ادھوری چھوڑ دیتا ہے)

عالی - (لپک کر بڑے کاکا کو پکڑ لیتا ہے۔ ملتجیانہ) للہ بتاؤ ...... میری منسوبہ .... بتاؤ کیا کہہ رہے تھے بڑے کاکا؟

بڑے کاکا - (جاتے ہوئے) آپ جب فکرِ شعر کر چکیں تو مجھے آواز دے لیجئے گا!

عالی - (ملتجیانہ) بڑے کاکا۔ تم خفا ہو گئے؟ .... ارے اب بتا بھی دو۔ کیا زریں میری منسوبہ ہو گئیں؟

بڑے کاکا - (بناوٹی طور پر کھانستے ہوئے) ذرا کھانس تو لوں!

عالی - میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ بتاؤ! (بڑے کاکا کا گلا پکڑ لیتا ہے)

بڑے کاکا - (گھٹی آواز میں) بتاتا ہوں .... بتاتا ہوں!! ... میں مر جاؤں گا!

عالی (چھوڑ دیتا ہے) اچھا بتاؤ اب!

بڑے کاکا - زریں کے والدین نے آپ کا پیغام قبول کر لیا۔

عالی (خوشی سے بے خود) تم سچ کہہ رہے ہو؟

بڑے کاکا (عاجز آ کر، ہاں! عالی میاں! ہاں!!

عالی (وجد میں آ کر بلند آواز میں ترنّم سے پڑھتا ہے)

"عالی کوئی مقامِ تمنّا نہیں مگر
کچھ دیر تیری رہگزر دیکھتا چلوں"

بڑے کاکا (جاتے ہوئے) آپ کی طبیعت پھر موزوں ہو گئی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔

عالی - (بڑے کاکا سے لپٹ جاتا ہے) ارے بڑے کاکا جی چاہتا ہے تمہیں چوم لوں۔

بڑے کاکا - اجی چھوڑیئے مجھے۔ آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی موزوں ہو رہی ہے۔

عالی - تمہاری سفید داڑھی کی قسم بڑے کاکا ...... (عالی لپٹا رہتا ہے)

بڑے کاکا (ناراض ہو کر) چھوڑیئے مجھے ...... یہ کیا بدتمیزی ہے!

. . . (بہت زور سے کھانستا ہے)

عالی (بڑے کاکا سے الگ ہو کر) تم خفا ہو گئے بڑے کاکا؟ ارے

بڑے کاکا (بلند آواز میں ترنم سے)

"عالی کوئی مقام تمنا نہیں مگر

کچھ دیر تیری . . . .

بڑے کاکا (بات کاٹ کر) آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

عالی ۔ ٹھیک کیسے رہ سکتا ہے؟ زریں اب میری منسوبہ ہیں۔

بڑے کاکا ۔ اپنے ہوشوں کی دوا کیجئے۔ عالی میاں! اُن کے والدین کے کان میں بھنک پڑ گئی تو بنی بات بگڑ جائے گی۔ ایک خبط الحواس کو کوئی اپنی لڑکی نہیں دے گا۔

عالی ۔ (غصّہ سے) تو کیا میں خبط الحواس ہوں؟ . . . . میں ایک اعلیٰ فکر شاعر ہوں۔ ہر صاحبِ ذوق میرے اشعار پر سر دھنتا ہے میری بیاض میں ایک ایک شعر ایسا ہے کہ زریں کے والدِ بزرگوار سن لیں تو میرا کلمہ پڑھنے لگیں۔

بڑے کاکا (جان کر بھونڈی نقل اتارتے ہوئے) "عالی کوئی مقامِ تمنا نہیں مگر . . . . . ."

عالی (غصّہ سے) یہ کیا مذاق ہو رہا ہے؟

بڑے کاکا ۔ (کھانستے ہوئے) میں آپ کا کلمہ پڑھ رہا تھا!

عالی ۔ ارے بڑے کاکا ۔ (ہنستے ہنستے تھک کر بیٹھ جاتا ہے چند لمحے خاموشی) بیٹھ جاؤ بڑے کاکا!

بڑے کاکا ۔ اچھا سرکار! (دہلیز کے پاس بیٹھ جاتے ہیں)

عالی ۔ وہاں دہلیز کے پاس نہیں۔ یہاں ۔ میرے پاس (اٹھ کر بڑے کاکا کو تخت کے پاس لا بٹھاتا ہے)

بڑے کاکا ۔ (دو زانو بیٹھتے ہوئے) میں حضور کا غلام ہوں۔

عالی ۔ وہ بات بھول جاؤ۔ میں تمہاری گود میں کھیل کر جوان ہوا ہوں تمہاری شفقت کی میں قدر کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو بڑے کاکا میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں اور اسی لئے تم مجھے سخت سُست کہتے رہتے ہو . . . مجھے اس میں بھی لُطف آتا ہے تمہارے ساتھ اب بھی میں بچپن کی حرکتیں کرتا ہوں . . . .

لاحول ولا! اب اس قدر سنجیدہ تو نہ ہو جاؤ۔

بڑے کاکا ۔ میں کچھ اَور سوچ رہا تھا!

عالی ۔ تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہاری فکر بوسیدہ ہے . . . . . میں خوشی سے بے خود ہو رہا ہوں . . . . . . چلو گھڑی دو گھڑی کے لئے جہاں آرا کے ہاں چلیں۔ بہت دن ہوئے انہیں نہ آئے . . . . . . وہ میری کوئی غزل گا کر سنائیں گی۔

بڑے کاکا (جھجکتے ہوئے) وہ آپ پر تھوڑا سا مرتی ہیں۔

عالی (حیرت سے) مجھ پر مرتی ہیں؟

بڑے کاکا ۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سرکار!

عالی ۔ مجھے بھی کچھ شبہ ہوا تھا . . . . . . بڑے کاکا میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ جہاں آرا بہت شگفتہ اور دلنواز ہے اس لئے پسند ہیں۔ ان کے گانے کی ادائیں بہت اچھی ہیں۔ وہ شعر کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر لیتی ہیں۔ اُن میں لذّت انفعال ہے جو کسی طوائف میں شاذ ہوتی ہے . . . . . لیکن . . . . . . مجھ پر ذرا سا مرنے لگنا یہ حد سے گزر جاتا ہے۔ کیا خبر کل وہ مجھ سے عشق کرنے لگیں۔ اور پرسوں زہر کھا کر مر جائیں . . . . . . نہیں . . . . . . میں اب جہاں آرا کے ہاں نہیں جاؤں گا میں طوائف کو نواز سکتا ہوں۔ ایک عورت کے دل سے نہیں کھیل سکتا!

بڑے کاکا ۔ اُن کا کوئی سازندہ سلام لے کر آئے تو کیا کہہ دوں؟

عالی ۔ کہہ دینا کہ میری طبیعت ناساز ہے۔

بڑے کاکا جی سرکار!

(چند لمحے خاموشی۔)

عالی ۔ طبیعت چاہتی ہے کہ کوئی وہ قطعہ سنائے جو میں نے زریں سے آغازِ محبت پہ کہا تھا . . . . (گنگناتا ہے) . . . تم یوں مسکرا کیوں رہے ہو؟

بڑے کاکا ۔ میں کچھ اَور سوچ رہا تھا!

عالی ۔ کیا؟

بڑے کاکا ۔ کچھ نہیں۔ یہی کہ آپ کو زریں سے محبت ہے۔

عالی (تنک کر) بڑے کاکا ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری عقل سٹھیا گئی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تمہیں دھوکا دے رہا ہوں یا خود اپنے کو دھوکا دے رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ میری بیاض اُٹھا کر دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ میرا کلام میری محبت کی گو دیتا ہے۔ مجھے زریں سے محبت ہے۔

بڑے کاکا (اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) جی ہاں! جی ہاں!!

عالی۔ (غصہ سے) لِلّٰہ کٹھ پتلے کی طرح گردن نہ ہلاؤ!

بڑے کاکا۔ گستاخی معاف ہو تو ایک بات پوچھوں؟

عالی۔ پوچھو!

بڑے کاکا۔ خفا تو نہیں ہوں گے آپ؟

عالی۔ پوچھو!!

بڑے کاکا (جھجکتے ہوئے) زریں کی سیاہ فام لونڈی لیلیٰ کے ساتھ آپ کے تعلقات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (فقرہ ادھورا چھوڑ دیتا ہے)

عالی۔ (غصہ سے) بکواس بند کرو (اٹھ کر عقب کے جھروکے کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

(چند لمحے خاموشی)

بڑے کاکا۔ (کھانستے ہوئے اٹھتے ہیں) میں جاتا ہوں سرکار!

عالی۔ بیٹھے رہو ۔ ۔ ۔ ۔ میں بتاتا ہوں (بڑے کاکا بیٹھ جاتے ہیں۔ عالی جھروکے سے واپس آ کر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا ہے)

بڑے کاکا۔ آپ چاہیں تو مجھے نہ بتائیے لیکن یہ غور کیجئے کہ زریں سے محبت اور لیلیٰ کے ساتھ تعلقات دونوں میں سے سچائی کس میں زیادہ ہے۔

عالی۔ میں شاعر ہوں۔ جذباتی۔ والہانہ۔ لیکن میں جھوٹ نہیں بولتا تم میری بات کا یقین کرو۔ مجھے زریں سے محبت ہے اور محبت میرا ایمان ہے۔ میری زندگی کی غایت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ قدرت نے عورت اور مرد بنائے۔ اور انہیں محبت کا جذبہ دیا تاکہ اُن کے تعلقات حیوانیت کی پستی سے بلند ہو کر ایک مقدس درجہ حاصل کریں۔ میں محبت کی تقدیس کا قائل ہوں۔ میری شاعری اسی عقیدے کی ترجمان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یقین کرو بڑے کاکا میری ساری محبت صرف زریں کے لئے ہے۔

بڑے کاکا (توقف کے بعد) لیلیٰ شاید آپ کے پاس آئے (داہنے گلے میں لٹکے ہوئے خلال سے دانت کریدتا ہے)

عالی۔ تم بہت سمجھدار ہو بڑے کاکا۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھے لیلیٰ سے بھی محبت ہے؟

بڑے کاکا۔ حاشا وکلا۔ یہ میں نے کب کہا سرکار؟

عالی (آہستہ سے رازدارانہ) سچ بتاؤں؟ وہ ایک بلا ہے جو میرے اعصاب پر بُری طرح چھائی ہوئی ہے۔

بڑے کاکا۔ وہ رات گئے آپ کے پاس آتی ہے۔ گھنٹوں تخلیے میں آپ کے پاس رہتی ہے اور آدھی آدھی رات کے بعد جاتی ہے۔ سب نوکر، لونڈی۔ غلاموں میں آپ کے اور لیلیٰ کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ کل ڈیوڑھی دار بھی کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے شمع بردار نے بھی مجھ سے کہا تھا۔ نرگس نے بھی پوچھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پوچھتی تھی کہ جب آپ لیلیٰ پر مہربان ہو سکتے ہیں تو نرگس میں کیا بُرائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھی لونڈی ہے اور جوان ہے۔

عالی۔ یہ میں نہیں بتا سکتا لیلیٰ میں کیا بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے کاکا تم یقین کرو۔ مجھے لیلیٰ سے محبت نہیں ہے ۔ ۔ ۔ نفرت ہے۔ شدید نفرت!! لیکن جب وہ میرے پاس آتی ہے۔ تو میں کھو جاتا ہوں اور پھسل کر حیوانیت کی دلدل میں جا گرتا ہوں تم نہیں جانتے جب میرے حواس درست ہوتے ہیں تو کس قدر اذیت ہوتی ہے۔ میں اپنے کو کس قدر لعن طعن کرتا ہوں۔ میرے لطیف احساسات کس بُری طرح مجروح ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی تو میری طبیعت چاہتی ہے کہ خودکشی کر لوں!

بڑے کاکا۔ آپ لیلیٰ کو موقع ہی کیوں دیتے ہیں سرکار؟

عالی۔ وہ زریں کا پیام سلام لاتی ہے اور زریں سے مجھے محبت ہے۔ میں اب تک زریں کی خاطر لیلیٰ کو برداشت کرتا رہا ہوں۔ اُسے موقع ملتا رہا۔ اور پھر میں بالکل بے بس ہو جاتا تھا۔ لیلیٰ رات کے اندھیرے کی طرح چھا جاتی ہے۔ اور میں بالکل اندھا ہو جاتا ہوں۔

بڑے کاکا۔ لیلیٰ بالکل سیاہ فام ہے سرکار!

عالی۔ بڑے کاکا۔ لیلیٰ میں ایک ایسی کشش ہے جو انسان کو حیوانیت کی سطح پر کھینچ لا کھڑا کرتی ہے —— بالکل برہنہ۔ تہذیب و اخلاق کے سب بندھن ٹوٹ جاتے ہیں —— وہ عورت کا اسفلین نمونہ ہے تم نہیں جانتے بڑے کاکا میں کس دوزخ میں جلتا ہوں — میرا دماغ، میری فکر، میرا دل میری روح کس درد و کرب سے چیختے ہیں!

بڑے کاکا۔ عالی میاں! اب تک جو بھی تعلقات آپ کے لیلیٰ کے ساتھ تھے اُنہیں بھول جائیے۔ اور یہ یاد رکھئے کہ وہ آپ کی منسوبہ کی لونڈی ہے اگر آپ شریف انسان ہیں تو آئندہ اُس سے کوئی تعلق نہ رکھئے گا

عالی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں خود اپنی نظر میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرے سارے اعلیٰ احساسات مسموم ہو رہے ہیں۔ میری فکر پریشان اور آوارہ ہو رہی ہے۔ میں بالکل ناکارہ انسان ہوتا جاتا ہوں۔ میں اب لیلیٰ کو مُنہ نہیں لگاؤں گا۔

بڑے کاکا۔ جب پہلی بار زرّیں سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی تو میں نے بھی چھپ کر اُنہیں دیکھا تھا . . وہ بہت حسین ہیں اور عالی حسب نسب ہیں۔ آپ کی نظرِ انتخاب بہت اچھی ہے۔

عالی۔ زرّیں عورت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر ایک لطیف وجد طاری ہو جاتا ہے۔ روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ اور ایسی آسودگیٔ قلب محسوس ہوتی ہے کہ . . . . میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں ایک مثنوی لکھوں گا بڑے کاکا . . . . . . یہ مثنوی میری محبت کی تصویر ہوگی۔

بڑے کاکا۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا۔ آپ فکرِ شعر کیجئے۔ میں جا کر حقّہ تازہ کرتا ہوں۔ اور چلم بھر کر لاتا ہوں —— تمباکو میں تھوڑا سا خمیرہ ملا دوں؟

عالی۔ ہاں۔ ہاں۔

بڑے کاکا۔ اچھا سرکار!

(بڑے کاکا کھانستے ہوئے دائیں دروازے سے چلے جاتے ہیں۔ عالی اٹھ کر عقبی جھروکے کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کوئی شعر گنگنا رہا ہے۔ چند لمحے بعد لیلیٰ دائیں جانب کے دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ لیلیٰ کی عمر بیس سال کے قریب ہے۔ اور جوانی بہت دلکش ہے۔ رنگ سیاہ فام ہے لیکن نقش بہت خوبصورت ہیں۔ لیلیٰ کے ہونٹ قدرے موٹے ہوتے ہیں اور رُخسار ذرا پھولے ہوئے۔ آنکھیں بڑی اور بے باک ہیں۔ بال لمبے گھنے اور سیاہ ہیں جسم گدرایا ہے اور سیاہ جلد جوانی کی تمازت سے شہاب کی طرح چمکتی ہے۔ لیلیٰ خوب بنی سنوری نوک پلک درست ہے۔ اور لباس میں سے بھی جسم کے نشیب و فراز بہت نمایاں ہیں۔ اس کے انداز بہت دلکش ہیں اور خود اعتمادی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ہیئت لونڈیوں کی سی ہے لیکن تیور بیگم زادیوں کے سے ہیں۔ لیلیٰ سیاہ چادر اتار دیتی ہے۔ اور تخت کے قریب آ جاتی ہے . . . . عالی کی پیٹھ ہے۔ اس نے لیلیٰ کو نہیں دیکھا ہے)

لیلیٰ۔ یہ لونڈی رئیس زادہ عالی میاں کی خدمت میں آداب بجا لاتی ہے۔

(عالی چونک کر مڑتا ہے۔ لیلیٰ جھک کر آداب بجا لاتی ہے عالی بے التفاتی سے جھروکے کے پاس کھڑا رہتا ہے)

عالی (چند لمحے خاموشی کے بعد) زرّیں کا کوئی پیام لائی ہو؟

لیلیٰ۔ نہیں سرکار؟

عالی (ناراضگی سے) تو پھر کیوں آئی ہو؟ . . . . مجھے تمہارا بے وقت آنا اچھا نہیں لگتا۔

لیلیٰ۔ بہت خوب سرکار! میں بے وقت کبھی نہیں آتی۔

عالی۔ اتنی رات گئے آنے کے معنی؟

لیلیٰ۔ یہ میری فرصت کا وقت ہے اور آپ بھی تخلیہ میں ہوتے ہیں۔ (مسکرا کر) اور رات بہت لمبی ہوتی ہے۔

عالی (غصّہ سے) لیلیٰ۔ چلی جاؤ یہاں سے! . . . جاؤ!!

لیلیٰ۔ (حیران) حضور کے مزاج کچھ ناساز ہیں؟

عالی (ملتجانہ) للہ۔ تم چلی جاؤ یہاں سے لیلیٰ!

لیلیٰ۔ حضور کو میری موجودگی ناگوار معلوم ہو رہی ہے؟

عالی۔ (غصّہ سے) میرے ساتھ حجّت نہ کرو!

لیلیٰ (بیٹھی رہتی ہے) ایک گھڑی سانس لے لوں۔ ایک گلوری تو کھا لوں۔ (پانوں کی ڈبیہ نکال کر ایک گلوری کلّے میں رکھ لیتی ہے۔ اپنے کپڑوں میں تلاش کرتے ہوئے) میں قوام کی ڈبیہ تو بھول ہی آئی ..... ذرا بڑے کاکا سے کمتی کے سر کے برابر قوام منگا دیجئے۔ (مسکرا کر) آپ بہت اچھے ہیں!

عالی۔ تم بہت گستاخ ہو۔

لیلیٰ۔ اس تعریف کا شکریہ (جھک کر آداب کرتی ہے) .... اس لونڈی کے ہاتھ سے ایک گلوری قبول کیجئے (اُٹھ کر ایک گلوری عالی کے پاس لے جاتی ہے)

عالی۔ نہیں! (جھروکے کی طرف مُنہ پھیر لیتا ہے)

لیلیٰ۔ (عالی کے شانے کو چھو کر) مَیں نے یہ پان خاص آپ کے لئے اپنی چھنگلی سے لگایا ہے۔ کھا کر دیکھیے مُنہ کیسا رچتا ہے۔

عالی (تنک کر) نہیں!!

لیلیٰ (گلوری منہ کے پاس لے جاتی ہے) اچھا ذرا مُنہ کھولئے۔ مَیں اپنے ہاتھ سے کھلادوں ..... اچھی سرکار!

عالی۔ (غصّہ سے) نہیں! ۔ نہیں!! نہیں!!! میری طبیعت اس وقت سخت ناموزوں ہے۔ مَیں کچھ بُرا بھلا کہہ بیٹھوں گا ..... تم فوراً چلی جاؤ۔

لیلیٰ (واپس آکر تخت کے اس فرش پر بیٹھ جاتی ہے) اور اگر مَیں نہ جاؤں تو؟

عالی۔ مَیں بڈے کاکا کو بلا کر تمہیں باہر نکلوا دوں گا۔ سمجھیں!

لیلیٰ (چند لمحے خاموشی کے بعد) مَیں خوب سمجھ گئی۔ آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ زرین کے والدین نے آپ کا پیغام قبول کر لیا ہے۔ اب آپ کو اطمینانِ خاطر ہے کہ زرین آپ کی ہیں۔ آپ کا مقصد پورا ہو گیا اب آپ مجھ کو مُنہ نہیں لگانا چاہتے۔

عالی۔ مَیں اب کچھ سُننا نہیں چاہتا!

لیلیٰ۔ آپ بے وجہ غصّہ سے بے خود ہو رہے ہیں (مسکرا کر) یہ تو آپ کے رئیسانہ مزاج کے شگوفے ہیں۔ مَیں ایسی باتوں کا بُرا نہیں مانتی بلکہ مجھے تو لُطف آتا ہے (ہنستی ہے)

عالی۔ (بہت غصّہ سے) لیلیٰ!

لیلیٰ۔ آپ بہت ناسمجھ ہیں۔ آپ یہ بات دھیان میں رکھئے کہ مجھے زرین کے والدین کا اعتماد حاصل ہے۔ میں نے آپ کا پیغام قبول کرایا ہے یہ آپ جانتے ہیں۔ مَیں چاہوں تو یہ رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے —— آپ کو میرے ساتھ خاطر سے پیش آنا چاہئے —— اچھا غصّہ تھوک دیجئے۔ اور میری خاطر یہ گلوری کھا لیجئے۔ (گلوری مُنہ کے پاس لے جاتی ہے)

عالی۔ (انکار کرتے ہوئے) نہیں! نہیں!!

لیلیٰ (اصرار کرتے ہوئے) بس اب ضد نہ کیجئے (گلوری ہونٹوں کے پاس لے جا کر) مُنہ کھولئے! (مُنہ میں گلوری ٹھونس دیتی ہے۔ اور ہنستی ہے)

عالی۔ گستاخ کہیں کی!

لیلیٰ۔ (ہنس کر) گلوری تو میں نے کھلا دی۔ اب گالی دے کر مُنہ کڑوا نہ کیجئے۔ (آ کر تخت کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

(چند لمحے خاموشی۔ عالی گلوری کا لُطف اُٹھا رہا ہے جھروکے کے پاس سے ہٹ کر تخت پر آ بیٹھتا ہے

عالی۔ تم بڑی حرافہ ہو لیلیٰ!

لیلیٰ۔ آج آپ میری بہت تعریف فرما رہے ہیں! (ہنستی ہے)

عالی۔ لو۔ میرا پیغام قبول کرانے کے انعام میں یہ انگوٹھی تمہیں دی جاتی ہے (اپنی ایک انگوٹھی اتار کر دیتا ہے)

لیلیٰ۔ اس ذرّہ نوازی کا شکریہ (انگوٹھی لے کر کھڑی ہو کر آداب کرتی ہے۔ اور بیٹھ جاتی ہے) بہت قیمتی ہیرا ہے سرکار!

عالی۔ ہاں۔ کئی پیڑھیوں سے خاندان میں چلا آرہا ہے۔ اس کی قیمت کا تو اندازہ نہیں۔ لیکن ہاں ایسا دوسرا ہیرا مشکل سے ہی ملے گا۔

لیلیٰ۔ (انگوٹھی پہن کر) میری کالی کالی انگلیوں کے درمیان یہ ہیرا کس قدر چمک رہا ہے!

عالی۔ تمہاری آنکھوں کے ڈھیلوں کی سفیدی بھی تمہارے چہرے پر ایسی ہی چمکتی ہے۔

لیلیٰ۔ (ہنس کر) آپ تو شاعری فرمانے لگے (انگوٹھی اتار کر دیتے ہوئے)

یہ انگوٹھی آپ ہی کو زیب دیتی ہے ۔ مجھے آپ کی انگلیاں بہت اچھی لگتی ہیں ۔ میری یہ انگوٹھی اپنی کسی انگلی میں جڑی رہنے دیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لائیے ۔ انگلی میں پہنادوں! (عالی کا ہاتھ پکڑنا چاہتی ہے)

عالی ۔ (اپنا ہاتھ کھینچ کر) تم رکھو اسے ۔ یہ تو تمہارا انعام ہے ۔

لیلیٰ ۔ مَیں مردوں سے انعام نہیں لیتی ۔

عالی (حیرت سے) کیوں ؟

لیلیٰ ۔ [illegible] کا دیا ہوا انعام بری نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ مجھے انعام لینے کی ریت ہی نہیں بھاتی ۔ مَیں لونڈی ہوں اور مجھے لونڈی ہی رہنا پسند ہے ۔ یہ قیمتی چیزیں مجھ پر چغلی کھاتی ہیں ۔

عالی ۔ لیکن میں اب یہ انگوٹھی نہیں پہنوں گا ۔

لیلیٰ ۔ آپ نہیں لیں گے تو میں واپس جاتے ہوئے کسی کنوئیں میں پھینکتی جاؤں گی ۔ (انگوٹھی مسند کے نیچے رکھ دیتی ہے)

عالی ۔ تم کس قدر مختلف لونڈی ہو! ساری لونڈیاں تو انعام لینے کے لئے مرتی رہتی ہیں ۔

لیلیٰ ۔ مجھے انعام بہت ملتے ہیں ۔ بڑی بوڑھیاں دیتی ہیں ۔ لیکن میں اپنے پاس کچھ نہیں رکھتی ۔ آپ کے بڑے کاکا کے گلے میں جو ہیرے جڑا ہوا سونے کا خلال لٹک رہا ہے ۔ وہ مجھے انعام ملا تھا ۔

عالی ۔ زرین کی والدہ نے بھی تمہیں رشتہ ہونے پر کوئی انعام دیا ؟

لیلیٰ ۔ جی ہاں ۔ وہ میں زرین کو شادی کے تحفے میں دوں گی ۔ اُن کے ابا جان نے مجھے ایک مرصع خنجر دیا ہے بہت قیمتی ۔ نایاب جواہرے جڑے ہوئے ہیں ۔ مَیں وہ آپ کو شادی کے تحفے میں دوں گی ۔

عالی ۔ میں تمہارا تحفہ قبول نہیں کروں گا ۔

لیلیٰ ۔ لونڈی کا دیا ہوا تحفہ واپس نہیں کیا جاتا ۔ سمجھے آپ ۔ (ہنستی ہے)

عالی ۔ تم تو ایک آفت ہو ۔

لیلیٰ ۔ مَیں ایک ادنیٰ لونڈی ہوں سرکار (آداب بجا لاتی ہے) ایک اور گلوری پیش کروں ؟

عالی ۔ نہیں ۔

لیلیٰ ۔ آپ کی طبیعت میں جھجک بہت ہے ۔

عالی ۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد) زرین میرا پیغام قبول ہو جانے سے بہت خوش ہیں نا ؟

لیلیٰ (زیر لب مسکراتے ہوئے) جی ہاں!

عالی ۔ تمہارے چہرے پر یہ پرمعنی مسکراہٹ کیوں ہے لیلیٰ ؟

لیلیٰ ۔ یہ ایک لطیفہ ہے سرکار!

عالی ۔ مجھے بھی تو بتاؤ ۔

لیلیٰ ۔ آپ کا انتخاب مَیں نے کیا تھا ۔ مَیں آپ کے قریب ہونا چاہتی تھی ۔ اس لئے مَیں نے زرین کو آپ کے سامنے آنے کا موقع دیا تاکہ آپ دونوں کو محبت ہو جائے ۔ پھر دونوں کا رشتہ کرا دیا اور اب زرین کے ڈولے کے ساتھ لونڈی بنکر آؤں گی ۔ (ہنستی ہے)

عالی ۔ (سوچتے ہوئے) یعنی میری اور زرین کی محبت صرف تمہاری فتنہ پردازی ہے ۔

لیلیٰ ۔ (ہنس کر) اس محبت کرانے میں میری خود غرضی ضرور ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے آپ بہت پسند ہیں ۔

عالی ۔ تم بہت ذلیل ہو ۔

لیلیٰ ۔ لونڈی ذلیل ہی تو ہوتی ہے سرکار ۔ لیکن آپ یہ تو سوچئے کہ زرین کو تو ایک مرد اور دوسرے مرد میں بھی فرق نہیں معلوم ۔ انہوں نے اپنی زندگی میں صرف اپنے قریبی محرم رشتہ داروں کو دیکھا ہے ۔ وہ بھی ناسمجھی کی نظر سے ۔ مَیں لونڈی ہوں اور بہت کچھ دیکھ چکی ہوں ۔ میں ایک نظر میں مرد کو پرکھ لیتی ہوں ۔ زرین تو انتخاب کر ہی نہیں سکتی تھیں ۔ اس لئے میں نے ہی اپنی پسند سے انتخاب کر لیا ۔

عالی ۔ تم مجھے دیوانہ کر دو گی لیلیٰ (کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اور حجرے میں ٹہلتا ہے ۔) میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا سر پھوڑ لوں ۔ مَیں کس قدر ذلیل وخوار ہوا ہوں!

لیلیٰ ۔ اے واہ اس میں ذلت کی کیا بات ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو فخر کی بات ہے ۔ مجھ جیسی لونڈی کسی ایسے ویسے مرد کا انتخاب کر سکتی تھی ؟ اس شہر کے سارے رئیس زادے ، شریف زادے ۔

دیکھ چکی ہوں۔ آفاق میاں اپنے کو بہت سمجھتے تھے۔ لیکن مجھے اُن کی ایک ادا بھی پسند نہیں آئی . . . . . وہ کاجل لگاتے تھے (ناک چڑھا کر) ہونہہ! شوکت میاں جو نواب عزت اللہ کے منجھلے صاحبزادے ہیں خوش گفتار ہیں۔ لیکن آواز میں نسوانیت ہے۔ بجو میاں کا جسم بہت خوبصورت ہے۔ لیکن اتراتے بہت ہیں ادبیات کرنے کا ڈھنگ بالکل نہیں۔ ان سب میں کچھ بہتر تھے۔ تو شمیم میاں لیکن وہ عطر اس قدر لگاتے تھے کہ اُن میں سے آدمی کی بو نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دفن کرنے کے لئے مردہ کفنایا گیا ہے . . . .

عالی (کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے) میرے سامنے اس طرح مردوں کا ذکر نہ کرو نہیں تو میں اپنے کانوں کے پردے پھاڑ ڈالوں گا۔

لیلیٰ۔ آپ تو بہت شرمیلے ہیں۔ شرم اُسے زیادہ آتی ہے جس کے جذبات زیادہ شدید ہوں۔ مجھے گرم جذبات مرد پسند ہیں۔

عالی۔ تم جانتی ہو میں اب کیا کروں گا؟

لیلیٰ (ہنس کر) آپ بتائیے!

عالی۔ میں تمہیں زرین کے ڈولے کے ساتھ نہیں آنے دوں گا۔

لیلیٰ۔ (اطمینان سے) یہ ناممکن ہے۔

عالی۔ میرے گھر میں میرا حکم چلتا ہے۔ تمہیں نہیں آنے دوں گا! نہیں آنے دوں گا!!

لیلیٰ (چند لمحے خاموشی کے بعد) میں سُنتی ہوں آپ بہت اچھے شاعر ہیں اگر آپ اپنی مونچھیں ترشوا کر ذرا پتلی کر لیں۔ تو بہت خوبصورت معلوم ہوں۔ اور دھوبی سے کہیے کہ انگرکھوں میں کلپ ذرا زیادہ دے۔ آپ میں ایک شانِ بے نیازی ہے جو مجھے پسند ہے۔

عالی۔ اب تم مجھے اپنے فقروں میں نہیں لا سکتیں۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ تم زرین کے ساتھ نہیں آ سکتیں!

لیلیٰ۔ لیکن آپ مجھ سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟

عالی۔ خائف کیوں ہوں؟ . . . . (سوچتا ہے) میں نہیں بتاؤں گا
(عقب کے جھروکے کے پاس بیٹھے بیٹھے مڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

لیلیٰ۔ یہ تو ایک عام ریت ہے۔ کہ دلہن جب وداع ہو کر نوشہ کے گھر آتی ہے تو ایک لونڈی ساتھ آتی ہے۔ آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟

عالی۔ کوئی نہیں۔ لیکن تم نہیں کوئی اور لونڈی ساتھ آ سکتی ہے۔

لیلیٰ۔ آپ زرین کے ہاں کہلوا دیجئے۔ اور پھر دیکھئے کیا کیا قیاس آرائیاں ہوتی ہیں۔ کوئی کہے گا کہ آپ کی اور میری ان بن پہلے ضرور اٹھ سٹھ ہوگی۔ دوسرا کہے گا آپ کا چال چلن ضرور خراب ہے۔ تیسرا کہے گا۔ کہ ایسے کو اپنی لڑکی کیوں دی جائے۔ جو لونڈیوں پر ڈورے ڈالے . . . . اور آپ زرین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

عالی (غصہ سے) تم خاموش نہیں بیٹھ سکتیں؟

لیلیٰ۔ میں سچ کہتی ہوں۔ میں زرین کے ساتھ آئی تو آپ کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔

عالی۔ میں تمہارا مطلب خوب سمجھ گیا ہوں۔

لیلیٰ۔ کیا مطلب؟

عالی۔ تمہاری فطرت بہت کمینہ ہے۔

لیلیٰ (ہنس کر) اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں لونڈی جو ٹھہری!

عالی (غصہ سے بے قابو ہو کر) لیکن میں تمہاری طرح روسیاہ نہیں ہوں!

لیلیٰ۔ (تُنک کر) آپ حد سے بڑھ رہے ہیں سرکار! —— میں روسیاہ ہوں۔ لیکن آپ کو کیا حق ہے کہ مجھے روسیاہ کہیں۔ میں عالی نسب نہیں ہوں۔ میں شریف زادی نہیں ہوں۔ لیکن آپ جیسے بیسوں رئیس زادوں کے ہاتھ جھٹک چکی ہوں۔ اگر آپ شریف زادے ہیں۔ تو میری نظر بھی بہت بلند ہے۔

عالی۔ تم اپنی نظرِ کرم مجھ سے دور ہی رکھو!

لیلیٰ۔ آپ کو زرین سے محبت تھی۔ لیکن آپ ایک طوائف جہاں آرا کے ہاں جاتے تھے۔

عالی (حیرت سے) تم سے کس نے کہا؟

لیلیٰ۔ آپ کو یقین ہے۔ کہ زرین سے شادی کے بعد آپ کسی طوائف کی چوکھٹ نہیں دیکھیں گے؟

عالی۔ نہیں (کچھ سوچ کر) ممکن ہے۔ کہ کبھی گانا سننے چلا جایا کروں۔ ایک شاعر کو اپنا کلام سننا بہت پسند ہوتا ہے۔

لیلیٰ ۔ (بہت نرم لہجے میں) مَیں جانتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اگر کوئی اور لونڈی زریں کے ساتھ آتی تو وہ زرین کے کان جا بھرے گی اور سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دے گی ۔ پھر نہ آپ کی طبیعت ہی موزوں رہے گی ۔ اور نہ آپ شاعری کر سکیں گے ـــــ آپ کو یہ معلوم نہیں کہ لونڈی ساتھ اس لئے بھیجی جاتی ہے ۔ کہ نوشہ کی ہر بات کی ٹوہ لیتی رہے ۔ کہاں جاتے ہیں ۔ کہاں بیٹھتے ہیں ۔ کون مصاحب ہیں ۔ رات گئے کہاں سے آتے ہیں ـــــ آپ کی جان آفت میں آجائے گی ۔ مَیں تو آپ کی طبیعت پہچان گئی ہوں ۔ بہت سی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں ۔ جو مَیں درگزر کر دوں اور زریں تو بالکل سیدھی نا سمجھ لڑکی ہیں ۔ اگر مَیں انہیں نہ بتاؤں گی ۔ تو انہیں کچھ معلوم نہ ہوگا ۔

عالی ۔ خوب ۔ تم نے جس کا نمک کھایا ہے اُسی کے گھر کو آگ لگانا چاہتی ہو ۔ تم زریں کے لئے مارِ آستین ہو ۔

لیلیٰ (سرہنس کر) زریں عالی نسب شریف زادی ہیں ۔ آپ عالی نسب شریف زادے ہیں ۔ لیکن آپ دونوں کی دُنیا بالکل الگ الگ ہے ۔ زریں کی دُنیا حویلی کی چار دیواری ہے ۔ جس میں آپ گھنٹہ دو گھنٹے تو رہیں گے اور پھر باہر اپنی دُنیا میں چلے جائیں گے ۔ آپ کی دُنیا میں دوست احباب ہیں ۔ سیر و تفریح ہے ۔ سفر اور شکار ہیں ۔ شعر و شاعری ہے ۔ موسیقی اور محفلیں ہیں ۔ جب شریف زادے اور شریف زادیوں کی زندگی کی سطحیں اس قدر مختلف ہوں تو خوشگوار زندگی اسی طرح لبسر ہو سکتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں کم سے کم حائل ہوں ۔

عالی ۔ تم مجھے زریں سے برگشتہ کرنا چاہتی ہو ؟

لیلیٰ ۔ آپ کو زریں سے محبّت ہے ۔ لیکن اُن کی سادگی آپ کو اکتا دیگی جب پہلی بار آپ دونوں کی ملاقات ہوئی تھی ۔ تو مَیں چھپ کر دیکھ رہی تھی ـــــ مَیں بتا نہیں سکتی کہ میں نے کس مشکل سے اپنی ہنسی روکی تھی ۔

عالی ۔ (حیرت سے) اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی ؟

لیلیٰ ۔ بات نہ چیت ۔ آپ ہیں کہ زریں کے ہاتھ چوم رہے ہیں ۔ زریں ہیں کہ اُن کا سر جھکا جاتا ہے ۔ آپ سے ایک فقرہ بھی پورا نہیں کہا جا سکا ۔ اور زریں تو جیسے اپنا سر آپ کے سینے پر رکھ کر کھو گئی تھیں ۔ جب آپ نے بولنا شروع کیا تو ساری شاعری ختم کر دی اور زریں کے ایک لفظ جو پلّے پڑا ہو ۔ وہ تو آپ ایسے دیکھ رہی تھیں ۔ جیسے پیدا ہوا بچہ شمع کو تکتا ہے ؟

عالی ۔ (منہ پھیر کر) تم نہیں سمجھ سکتی محبّت کیا ہے !

لیلیٰ ۔ آپ بجا فرماتے ہیں ۔ میرے لئے محبّت کے بغیر بھی زندگی بہت دلچسپ ہے ۔ مثلاً آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں ۔ اگر خدانخواستہ مجھے آپ سے محبّت ہو جائے ۔ تو آپ سے لُطف اندوز ہونے کی بجائے اس خیال میں گُھلتی رہوں گی ۔ کہ آپ بھی مجھ سے محبّت کرتے ہیں یا نہیں ۔

عالی ۔ تمہاری باتیں میرے دماغ کا توازن خراب کر دیں گی ۔ میرا بس چلے تو تمہیں قتل کر دوں !

لیلیٰ ۔ آپ شاعر ہیں ۔ شاعر عام طور پر مجذوب ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ قتل نہیں کرتے ۔ اس لئے اطمینان سے بیٹھی ہوں نہیں تو چیختی ہوئی جان بچا کر بھاگتی ۔

عالی ۔ تم اب چلی کیوں نہیں جاتیں ؟

لیلیٰ ۔ چلی جاؤں گی ۔

عالی ۔ تم اگر یہاں بیٹھی اسی طرح مجھے تکتی رہیں تو شاید مَیں شاعر نہ رہوں ۔ قاتل بن جاؤں ۔

لیلیٰ ۔ (مسکرا کر) مَیں بھلا کس طرح تک رہی ہوں ؟

عالی (نظر ہٹا لیتا ہے) مَیں نہیں بتا سکتا !

لیلیٰ ۔ مَیں آپ کے پاس کئی مہینوں سے آ رہی ہوں ۔ آج کونسی نئی بات ہے جو آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں ۔

عالی ۔ آج میری حمیّت میرے ساتھ ہے ۔ آج تمہاری نظریں بھی بہت بے باک ہیں ۔

لیلیٰ ۔ اے ہے میری نظروں میں کیا بے باکی ہے ؟

عالی ۔ (منہ پھیر کر) تم ایک ذلیل لونڈی ہو !

لیلیٰ ۔ یہ تو میں جانتی ہوں سرکار !

عالی (تحکمانہ) تم کیا چاہتی ہو ؟ بتاؤ !

لیلیٰ - کچھ نہیں سرکار!

عالی - کوئی ایسی صورت نہیں جو تم سے خلاصی ہو سکے؟

لیلیٰ - آپ کہہ ہی چکے ہیں سرکار، میں بلا ہوں - مَیں آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی -

عالی (متعجب) - تم ابھی میری اور بڑے کاکا کی باتیں سن رہی تھیں؟

لیلیٰ - جی ہاں - میں پردے کے پیچھے کھڑی تھی -

عالی - (ملتجانہ) تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہو؟ مَیں ایک شریف انسان ہوں - مجھے اپنی منسوبہ سے محبت ہے - مجھے زریں سے محبت کرنے دو - اور ہوس کی دلدل میں غرق نہ کرو ـــــ میں تم سے پناہ مانگتا ہوں - تمہاری خوشامد کرتا ہوں - تم کہو تو تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں للہ میرا پیچھا چھوڑ دو -

لیلیٰ (ہنس کر) آپ تو کہتے ہیں میں بلا ہوں -

عالی (غصّے سے) تم بلا نہیں ہو تو کیا ہو؟ انسان کو حیوان بنا کر اُس کا خون چوسنا چاہتی ہے - تمہارا سارا جسم زہر سے بھرا ہوا ہے تمہارے ایک ایک رونگٹے میں سے سانپ کی زہریلی زبانیں ڈسنے کو نکلی پڑتی ہیں (غصّے سے بے خود ہو کر مُنہ پھیر لیتا ہے)

لیلیٰ - (توقف کے بعد) آپ ہجو بھی خوب کہہ سکتے ہیں سرکار! آج تک میں نے آپ سے قصیدے سُنے تھے - آپ کو میرے جسم میں سے گیلی چکنی مٹی کی سی خوشبو آتی تھی - میں بے تاب مچھلی تھی جو لوٹتی موجوں کے لئے تڑپتی ہو . . . .

عالی - (چیخ کر) مت دہراؤ یہ باتیں - مَیں پاگل ہو جاؤں گا -

لیلیٰ - میرے سیاہ رخسار آگ کی آتشیں لپٹوں سے منور رہتے - میری آنکھوں میں سیماب بیقرار تھا . . . . . .

عالی - (اور زور سے چیخ کر) میرے دماغ کی رگیں پھٹی جاتی ہیں - مَیں مر جاؤں گا -

لیلیٰ - میری پلکوں کو آپ نے چوما تھا - میرے لبوں پر آپ کی مخروطی انگلیوں نے کتنی مہریں لگائی تھیں . . . . .

عالی - (غصّے سے بے خود ہو کر. خاموش! زبردستی لیلیٰ کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیتا ہے - عالی کا سانس پھول رہا ہے - کچھ دیر خاموشی کے بعد) تم ایک بہت ہی عریاں گالی ہو -

لیلیٰ - مَیں نے سنا ہے کہ اکثر شرفا گالیاں سُننے کے لئے طوائفوں کے ہاں جاتے ہیں . . . . . . (کچھ دیر خاموشی) آپ کی باتوں نے میرے مُنہ کا مزا خراب کر دیا - آپ کو ایک گلوری پیش کروں کیا؟

عالی - نہیں!

لیلیٰ - مَیں تو کھاتی ہوں - بڑے کاکا سے ذرا سا قوام منگا دیجئے - مُنہ میں سے بُو آنے لگی - اے ہے آپ بھی کیسی گندی گندی باتیں کرتے ہیں (مُنہ میں گلوری رکھ کر دوسری عالی کی طرف بڑھاتی ہے)

عالی - (ہاتھ بڑھا کر) اچھا لاؤ

لیلیٰ - اونہوں - مُنہ کھولئے - میں اپنے ہاتھ سے . . . . . (عالی مُنہ کھولتا ہے) دیکھئے میری انگلی نہ کُتر لیجئے گا - (گلوری مُنہ میں دے کر) آپ بہت شریر ہیں -

عالی - (حیرت سے) مَیں بہت شریر ہوں؟

لیلیٰ - (پُر معنی انداز میں) معلوم نہیں آپ کب خاموش ہو جائیں اور شرارت شروع کر دیں - آپ مرزا فرخ کو جانتے ہیں - جو بہت پارسا معلوم ہوتے ہیں - وہ بھی آپ کی طرح بہت باتیں کرتے تھے - ایک رات انہوں نے مجھے کس قدر ستایا مَیں بتا نہیں سکتی - میری بانہوں پر نیل پڑ گئے - بڑی مشکل سے اپنا آپ بچا کر بھاگی -

عالی - تم فرخ کے پاس گئی کیسے تھیں؟

لیلیٰ - کبھی مجھے ذرا پسند تھے - مَیں پھر اُن کے پاس نہیں گئی - اُن کا منشی کئی مہینے تک ہماری ڈیوڑھی پر آیا کیا!

عالی - تم کہتی ہو مَیں تمہیں بہت پسند ہوں؟

لیلیٰ - مَیں بات نہیں چھپاتی - سچ!

عالی - اگر مَیں شرارت کروں تو تم بھاگ جاؤ گی؟

لیلیٰ - چھی! چھی!! ایسی بات نہیں کرتے . . . . .

عالی - (لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے) لیلیٰ . . . .

لیلیٰ - (دبی آواز میں) میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے - کسی کی چاپ سنائی دے رہی ہے . . . .

(بڑے کاکا کی آواز قریب سے آتی ہے - عالی لیلیٰ

کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے بہت
قریب ہیں)

بڈھے کاکا ۔ (آواز) میں نے حقہ تازہ کر دیا ہے سرکار۔ چلم میں بالکل
دہکتے ہوئے اُپلے بھرے ہیں۔ تمباکو میں خمیرہ بھی ملا دیا ہے۔

(ایک کش لگا کر) بالکل تیار ہے سرکار! (داخل ہوا چاہتا
ہے۔ کہ عالی کو لیلیٰ کے اس قدر قریب دیکھ کر واپس پلٹتا
ہے۔ اور دروازے کے پردے کے پیچھے سے بناوٹی طور
پر زور سے کھانستا ہے)

نند کمار

میرزا ادیب

افراد:-

بارول، فرانسس، مانسن، کلیورنگ	کونسل کے ارکان
وارن ہیسٹنگز	ہندوستان کا گورنر جنرل
لیڈی وارن ہیسٹنگز	گورنر جنرل کی جرمن نژاد بیوی
سر ایلیجا امپی	عدالت عالیہ کا چیف جسٹس
موہن پرشاد	کلکتے کا ایک جوہری
نندکمار	

زمانہ:- ۱۷۷۵ء مقام:- کلکتہ

پہلا منظر

منظر: (علی پور کلکتہ میں ایک شاندار بنگلے "بلویدیئر" کا کونسل ہال

یہ کمرہ اعلےٰ درجے کے سامانِ آرائش سے مُزیّن ہے۔ چھت سے تین نہایت خوبصورت اور بیش قیمت فانوس لٹک رہے ہیں۔ یہ فانوس کچھ عرصہ پیشتر مرحوم نواب سراج الدولہ کے محل کی زینت تھے۔ نواب کے خاتمے پر جب کمپنی کے اربابِ بست وکشاد نے اس کے محل میں لُوٹ مار مچائی تھی۔ تو جو چیزیں انہیں خاص طور پر بہت پسند آگئی تھیں۔ وہ انہوں نے ولایت بھجوا دی تھیں۔ اور باقی سامان اپنے ہندوستانی بنگلوں اور سرکاری دفاتر میں منتقل کر دیا تھا۔ ان فانوسوں اور فرش پہ بچھے ہوئے بیش بہا کشمیری قالین کے علاوہ اور بھی کافی سامان گورنر کے حصے میں آیا تھا جس سے "بلویدیئر" کے مختلف کمروں کی زینت بڑھائی گئی تھی۔

دیواروں پر مغلیہ اور چینی آرٹ کے نادر نمونے آویزاں ہیں۔ یہ چیزیں کمپنی کے اہل کار گورنر کی خاص مراعات حاصل کرنے کی خاطر اس کی خدمت میں وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔

اس وقت دن کا دُوسرا پہر ہے۔ کمرے کے وسط میں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی میز کے ارد گرد گورنر جنرل کی کونسل کے چاروں ارکان بیٹھے ہیں۔ دائیں طرف "فرانسس" ہے اور کونے میں کرنل "مانسن"۔ اس طرح دوسری جانب جنرل "کلیورنگ" ہے اور کونے میں فرانسس کے بالمقابل "بارول" بیٹھا ہے ——

ایک طرف کونسل کے صدر اور ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی کُرسی خالی پڑی ہے!

ان میں سب سے کم عمر فرانسس ہے۔ جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی باقی تینوں ارکان کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان ہے چاروں اپنے قومی لباس کوٹ پتلون میں ملبوس ہیں۔

فرانسس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات پڑے ہیں جن پر وہ نگاہیں جمائے کچھ سوچ رہا ہے۔ بارول ذرا کُرسی کھسکا کر فرانسس کی طرف دیکھتا ہے۔ فرانسس کی توجہ بھی کاغذوں سے ہٹ کر اُس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے)

بارول: میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ نہایت اہم ہے ہمیں ہر ممکن احتیاط سے کام لینا چاہیئے!

فرانسس: (ذرا مسکرا کر) مسٹر بارول! یہ فقرہ آپ کم از کم چار مرتبہ کہہ چکے ہیں۔

بارول: معاملہ اس درجہ اہم ہے کہ میں بار بار یہ فقرہ کہنے پر مجبور ہوں۔

مانسن: احتیاط سے کام لئے بغیر ہم اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے

فرانسس: (کاغذ اٹھا کر اور انہیں دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے) کیا اس شہادت کے باوجود کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہے؟

بارول: اس کے باوجود بھی۔

فرانسس: اس سے زیادہ بھی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں؟ مسٹر بارول! آپ ان خطوں کو صحیح تسلیم نہیں کرتے؟

بارول: میں ایک لمحے کے لئے بھی ان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ وجہ ظاہر ہے۔

کلیورنگ: وجہ کیا ہے؟

بارول: کیا مجھے پھر وہی فقرے دُہرانے پڑیں گے جنہیں میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں۔

کلیورنگ: کیا حرج ہے؟ زیادہ وضاحت ہو جائے گی!

بارول: اتنی بات تو صاف ظاہر ہے کہ گورنر جنرل نے اس بنگالی برہمن "نندکمار" کی دیرینہ آرزو پوری نہیں کی تھی۔ یعنی نندکمار چاہتا تھا۔ کہ رضا خاں کی بجائے دوبارہ بنگالے کا صُوبہ دار بن جائے۔ مگر ایسا نہ ہُوا گورنر جنرل نے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ماتحت صُوبوں کے دیوانی اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے۔ یعنی نندکمار جو عہدہ چاہتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔ کیا اب یہ بھی کہنے کی ضرورت ہے کہ نندکمار نے گورنر جنرل پر رشوت ستانی کا جو الزام لگایا ہے۔ وہ ایک انتقامی کارروائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں؟

مانسن: لیکن یہ خط؟

بارول: میں پہلے ہی کہہ چکا ہُوں۔ کہ مجھے ان خطوں پر کوئی اعتبار نہیں یہ نقلی ہیں!

فرانسس: (کُرسی کے بازو پر دائیں کُہنی رکھتے ہوئے) دوستو! میں مانتا ہُوں یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ اور ہمیں ہر ممکن احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ مگر میرے دوست مسٹر بارول کو یہ خیال دماغ سے نکال دینا چاہیئے۔ کہ وہ چونکہ ہندوستان میں مسٹر ہیسٹنگز کے

دستِ راست رہ چکے ہیں - اس لئے انہیں گورنر جنرل کی ہر معاملے میں حمایت کرنی چاہیئے اور ہم چونکہ ابھی ابھی انگلینڈ سے آئے ہیں اس لیئے ہم ان کی ہر طرح مخالفت کریں گے - ہمیں حالات کو بہتر اور خوشگوار بنانا ہے — ہمیں گورنر جنرل کو ہر معاملے میں نیک مشورہ دینا ہے

بارول! میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں!

فرانسس! سوال یہ ہے کہ نند کمار کو گورنر جنرل پر الزام لگانے کی جرأت کیونکر ہوئی؟ کوئی شخص بھی اتنی بڑی شخصیت پر جھوٹا الزام لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا!

بارول! بہتر یہ ہے کہ واقعات کو اُن کے حقیقی تسلسل کے ساتھ سمجھا جائے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر نند کمار کو بنگالے کا صوبہ دار بنا دیا جاتا تو معاملہ یہیں ختم ہو جاتا - اور اسے مسٹر ہیسٹنگز پر الزام لگانے کی قطعاً ضرورت نہ پڑتی - چونکہ اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکا - اس لئے گورنر جنرل کو بدنام کرنے کے لئے اُس نے یہ الزام لگا دیا ہے - یہ ہندستانی — اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں!

فرانسس! مسٹر بارول! آپ کو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیئے -

بارول! میں بالکل درست کہتا ہوں -

فرانسس! آپ کو ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے!

بارول! حقیقت بیان کرنا کوئی جرم نہیں ہے!

فرانسس! ناجائز حمایت یقیناً ایک جرم ہے!

کلیورنگ! حضرات! اس معاملے کو چھوڑیئے - میں بارول سے پوچھتا ہوں - انہوں نے ان خطوں کو پڑھا بھی ہے؟

بارول! پڑھ چکا ہوں اور تین مرتبہ پڑھ چکا ہوں!

مالسن! بارول کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ خط نند کمار نے بھیجے ہیں اگر نند کمار کی بجائے یہ خط کسی اور شخص نے بھیجے ہوتے تو شاید انہیں زیادہ اعتراض نہ ہوتا - کیوں بارول!

بارول! ہمیں ہندستانیوں کی فطرت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے اور اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے - کہ کمپنی اور گورنر جنرل کا اس ملک میں مقصد کیا ہے!

فرانسس! کاش بارول کو معلوم ہوتا کہ اس وقت انگلستان میں ان کا محبوب گورنر جنرل کس وجہ بدنام ہو گیا ہے

بارول! سب کچھ فضول — وارن ہیسٹنگز اس عہد کا ہیرو ہے - گریٹ مین (GREAT MAN)

کلیورنگ! آپ لوگ کن چیزوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں - اصل معاملے پر غور کیجیے - مسٹر بارول! آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ ہمارے پاس صرف نند کمار ہی کا نہیں مُنی بیگم کی تحریر بھی ہے - اگر نند کمار کے خط کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ یہ محض انتقامی کارروائی ہے تو مُنی بیگم کی تحریر کو کیا سمجھنا چاہیئے!

فرانسس! (طنزاً) شاید یہ تحریر جعلی ہے؟!

بارول! میں اس تحریر کو جعلی سمجھتا ہوں یا نہیں یہ الگ بات ہے - سوال صرف یہ ہے کہ ہم ہندستان کے گورنر جنرل کو ان بیہودہ معاملات میں گھسیٹ بھی سکتے ہیں یا نہیں - ہندستانیوں کے لگائے ہوئے الزام پر غور کرتے وقت ہمیں یہ بات ہرگز نہ فراموش کرنی چاہیئے کہ وارن ہیسٹنگز ہندستان کا گورنر جنرل ہے — اس کونسل کا صدر ہے — انگلستان کے وقار کا نمائندہ ہے (جوش میں کھڑے ہو کر) ہندستانی لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں — ایک دوسرے پر حملہ کرنا اُن کی فطرت بن چکی ہے - اس لئے ہمیں بڑے ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کرنا چاہیئے - ہماری مخالفت سے ہمارے اپنے وقار کو نقصان پہنچے گا - ہمارے اپنے مقاصد کو نقصان پہنچے گا — جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی - کیا میرے دوست اس امر سے ناواقف ہیں - کہ اگر آج ہم اپنی مجوّزہ پالیسی پر سختی کے ساتھ عمل نہ کر سکے تو ہندستان کے بہت سے راجے اور نواب اور خود مغل بادشاہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں گے - اس طرح ہماری کوششیں خاک میں مل جائیں گی - میری رائے یہ ہے کہ ان کاغذوں کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہیئے - اور نند کمار جیسے فریب کار شخص کی کسی طرح بھی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیئے!

فرانسس! اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گورنر جنرل ہندستانیوں سے رشوت لے کر انگلستان کے وقار کو خاک میں ملائے تو ہمیں

بالکل خاموش رہنا چاہیئے ـــ بات کچھ معقول ہی معلوم ہوتی ہے (طنزاً) ہندوستان میں بے شمار دولت موجود ہے۔ اگر گورنر جنرل چند لاکھ یا چند کروڑ روپیہ بطور رشوت کے لے لیتا ہے۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

مانسن! اگر گورنر جنرل یہ روپیہ کمپنی کے حوالے کر دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا!

بارول! (مسکرا کر) بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ آپ کے حوالے کر دے۔

فرانسس! (میز پر مکہ مار کر) مسٹر بارول! آپ نے تسلیم کر لیا ہے۔ کہ گورنر جنرل نے رشوت لی ہے!

بارول! ہرگز نہیں!

کلیورنگ! ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ گورنر جنرل رشوت کا روپیہ مانسن کے حوالے کر دے۔

بارول! وہ تو محض ایک مذاق تھا۔

فرانسس! خیر مذاق مذاق ہی میں آپ نے حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور

(فرانسس ابھی اپنا فقرہ مکمل کرنے نہیں پاتا کہ گورنر جنرل کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز کو آتے دیکھ کر کونسل کے سب ارکان تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وارن ہیسٹنگز مسکراتا ہے اور جلدی جلدی قدم اٹھا کر فرانسس اور کلیورنگ کے درمیان اپنی مخصوص کرسی میں بیٹھ جاتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز چھریرے بدن کا آدمی ہے آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر نہایت تیز فی الفور مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں، ستواں ناک کشادہ پیشانی دہانہ تنگ، چہرے سے بلا کی ذہانت نمایاں ہے۔ ارکان اپنی اپنی کرسیوں میں بیٹھ جاتے ہیں)

وارن ہیسٹنگز! معلوم ہوتا ہے کونسل کسی اہم معاملے پر غور کرنا چاہتی ہے!

بارول! ہمارے دوست اس وقت ایک خاص غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گورنر جنرل نے نند کمار کے قول کے مطابق رضا خاں، منی بیگم اور شتاب رائے سے رشوت میں روپیہ حاصل کیا ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ نند کمار نے جو کچھ کیا ہے وہ محض انتقام کی خاطر کیا ہے۔

(وارن ہیسٹنگز کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے غصے کی سرخی آتی ہے۔ اور پھر غائب ہو جاتی ہے)

فرانسس! گورنر جنرل اس معاملے میں کیا کہتے ہیں!

وارن ہیسٹنگز! (صبر اور تحمل سے) مسٹر بارول نے جو کچھ کہا ہے درست ہے،

فرانسس! تو گورنر جنرل اس الزام کو غلط سمجھتے ہیں؟

وارن ہیسٹنگز! (لہجے میں تلخی اور تحکم) کیا کونسل آج اسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی ہے؟

فرانسس! معاملے کو صاف کرنا کونسل کا فرض ہے۔ اس الزام سے "تاج برطانیہ" بدنام ہوتا ہے۔

وارن ہیسٹنگز! یہ الزام غلط ہے۔ اس نیچ برہمن نے انتقام لیا ہے۔

فرانسس! (کاغذوں کو ہاتھ میں لے کر) اور یہ خط منی بیگم کا۔

وارن ہیسٹنگز! (تحکم) میں کہتا ہوں یہ سب کچھ بکواس ہے۔

کلیورنگ! گورنر جنرل یقیناً محسوس کریں گے کہ اس طرح معاملہ صاف نہیں ہو سکتا۔

بارول! اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

وارن ہیسٹنگز! اس موضوع کو ختم کیجئے۔ کوئی اور معاملہ چھیڑیئے۔

مانسن! میں گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست کروں گا۔ کہ وہ سب سے پہلے اس معاملے کو ختم کریں!

وارن ہیسٹنگز! تو میں اس معاملے کو ختم کرتا ہوں۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فرانسس! کونسل یہ بات سمجھ نہیں سکی!

وارن ہیسٹنگز! (ملائم لہجے میں) دوستو! آپ کو انگلستان سے آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے۔ میں گورنر اور گورنر جنرل بننے سے پہلے بھی اس ملک میں رہ چکا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی فطرت کا بخوبی علم ہے۔ ایک دوسرے پر الزام لگانا ان کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ ہمیں ان باتوں پر وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ اور اس کام کو جاری رکھنا چاہیئے جس کے لئے ہماری حکومت نے ہمیں یہاں بھیجا ہے!

فرانسس! یہ درست ہے مگر ہمیں حالات کو خوشگوار بنانا ہے۔ کمپنی

ہندوستان میں اور انگلستان میں دونوں جگہ بدنام ہو گئی ہے!

وارن ہیسٹنگز: یہ غلط ہے۔

فرانسس: اور بدنامی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری حکومت کے نمائندے اس ملک میں احتیاط سے کام نہیں لے رہے۔

وارن ہیسٹنگز: (غصے سے) تم نے اس کم بخت برہمن کی باتوں پر اعتبار کر لیا ہے؟

فرانسس: اس نے اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے جو ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں!

کلیورنگ: کونسل نے نند کمار کو بھی بلایا ہے۔ آ ہی رہا ہو گا!

وارن ہیسٹنگز: (غصے سے کھڑے ہو کر) گویا ایک ذلیل شخص کو میرے مقابلے میں لا کر کونسل میری توہین کرنا چاہتی ہے؟

فرانسس: اس سے توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کونسل چاہتی ہے کہ گورنر جنرل اور نند کمار جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ایک دوسرے کے سامنے کہیں!

وارن ہیسٹنگز: اس سے بڑھ کر میری اور کیا توہین ہو سکتی ہے؟

بارول: واقعی گورنر جنرل کی توہین ہے۔ انگلستان کی توہین ہے۔ "تاج برطانیہ" کی توہین ہے۔ کونسل اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ گورنر جنرل کی موجودگی میں نند کمار کو طلب کرے!

کلیورنگ: نند کمار کو اس لئے طلب کیا گیا ہے کہ وہ گورنر جنرل کی موجودگی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہے۔ اس کے بعد کونسل فیصلہ کرے گی کہ یہ صرف اس کی انتقامی کارروائی ہے۔ یا اس میں کچھ صداقت بھی ہے۔ کونسل کو اپنی ذمے داری کا پورا پورا احساس ہے۔ اگر یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نند کمار ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ مگر ہمیں انصاف کا تقاضا پورا کرنا پڑے گا!

فرانسس: کونسل گورنر جنرل سے یہ پوچھتی ہے کہ انہیں نند کمار کی موجودگی میں حقیقت بیان کرنے سے کیوں انکار ہے!

بارول: حماقت ظاہر ہے یہ تاج برطانیہ کے سب سے بڑے نمائندے کی توہین ہے۔

وارن ہیسٹنگز: میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کونسل کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ بیہودہ اور فضول باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔

فرانسس: کونسل کو بہر صورت اپنا فرض پورا کرنا ہو گا!

بارول: یہ فرض شناسی نہیں ہٹ دھرمی ہو گی؟

وارن ہیسٹنگز: میں بحیثیت صدر کے کونسل کو برخاست کرتا ہوں۔

(وقفہ)

فرانسس: اگر گورنر جنرل کونسل سے الگ ہو جانا چاہتے ہیں تو یہ الگ بات ہے۔ کونسل نے اپنے ذمے جو کام لیا ہے۔ اسے ضرور پورا کرے گی!

وارن ہیسٹنگز: مجھے معلوم نہ تھا کونسل کے ارکان اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے لئے ہندوستان میں آئے ہیں۔ میں اس بات کا اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ از روئے قانون میں کونسل کو برخاست کر سکتا ہوں ــــــ اگر کونسل میری عدم موجودگی میں جاری رہی تو اس کا کوئی فیصلہ میرے لئے قابلِ قبول نہیں ہو گا!

(کرسی سے الگ ہو کر جانے لگتا ہے)

بارول: مجھے بھی گورنر جنرل سے اتفاق ہے (جانے لگتا ہے)

فرانسس: ہمیں اس کی توقع نہیں تھی!

(گورنر جنرل چلا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے بارول بھی رخصت ہو جاتا ہے)

مانسن: اب کیا کرنا چاہیئے!

فرانسس: کارروائی جاری رکھنی چاہیئے۔ میں تجویز کرتا ہوں۔ موجودہ اجلاس کی صدارت مسٹر کلیورنگ انجام دیں!

مانسن: مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیا مسٹر کلیورنگ صدارت کے فرائض انجام دیں گے؟

کلیورنگ: یقیناً ــــــ دوستو! معاملے نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ گورنر جنرل اس بات کو پسند ہی نہیں کرتے۔ کہ رشوت ستانی کے معاملے میں ان سے باز پرس کی جائے!

فرانسس: یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہیسٹنگز کے دل میں کھوٹ ہے۔ اگر انہوں نے رشوت نہیں لی تو نند کمار کے سامنے اظہارِ صداقت

کرتے ہوئے انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے! ہم انگلستان سے
تماشائی کی حیثیت سے نہیں آئے۔ ہمیں حالات کو سنوارنا ہے اور
ہندستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے جو نفرت
پیدا ہو گئی ہے اُسے دُور کرنا ہے۔

(ایک چپڑاسی اندر آتا ہے)

چپڑاسی! نندکمار ———

کلیورنگ! بھیج دو اُسے اندر

(سب کی نگاہیں دروازے پر جم جاتی ہیں۔ نندکمار دروازے
میں آتا ہے۔ سر جھکا کر پرنام کرتا ہے اور کھڑاؤں اُتار کر
کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ نندکمار کی عمر ساٹھ سال کے
لگ بھگ ہوگی۔ مگر صحت نہایت اچھی ہے جسم پر ڈھاکے
کی ململ کی قمیص اور دھوتی ہے۔ چہرے پر ایک ایسا
جلال برستا ہے۔ جو بُردبار اور باہمت لوگوں کی امتیازی
خصوصیت ہے۔

نندکمار بڑی متانت اور سنجیدگی سے قدم اٹھاتا ہوا کونسل
کے قریب آتا ہے)

فرانسس! نندکمار (ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھ جاؤ!

نندکمار! شکریہ (کرسی پر بیٹھتا نہیں)

کلیورنگ! (فرانسس کے سامنے کاغذوں کی طرف اشارہ کر کے) وہ
خط تم نے بھیجے ہیں!

نندکمار! جی ہاں!

کلیورنگ! تم نے ہندستان کے گورنر جنرل پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں
نے بہت سا روپیہ رشوت میں لیا ہے۔

نندکمار! میں نے یہی الزام لگایا ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی دے چکا ہوں

کلیورنگ! ذرا اسے تفصیل سے بیان کرو!

نندکمار! مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے گورنر جنرل کی موجودگی
میں کہنا ہے۔

فرانسس! تم وہ باتیں اب بھی کہہ سکتے ہو۔

نندکمار! اور گورنر جنرل ——؟

کلیورنگ! انہیں اس سے کیا تعلق ہے۔ فیصلہ کونسل کرے گی۔

نندکمار! گورنر جنرل نے رضا خاں کو بنگالے کا اور شتاب رائے کو بہار
کا صوبہ دار بنایا تھا۔ یہ دونوں شخص اپنے صوبوں کے محاصل وصول
کر کے کمپنی کے حوالے کرتے تھے۔ رضا خان سات سال تک
اپنے عہدے پر رہا۔ اس سے پہلے یہ کام میرے سپرد تھا ———
میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ رضا خاں نے سات سال کے
عرصے میں کم از کم تین کروڑ روپیہ لوگوں سے لوٹا۔ اور شتاب رائے
نے نوّے لاکھ۔ میں نے یہ واقعہ گورنر جنرل کو بتایا۔ انہوں نے
دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اب چاہیئے یہ تھا۔ کہ دونوں کے خلاف
مقدمہ چلایا جاتا۔ اور انہیں سزا ملتی۔ مگر دونوں نے گورنر جنرل
کو معقول رشوت دے کر قانون سے نجات حاصل کر لی۔ رضا خان
نے گورنر جنرل کو دس لاکھ رشوت دی۔ اور شتاب رائے نے
چار لاکھ۔ اس کے علاوہ میر جعفر کی بیوہ منی بیگم نے بھی گورنر جنرل
کو ڈھائی لاکھ کی رقم رشوت دی اور نواب بنگال کی محافظ مقرر
ہو گئی۔ میرے پاس اس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ منی بیگم نے
گورنر جنرل کو مرشد آباد میں ایک لاکھ اور قاسم بازار میں ایک
لاکھ پچاس ہزار روپیہ دیا ——— منی بیگم نے یہ خط مجھ کو لکھا ہے
اور اس میں صاف طور پر بتایا گیا ہے۔ کہ اُس نے ڈھائی لاکھ
کی رقم گورنر جنرل کے حضور میں پیش کی تھی!

کلیورنگ! منی بیگم نے یہ خط تمہیں کیوں لکھا تھا؟

نندکمار! اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ منی بیگم کو مجھ پر کامل اعتماد
تھا۔ اور دوسرے اُسے کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک دن
اس کا خط گورنر جنرل کے خلاف ایک تحریری ثبوت کے طور پر
پیش کیا جائے گا!

کلیورنگ! کیا یہ تحریر منی بیگم کی ہے!

نندکمار! اس کا جواب براہِ راست منی بیگم کے دستخط دے رہے ہیں

فرانسس! نندکمار! یہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کہ چونکہ تمہیں
گورنر جنرل نے بنگالے کا صوبیدار نہیں بنایا۔ اس لئے تم ان
سے انتقام لینا چاہتے ہو۔

نند کمار! کونسل کو ہر طرح اختیار ہے کہ وہ اسے انتقام سمجھے یا کچھ اور میں نے جس چیز کو حقیقت سمجھا ہے۔ اس کا اظہار کر دیا ہے جب میں نے گورنر جنرل کو رضا خاں اور شتاب رائے کی لوٹ کھسوٹ کا حال بتایا تھا۔ تو انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں بنگلے کا صوبہ دار بنایا جائے گا۔ یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ مجھے اس کا رنج ضرور ہے۔ لیکن گورنر جنرل پر میں نے جو الزام لگایا ہے وہ اس رنج کا ردِ عمل نہیں ہے! رضا خان اور شتاب رائے نے میری زبان بند کرنے کے لئے مجھے بھی لاکھوں روپیہ رشوت دینے کا وعدہ کر لیا تھا، مگر میں اس کے لئے تیار نہیں تھا اور نہ کبھی تیار ہو سکتا ہوں۔ اگر مجھے دولت کی خواہش ہوتی تو دولت حاصل کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کیا ہو سکتا تھا۔ معاف کیجئے میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ گورنر جنرل نے اس ملک میں جس قسم کی لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ ہم میں نااتفاقی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف ——

کلیورنگ! (بات کاٹ کر) نند کمار! اس معاملے کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ غلط چال ہے تمہاری۔

نند کمار! صرف میں ہی نہیں میرے ساتھ ہزاروں لوگ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہندوستانیوں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ نوابوں اور راجاؤں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑایا جا رہا ہے۔ یہاں کی دولت انگلستان میں بھیجی جا رہی ہے۔

کلیورنگ! نند کمار! تم نے گورنر جنرل پر جو الزام لگایا ہے اسے کمپنی کے سامنے بیان کر دو گے؟ میرا مطلب رشوت کے معاملے سے ہے!

نند کمار! ہر وقت بیان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

کلیورنگ! تو اب تم جا سکتے ہو! شکریہ!

(نند کمار اسی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ چلا جاتا ہے جس متانت اور سنجیدگی سے آیا تھا)

فرانسس! میں پہلے ہی کہتا تھا معاملہ نازک ہے۔

کلیورنگ! معاملہ اس لحاظ سے اور بھی نازک ہے کہ یہاں کے لوگ ہم سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ نفرت آلود فضا میں حکومتِ برطانیہ کی پالیسی یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی!

مانسن! لوگوں میں نفرت بڑھ گئی تو ہمیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا!

کلیورنگ! اس وقت ہماری پالیسی کی کامیابی اور ناکامی کا سوال ہے گورنر جنرل سے پوری طرح مواخذہ کرنا چاہیئے!

فرانسس! میری رائے یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اس وقت مطمئن ہوں گے جب گورنر جنرل سے مواخذہ کیا جائے گا اور سختی سے کیا جائے گا

کلیورنگ! کاغذات تیار کر کے کمپنی کے حوالے کر دینے چاہئیں۔ اگر آپ اس پر رضامند ہیں تو فی الفور مقدمہ تیار کر کے کمپنی کے سپرد کر دیں گے۔

فرانسس! بالکل!

کلیورنگ! تو اجلاس برخاست ہوتا ہے۔

دوسرا منظر

منظر! (وارن ہیسٹنگز کا ڈرائنگ روم!)

کمرہ کافی آراستہ و پیراستہ ہے دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگین اور ریشمیں پردے لہرا رہے ہیں۔ مشرقی دروازے کے پاس فرانسیسی سکرین پڑی ہے۔ سکرین سے دور شمالی دیوار کے قریب مخملیں صوفے پر وارن ہیسٹنگز بیٹھا ہے اور اس کے سامنے کرسی میں کلکتے کی عدالتِ عالیہ کا چیف جسٹس (میرِ عدالت) سر ایلیجا امپی نظر آ رہا ہے۔ سر ایلیجا ٹھگنے قد کا آدمی ہے۔ عمر ہیسٹنگز کے لگ بھگ ہو گی۔ چھ سات ماہ کا فرق ہو سکتا ہے۔ سر ایلیجا کے چہرے سے پر رعب متانت ٹپک رہی ہے۔ کشادہ پیشانی ہے۔ گفتگو آہستہ آہستہ کرتا ہے ـــ وارن ہیسٹنگز کا بچپن کا دوست رہ چکا ہے۔ اس لئے دونوں میں کافی بے تکلفی ہے! ـــ اس وقت رات کا پہلا پہر ہے۔ کمرہ شمعدانوں کی روشنی سے منور ہے۔

صوفے کے پاس تپائی پر ایک فائل کھلا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ہیسٹنگز ابھی ابھی اس کی ورق گردانی کر رہا ہے)

امپی! لیکن مجھے حیرت ہے تمہاری کونسل کے یہ تین ارکان تمہارے

خلاف کیوں ہیں۔

وارن ہیسٹنگز! بے وقوف ہیں۔ ان کی مخالفت سے مجھے جو نقصان پہنچا ہے وہ تو پہنچ گیا ہی، ہندوستان میں برطانوی پالیسی بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی!

امپی! تمہارے خلاف انہوں نے سارے کاغذات کمپنی کے حوالے کر دیئے ہیں!

وارن ہیسٹنگز! کارروائی شروع ہو چکی ہے — مگر میں بھی اس مردود برہمن کے خلاف ہتک عزت کا دعوےٰ کرنے والا ہوں!

امپی! ضرور کرو — اگر اس سے بہتر کوئی صورت ہو سکے تو وہ بھی کرو!

وارن ہیسٹنگز! اس سے بہتر بھی ایک صورت ہے۔

امپی! کیا!

وارن ہیسٹنگز! ایک سنگین اخلاقی جرم میں اس برہمن پاجی کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیئے۔

امپی! کیا ایسی صورت ہو سکتی ہے ہیسٹنگز؟

وارن ہیسٹنگز! یقیناً — اور میں اس کی تمام تیاریاں مکمل کر چکا ہوں۔ اور اسی سلسلے میں تمہیں آج بلایا ہے۔

امپی! مجھے تفصیل بتاؤ۔

وارن ہیسٹنگز! (فائل کو ہاتھ میں لے کر) یہ فائل میں نے اسی مقصد کے لئے حاصل کی ہے — آج سے کچھ عرصہ پہلے کلکتے کے ایک جوہری نے اس پاجی کے خلاف جعل سازی کی نالش کی تھی — اس وقت میں نے مداخلت کر کے اس مقدمے کو دبا دیا تھا!

امپی! تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟

وارن ہیسٹنگز! میں اسے ممنونِ احسان کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مقاصد کے لئے اسے استعمال کر سکوں! اس شخص کا لوگوں میں بڑا اثر و رسوخ ہے اور ظاہر ہے ایسے لوگ ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں!

امپی! ذرا تفصیل بتاؤ۔

وارن ہیسٹنگز! واقعہ یوں ہے کہ کلکتے کے ایک صراف بلاقی داس نے ۱۷۶۵ء میں اپنے وارثوں اور قرض خواہوں میں جائداد کی تقسیم کی وصیت کر دی تھی۔ اور اس کا مختار نامہ ایک جوہری موہن پرشاد کے نام لکھ دیا تھا۔ بلاقی داس کی موت کے بعد نند کمار نے ایک جعلی تحریر تیار کر کے بلاقی داس کی بیوی سے اڑتالیس ہزار ایک سو اکیس روپے وصول کرنا چاہے۔ حالانکہ وصیت نامہ میں نند کمار کا صرف دس ہزار کا قرضہ لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ موہن پرشاد نے اس کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ابھی مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میں نے مداخلت کرنی ضروری سمجھی اور نند کمار بری کر دیا گیا!

امپی! نند کمار کا اپنا بیان کیا تھا!

وارن ہیسٹنگز! وہ کہتا ہے کہ یہ رقم دس ہزار کے علاوہ ہے — اور بلاقی داس نے بقائمی ہوش و حواس اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے یہ تحریر لکھ کر دی تھی!

امپی! تمہارا خیال ہے کہ موہن پرشاد یہ مقدمہ میری عدالت میں دائر کر دے گا!

وارن ہیسٹنگز! یقیناً — میں نے سب کام مکمل کر لیا ہے۔

امپی! اس تحریر کا کوئی گواہ بھی تو ہو گا!

وارن ہیسٹنگز! اگر موہن پرشاد کو دوبارہ مقدمہ چلانے کی ترغیب دی جا سکتی ہے تو اس کے گواہ کو راہِ راست پر نہیں لایا جا سکتا؟

امپی! ضرور لایا جا سکتا ہے!

(دروازے کا ریشمیں پردہ ہٹا کر لیڈی ہیسٹنگز آتی ہے یہ تیس پینتیس سال کی جرمن نژاد عورت ہے۔ چہرہ نہایت دلکش ہے۔ پلکیں لمبی لمبی اور ہونٹ باریک ہیں۔ آنکھوں اور ہونٹوں پر ہر وقت ایک دلفریب مسکراہٹ چھائی رہتی ہے — لیڈی ہیسٹنگز دروازے میں رک کر مسکراتی ہے۔ ابھی اس کی نظر سر ایلیجا امپی پر نہیں پڑی،

وارن ہیسٹنگز! ابھی نہیں ڈارلنگ!

لیڈی ہیسٹنگز! اوہ — (مڑنے لگتی ہے۔ یکایک امپی کو دیکھ کر) ہیلو امپی

امپی! ہیلو! — سیر سے واپس آ گئیں!

لیڈی ہیسٹنگز! ابھی ابھی آئی ہوں — اچھا آپ کام کیجیے۔ گڈ نائٹ۔

امپی! گڈ نائٹ

(لیڈی ہیسٹنگز چلی جاتی ہے)

وارن ہیسٹنگز! ڈیڑ امپی۔ امید رکھو چند دن کے بعد یہ کیس پیش ہو جائے گا!

امپی! اگر ایسا ہو جائے تو نتیجہ بہت اچھا ثابت ہو گا!

وارن ہیسٹنگز! ایسا ہو گا اور ضرور ہو گا!

امپی! (دونوں ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر) اگر جعل سازی کا جرم ثابت ہو جائے تو یہ کمینہ برہمن زندہ نہیں رہے گا! اطمینان رکھو!

وارن ہیسٹنگز! مجھے ہر طرح اطمینان ہے ——

امپی! (اٹھ کر بیٹھا ہے) گڈ نائٹ

وارن ہیسٹنگز! گڈ نائٹ۔

(امپی جانے لگتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز دروازے تک اس کے ساتھ جاتا ہے۔ امپی کے جانے کے بعد وہ واپس آتا ہے۔ فائل پر سرسری نظر ڈالتا ہے اور صوفے میں نیم دراز ہو جاتا ہے ——

سکرین کے قریب، بارول آتا ہے (ہیسٹنگز اسے دیکھتا ہے)

وارن ہیسٹنگز! کیوں؟

بارول! آ گیا ہے۔

وارن ہیسٹنگز! GOOD

(وارن ہیسٹنگز کمرے سے نکل آتا ہے۔ بارول چند لمحے توقف کرتا ہے۔ جب وارن ہیسٹنگز دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے تو واپس جاتا ہے — وقفے کے بعد واپس آتا ہے تو اس کے ساتھ موہن پرشاد بھی ہے

موہن پرشاد لمبے قد کا سادہ آدمی ہے۔ نند کمار کی طرح دھوتی اور قمیض میں ملبوس ہے۔ چہرہ اس قسم کا ہے کہ اس پر کسی قسم کا تاثر نمایاں نہیں ہے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی —— بارول موہن پرشاد کو کرسی میں بٹھا دیتا ہے اور خود اس کے سامنے دوسری کرسی میں بیٹھ جاتا ہے

موہن پرشاد کرسی میں بیٹھتے ہوئے دو ڈبے جنہیں وہ اٹھائے ہوئے کمرے میں آتا ہے۔ تپائی پر رکھ دیتا ہے)

بارول! آپ کو پہلے کبھی لیڈی ہیسٹنگز سے ملاقات کا موقعہ نہیں ملا!

موہن پرشاد! جی نہیں۔

بارول! عجیب بات ہے۔ انہیں تو ہیروں اور جواہرات کا بے حد شوق ہے کلکتے کی شاید ہی کوئی ایسی جوہری کی دوکان ہو گی۔ جہاں وہ نہ گئی ہوں۔

موہن پرشاد! کئی مرتبہ میرا دل چاہا۔ کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی چیزیں پیش کروں —— مگر اس خیال نے روک دیا کہ شاید وہ پسند ہی نہ کریں۔

بارول! آپ کے پاس خاص چیز کیا ہے،

موہن پرشاد! ہار

بارول! ہار تو انہیں بے حد پسند ہیں۔

موہن پرشاد! پھر تو مجھے افسوس ہے کہ اب تک ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

بارول! خیر کوئی بات نہیں۔

(لیڈی ہیسٹنگز آتی ہے۔ اسے آتے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیڈی ہیسٹنگز موہن پرشاد کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔

بارول! (لیڈی ہیسٹنگز سے) کلکتے کے مشہور جوہری موہن پرشاد۔ کل انہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

لیڈی ہیسٹنگز! (NICE) مجھے افسوس ہے اس سے پہلے کبھی آپ کو بلا نہ سکی۔ دراصل مجھے آپ کی خبر ہی نہیں تھی۔

بارول! یہ خود کہہ رہے ہیں کہ کئی مرتبہ میرا دل اپنی چیزیں پیش کرنے کے لئے چاہا۔ مگر اس خیال نے روک دیا کہ شاید لیڈی ہیسٹنگز پسند نہ کریں!

لیڈی ہیسٹنگز! اچھی چیز مجھے کیوں نہ پسند ہو گی! —— (موہن پرشاد سے) آپ لے آئے ہیں ہار!

موہن پرشاد! جی ہاں! ملاحظہ فرمائیے:۔

(تپائی سے ڈبہ اٹھاتا ہے۔ اسے کھولتا ہے اور ہار نکال کر لیڈی ہیسٹنگز کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز! BEAUTIFUL

بارول! پسند ہے آپ کو

لیڈی ہیسٹنگز! اور بھی دکھائیے — (نام بھول جاتی ہے)

بارول! ان کا نام موہن پرشاد ہے۔

لیڈی ہیسٹنگز! (خاص انداز سے مسکرا کر موہن پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے) مسٹر موہن پرشاد!

موہن پرشاد! بہت بہتر!

(موہن پرشاد دوسرے ڈبے سے ہار نکال کر لیڈی ہیسٹنگز کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز! (بہت اچھا) یہ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ پسند ہے۔

بارول! دونوں پسند ہیں آپ کو!

لیڈی ہیسٹنگز! ہاں! دونوں پسند ہیں۔

بارول! تو انہیں ضرور خرید لیجئے۔

لیڈی ہیسٹنگز! ضرور مسٹر موہن پرشاد! آپ کو جب کبھی آنا ہو — فوراً آ جایا کیجئے — میں ان دونوں ہاروں کو خرید لوں گی — دو لاکھ ٹھیک ہے قیمت —

موہن پرشاد! (گھبرا کر — اُسے اتنی قیمت کا کبھی تصور تک بھی نہیں ہو سکتا تھا) جی! —

(لیڈی ہیسٹنگز بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

بارول! موہن پرشاد! تم خوش نہیں ہو کیا —!

موہن پرشاد! (بے اختیار ہاتھ جوڑ کر) میں — بہت خوش ہوں!

لیڈی ہیسٹنگز! آپ آئندہ بھی آتے رہیں گے نا!

موہن پرشاد! جی ضرور۔ خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا! آپ نے —— (اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرے) ضرور آتا رہوں گا۔

بارول! مسٹر موہن پرشاد! یہ نند کمار آپ کا عزیز ہے کوئی۔

موہن پرشاد! جی ہاں — مگر عرصہ ہوا ہمارے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔

لیڈی ہیسٹنگز! بہت چالاک آدمی ہے۔

موہن پرشاد! جی ہاں! آج کل گورنر جنرل کو بدنام کر رہا ہے۔

بارول! یہ شخص تمہارا بھی دشمن ہے۔

موہن پرشاد! جی ہاں۔

بارول! دشمنی کی وجہ کیا ہے؟

موہن پرشاد! یہ شخص چاہتا تھا کہ بلاقی داس اسے اپنی جائداد کا مختار بنا دے۔ مگر اس نے اپنی وصیت میں مجھے مختار نامہ دے دیا۔

لیڈی ہیسٹنگز! یہ شخص ہر شریف آدمی کا دشمن ہے۔ ہاں مسٹر پرشاد! تم نے اس کے خلاف مقدمہ بھی کیا تھا۔

موہن پرشاد! کیا تھا مگر کچھ نہ ہو سکا۔ گورنر جنرل نے دخل دے کر اسے بچا لیا۔

لیڈی ہیسٹنگز! ایسے شخص کو تو کبھی نہیں بچانا چاہیے تھا۔

بارول! بس تو اب مسٹر موہن پرشاد! کلکتے میں جو نئی عدالتِ عالیہ قائم ہوئی ہے۔ آپ اس پر اس عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں!

موہن پرشاد! (ہچکچاتے ہوئے) جی!

لیڈی ہیسٹنگز! یہ عدالت پہلی جیسی عدالت نہیں ہے۔ آپ ضرور مقدمہ جیت لیں گے!

بارول! ہمارا مشورہ یہی ہے۔

(بارول لیڈی ہیسٹنگز کی طرف خاص انداز سے دیکھتا ہے۔ لیڈی ہیسٹنگز تپائی پر سے رومال ہٹا دیتی ہے۔ تپائی پر نوٹوں کے بنڈل پڑے ہیں)

لیڈی ہیسٹنگز! یہ لیجئے —

موہن پرشاد! (خوشی سے چہرہ سرخ ہو گیا ہے) شکریہ

بارول! مسٹر موہن پرشاد! بہتر ہے کہ آپ مقدمہ دائر کر دیں۔ آپ کو ضرور کامیابی ہو گی —— یہ آپ کا بھی دشمن ہے —— ہر شریف آدمی کا دشمن ہے۔ ضرور مقدمہ دائر کیجئے!

موہن پرشاد! ضرور کروں گا۔

لیڈی ہیسٹنگز! او تھینک یو (یک لخت اپنی غلطی کا احساس کر کے) مسٹر پرشاد! آپ آئندہ بھی آتے رہیں گے نا!

بارول! (جلدی سے) ضرور آتے رہیں گے

موہن پرشاد! کیوں نہ آؤں گا — یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ بہت ہی اچھے

اور مہربان ہیں۔

لیڈی ہیسٹنگز! (مسکرا کر) اور یہ آپ کا نند کمار۔ تو ہمیں بہت بُرا ثابت کر رہا ہے۔

موہن پرشاد! بے وقوف ہے۔ کمینہ کہیں کا

بارول! مسٹر موہن پرشاد، ہندستان میں جہاں تم جیسے نیک اور اچھے آدمی ہیں وہاں نند کمار جیسے غیر ذمّے دار لوگ کیوں ہیں۔

لیڈی ہیسٹنگز! ہمیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسی کو نقصان ہوگا۔ بھلا لوگ ہمیں جانتے نہیں۔ ہم کیوں رشوت لیں گے؟

بارول! جعل سازی خود کرتا ہے۔

لیڈی ہیسٹنگز! ایسے آدمی کو سزا ملنی چاہیئے۔

موہن پرشاد! ضرور ملے گی۔ میں دوبارہ مقدّمہ دائر کر دوں گا۔

لیڈی ہیسٹنگز! اور کیا۔ ایسی بُری باتیں کر کے خواہ مخواہ ہندوستانیوں کو بدنام کر رہا ہے۔

موہن پرشاد! تو اب مجھے اجازت دیجیئے۔

لیڈی ہیسٹنگز! اچھا۔

(موہن پرشاد نوٹوں کے بنڈل اٹھانے لگتا ہے۔ لیڈی ہیسٹنگز بارول کی طرف مُسکرا کر دیکھتی ہے)

تیسرا منظر

منظر! (کلکتے کی عدالتِ عالیہ:۔ جولائی کا آخری ہفتہ ۔۔۔ گرمی پورے شباب پر ہے۔

اپنی مخصوص کرسیوں میں عدالتِ عالیہ کے چاروں جج بیٹھے ہیں چاروں کے سروں پر وگ ہیں۔ درمیان میں سَر ایلجا امپی ہے۔ دائیں جانب ہائڈ اور چیمبرس ہے۔ اور بائیں طرف لیمسٹر۔ کمرے میں چاروں طرف لوگ کھڑے ہیں۔ جو بڑی بے تابی سے سر ایلجا امپی کی طرف دیکھ رہے ہیں، جو فیصلہ لکھ رہا ہے

مجرموں کے کٹہرے میں نند کمار کھڑا ہے۔ نند کمار کے چہرے پر تھکاوٹ اور اضمحلال نمایاں ہے مگر اس کے باوجود اس کے رعب جلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

لوگ سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ بے چینی سے چیف جج کو دیکھتے بھی جاتے ہیں۔

اس طرح چند لمحے گذر جاتے ہیں۔ سر ایلجا امپی قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔

"سنو سنو"، "دیکھو" "خاموش" کہتی ہوئی آواز بلند ہوتی ہے

سر ایلجا میز پر ہاتھ مارتا ہے)

سر ایلجا امپی! خاموش حضرات!

(مکمّل خاموشی چھا جاتی ہے)

اِس مُقدّمے کو شروع ہوئے کئی دن گذر چکے ہیں۔ عدالت نے اس کے ہر پہلو پر پوری طرح غور کیا ہے کلکتّے کے جوہری موہن پرشاد نے کلکتے کے سابق صوبیدار نند کمار پر یہ الزام لگایا ہے کہ نند کمار نے اڑتالیس ہزار ایک سو اکیس روپے کے لئے جعلی دستاویز تیار کی ہے۔ نند کمار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دستاویز اصلی ہے اور اس پر متوفّی بلاقی داس کے جو دستخط ہیں وہ جعلی نہیں ہیں۔

یہ مُقدّمہ آج سے ساڑھے تین سال پہلے ایک مقامی عدالت میں چل چکا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ نہیں ہُوا تھا ۔۔۔ اس عدالت میں یہ مقدّمہ دُوسری مرتبہ دائر کیا گیا ہے ۔۔۔ عدالت نے ہر ممکن طریقے سے اس مُقدّمے پر غور کیا ہے اور عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ موہن پرشاد نے نند کمار پر جو الزام لگایا ہے وہ درست ہے۔ نند کمار فی الواقعی جعلسازی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ انگلستان میں اس جرم کی سزا موت ہے۔ عدالت اسی سزا کا یہاں اعلان کرنے پر مجبور ہے۔ نند کمار، عمر ساٹھ سال، ذات برہمن کو جعل سازی کے جُرم میں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے

(یہ الفاظ سنتے ہی لوگوں کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جیسے وہ زلزلے کا جھٹکا محسوس کر رہے ہوں۔

نند کمار کا چہرہ یک لخت ہلدی کی طرح زرد پڑ جاتا ہے۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔ اور وہ سہارا لینے

کے لئے کٹہرے کو تھام لیتا ہے —— دو چار لمحوں کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے۔ لوگوں کی شعوری کیفیت جاگنے لگتی ہے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ ایک دوسرے کی طرف مستفسرانہ دیکھ رہے ہیں۔ اور نگاہوں ہی نگاہوں میں پوچھ رہے ہیں۔ "واقعی یہ فیصلہ ہو گیا ہے —" واقعی ایسا ہو گیا ہے؟

دو چار لمحے اور گذر جاتے ہیں

"پھانسی کی سزا جعل سازی کی سزا موت —"

اور اسی قسم کے فقرے بلند ہو رہے ہیں۔

سر ایلیجا فیصلے کے کاغذ سے نگاہیں ہٹالیتا ہے سرسری طور پر لوگوں کو دیکھتا ہے۔

ایک لمحے کے لئے پھر خاموشی چھا جاتی ہے —— اس کے بعد وہی الفاظ کہتی ہوئی رکی رکی۔ گھٹی گھٹی آوازیں ابھرنے لگتی ہیں۔

نند کمار کا جھکا ہوا سر ایلیجا کی طرف مڑتا ہے۔ اس کی آنکھیں اب سرخ ہیں۔ گردن اکڑی ہوئی ہے۔ لوگ خاموش ہو کر بڑی بے تابی سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

نند کمار! مسٹر ایلیجا میں نے اپنی موت کا فیصلہ سن لیا ہے میں جانتا ہوں یہ قانون کا فیصلہ نہیں ہے (آواز میں جوش بڑھتا جا رہا ہے) یہ انصاف کا فیصلہ نہیں ہے۔ بلکہ گورنر جنرل کے انتقام کا فیصلہ ہے — گورنر جنرل اور چیف جسٹس کی سازش کا فیصلہ ہے!

سر ایلیجا! مجرم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اس قسم کی باتیں کرنا فضول ہے قانون اور انصاف نے جو فیصلہ کیا ہے —— عدالت نے اسی فیصلے کا اعلان کر دیا ہے!

نند کمار! تم اسے انصاف کہتے ہو —؟ اگر یہ انصاف ہے تو دنیا میں ناانصافی کس چیز کا نام ہے؟

سر ایلیجا! عدالت نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے — مجلس برخاست ہوتی ہے (اٹھنے لگتا ہے)

نند کمار! مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ ضرور کہوں گا۔

(لوگوں کا شور۔ "سنو" "سنو" کی آوازیں)

سر ایلیجا! یہ عدالت ہے کوئی تماشہ نہیں ہے!

نند کمار! اب تک جو کچھ ہوا ہے۔ اس کی حیثیت کٹ پتلیوں کے تماشے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے —— کیا مجھ جیسے مالدار شخص کے خلاف اتنی حقیر رقم کے لئے جعل سازی کا مقدمہ کرنا تماشہ نہیں تو اور کیا ہے اب تک جتنے لوگ یہاں آکر بولتے رہے ہیں وہ صرف کٹ پتلیاں تھے۔ جو گورنر جنرل اور اس کے ساتھیوں کے اشاروں پر ناچتے رہے ہیں۔ اس سارے کھیل —— اس سارے تماشے کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ گورنر جنرل کے مخالف کو راہ سے ہٹا دیا جائے — اسے کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ اور آج یہ مقصد پورا ہو گیا ہے — موہن پرشاد اور اس جیسے دوسرے کمینہ اور ذلیل فطرت لوگوں کو جس کام کے لئے رشوت دی گئی تھی —— وہ کام ختم ہو گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں آج ہی نند کمار کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ چلانے کی کیوں ضرورت پیش آئی —— جب ایک مرتبہ مقامی عدالت نے اسے داخل دفتر کر دیا تھا۔ تو پھر اتنے عرصے کے بعد اسے زندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت صرف یہ تھی کہ گورنر جنرل اپنے مخالف کو موت کے حوالے کر کے اپنی مخالفت کے طوفان کو دبا دینا چاہتا تھا اور میری موت کے بعد مخالفت کا یہ طوفان خود بخود دب جائیگا! مگر گورنر جنرل کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ چیف جسٹس کے فیصلہ صادر کرنے کے بعد یہ مقدمہ ختم نہیں ہو جاتا — یہ مقدمہ دوبارہ ہوگا — میری موت کے بعد ہوگا اور اس وقت ہوگا۔ جب میرے ہموطن تم لوگوں کو — تم سفید چمڑی والے مکار تاجروں کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ اس وقت تمہاری جگہ مجرموں کے کٹہرے میں ہوگی۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مجرم نند کمار تھا جس کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ کیا گیا تھا یا وارن ہیسٹنگز اور سر ایلیجا امپی تھے۔ جنہوں نے سازش کر کے ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا تھا — تم نے میرے وطن میں چوروں اور ڈاکوؤں

کی طرح لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ آج جاری ہے کل جاری نہیں رہے گی۔ وقت آنے پر تمہیں اس طرح اس سرزمین سے نکال دیا جائے گا جس طرح چوروں اور ڈاکوؤں کو گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ آج تمہیں موقع ملا ہے ظلم پر ظلم کرتے جاؤ ۔۔۔ بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکاتے رہو۔۔۔ اور ہم میں پھوٹ ڈال کر فائدہ اٹھاتے رہو۔ مگر وہ وقت آنے والا ہے جب یہی لوگ جنہیں تم بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے ہو۔۔۔ تمہیں مکّار غاصب اور لٹیرا سمجھ کر یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیں گے ۔۔۔ تم مجھے مار کر بھی نہیں مار سکو گے۔۔۔ میں مر مر کر جیوں گا۔۔۔

جی جی کر مروں گا۔۔۔!

(لوگوں کا ہجوم بے قرار ہو جاتا ہے۔ فضا میں آوازیں گونجنے لگتی ہیں ”یہ ظلم ہے“۔۔ ”یہ زیادتی ہے“۔۔۔ اپنا فیصلہ بدلو“ سر ایلیجا امپی کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔

ہائڈ جلدی سے اٹھ کر میز پر ہاتھ مار کر لوگوں کو خاموش ہونے کے لئے کہتا ہے

شور ختم جاتا ہے)

ہائڈ! حضرات! عدالت اس فیصلے پر غور کرے گی۔

(”کب کب“ کا شور ہونے لگتا ہے)

ہائڈ! (میز پر ہاتھ مار کر) چند دن تک ۔ آپ مطمئن رہیں!

(سپاہی نند کمار کے گرد حلقہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ بڑے وقار اور تحمل کے ساتھ قدم اٹھانے لگتا ہے۔ جب تک وہ دروازے سے باہر نہیں نکل جاتا۔ لوگ طرح طرح کے فقرے کستے رہتے ہیں۔ نند کمار جب دروازے سے باہر نکل جاتا ہے تو سر ایلیجا امپی اور دوسرے جج بھی روانہ ہو جاتے ہیں۔ لوگ ابھی تک کھڑے ہیں۔)

چوتھا منظر

منظر! (جیل خانے کا بلند آہنی اندر مقفل دروازہ دروازے کے سامنے لوگوں کا ہجوم)

دن! ۵۔ اگست۔ بروز ہفتہ ۱۷۷۵ء عیسوی

وقت! صبح کے سات بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں۔ روشنی پوری طرح پھیلی نہیں۔ فضا میں گھٹن اور بوجھل پن۔ ہوا رک رک کر چل رہی ہے۔ بہت آہستہ جیسے شکستہ پا ہو۔ ہجوم میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی اور بچے بھی۔ سب دروازے کے سامنے کھڑے ہیں سب کے چہروں پر غم و ملال کے گہرے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔

عورتیں رو رہی ہیں اور بچے ان کی دیکھا دیکھی، حادثے کا اندازہ کئے بغیر سر جھکائے اس طرح خاموش کھڑے ہیں جیسے اُن کے معصوم دلوں پر غم کا بوجھ آ پڑا ہو۔ نگاہیں بار بار آہنی دروازے کی طرح اٹھتی ہیں۔ اور پھر خود بخود جھک جاتی ہیں۔

ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ لوگوں کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا ہے

سرگوشیوں کی گھٹی گھٹی کیفیت میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک عورت کے رونے کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک اس قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔ جیسے بہت سی عورتیں ایک ساتھ سسکیاں بھر رہی ہیں!

دور سے کلاک سات بجنے کا اعلان کرتا ہے:۔۔۔

مکمل سکوت پھیل جاتا ہے۔ کلاک کی آواز اس بوجھل سکوت میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی ہے۔۔۔ ابھر ابھر کر پھر ڈوب رہی ہے۔

ہجوم میں اضطراب کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے سمندر کی سطح پر طوفان برپا ہو جائے۔

سب دروازے کی طرف بھاگتے ہیں۔۔۔ مرد، عورتیں، بچے۔۔۔ سب کے سب

دروازے کے دونوں پٹ ایک دوسرے سے جدا ہونے لگتے ہیں۔

غم و اندوہ کی بجائے اضطراب اور بے چینی چھا گئی ہے — دل دھڑک رہے ہیں۔ آنکھیں پھیل گئی ہیں۔ اور فضا پر ایک اضطراب انگیز سکوت مسلّط ہے۔

سپاہی لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہیں — مگر ہجوم ہے کہ پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ" ایک سپاہی للکارتا ہے۔ مگر ہجوم کے اضطراب اور جوش میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یک لخت سب کے سب اپنی جگہ پر رک جاتے ہیں۔ سانس روکے نگاہیں دروازے کے اندر جمائے — بے حس و حرکت۔ نندکمار دروازے پر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا جلال اور ایک ایسی عظمت نمایاں ہے کہ دیکھنے والے فرطِ احترام سے بے اختیار نگاہیں جھکا لیتے ہیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر فکر و ملال کا ہلکا سا غبار بھی نہیں ہے۔ آنکھوں میں سرخی جھلک رہی ہے۔ اور اس سے اُس کے چہرے کے جلال میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

لوگوں پر ایسی مرعوبیت طاری ہو گئی ہے کہ سب رونا دھونا بھول گئے ہیں — خاموش کھڑے ہیں — کسی کو یہ احساس نہیں ہے — کہ کیا ہونے والا ہے — کیا ہو رہا ہے —

نندکمار قدم اُٹھاتا ہے — ایک عورت روتی ہوئی آتی ہے۔ اور اس کے قدموں میں گر پڑتی ہے۔ نندکمار اسے اٹھاتا ہے — عورت سسکیاں بھرنے لگتی ہے

نندکمار مجمع کی طرف دیکھتا ہے — اور اپنے صاف، خلوص سے لبریز اور بلند آواز میں کہنے لگتا ہے —

نندکمار — تمہیں رونا نہیں چاہیئے — تم کیوں رو رہے ہو۔ اس لئے کہ میں مر رہا ہوں — میں مر رہا ہوں ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے — میں ہمیشہ گناہِ بے گناہی کا داغ بن کر دارن ہیسٹنگز اور امپی کی پیشانیوں پر نمایاں رہوں گا۔

(آواز میں جوش) میں آج گوشت پوست کا کوئی انسان نہیں ہوں۔ بلکہ ایک آدرش ہوں — اجنبی قوت کی ناانصافی، ظلم اور لوٹ کھسوٹ کو مٹا دینے والا آدرش ہوں — یہ آدرش زندہ رہے گا — نندکمار زندہ رہے گا۔ اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے خوشی خوشی اپنی راہ پر جانے دو۔

(لوگوں کی نگاہیں اُس کے پُرعظمت اور باوقار چہرے پر جمی ہیں۔ سب کے سب سانس روکے بُت بنے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں — نندکمار دونوں بانہوں کو ہوا میں اس طرح لہراتا ہے — جیسے کہہ رہا ہو مجھے جانے کے لئے راستہ دو۔ لوگ درمیان میں راستہ بنا دیتے ہیں —

ایک بچہ آتا ہے اور اس کی ٹانگ سے لپٹ جاتا ہے یہ نندکمار کا پوتا ہے۔ نندکمار اُسے گود میں اٹھاتا ہے پیار کرتا ہے اور اسے سسکیاں بھرتی ہوئی ماں کی گود میں دے دیتا ہے۔

نندکمار چلا جا رہا ہے — پھانسی کے تختے کی طرف قدم اٹھا رہا ہے۔ بغیر رُکے۔ بغیر لغزش کے۔ اس بہادری کے ساتھ گویا موت کی طرف نہیں نئی زندگی حاصل کرنے جا رہا ہے۔

آہ و زاری بلند ہو رہی ہے چیخیں بلند ہو رہی ہیں عورتیں فرطِ صدمہ سے نڈھال ہو ہو کر گر رہی ہیں — بچے بلک رہے ہیں

فضا میں سسکیوں سے، چیخوں سے ایک ہنگامہ برپا ہے — اور رونے والوں کے درمیان، چیخنے والوں کے قریب نندکمار اُسی ہمت و جرأت کے ساتھ قدم اٹھائے جا رہا ہے جس ہمت و جرأت کے ساتھ اُس نے کونسل کے سامنے گورنر جنرل کے خلاف رشوت کا الزام لگایا تھا —)

پانچواں منظر

اسی دن - ساڑھے نو بجے

وارن ہیسٹنگز کا ڈرائنگ روم

کمرے میں وارن ہیسٹنگز، سر ایلیجا امپی اور لیڈی ہیسٹنگز ایک میز کے گرد، کوچ میں بیٹھے ہیں۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور پیگ نظر آ رہے ہیں دورِ شراب جاری ہے۔ تینوں کے چہروں پر فتحمندانہ مسرت کی سُرخی نمایاں ہے!

وارن ہیسٹنگز! (خالی پیگ رکھ کر دوسرا پیگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) اس ملک میں ہماری پالیسی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی!

امپی! اس میں کیا شک ہے

وارن ہیسٹنگز! یہ پاگل کونسل اس پالیسی کو نہیں سمجھ سکی ——— بالکل فول (FOOL)

امپی! اس سے بہتر پالیسی اس ملک کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ دو آدمیوں کو لڑا دو اور پھر ان کے ہاتھوں میں بندوقیں دے دو۔ جو مر جائے گا وہ موت کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ اور جو نڈھال ہو کر آسرا ڈھونڈے گا۔ وہ یقیناً ہمارے قبضے میں آ جائے گا ——

EXCELLANT POLICY -- (دوسرا پیگ اٹھاتا ہے)

لیڈی ہیسٹنگز! MIRACLE —— (ہنس پڑتی ہے)

امپی! اس معاملے میں لیڈی ہیسٹنگز نے بھی کافی اہم پارٹ، ادا کیا ہے

وارن ہیسٹنگز! (لیڈی ہیسٹنگز کی طرف محبّت انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) VERYNICE WOMAN

(بارول آتا ہے - اس کا چہرہ کچھ فکرمند ہے)

امپی! ہیلو! مائی ڈیئر بارول! اتنی دیر سے کیوں آئے تم؟

وارن ہیسٹنگز! مر گیا پاجی برہمن (غصّے میں پیگ پرے پھینک دیتا ہے)

بارول! (کرسی میں بیٹھتے ہوئے) عجیب واقعہ!

لیڈی ہیسٹنگز! بارول بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں!

بارول! میں ساری زندگی میں نہیں بھول سکتا — بلا کا بہادر انسان

وارن ہیسٹنگز! (پیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) چھوڑو اب اس قصّے کو۔ مرگیا نا وہ بدمعاش!

بارول! مرگیا مگر کس جرأت — کس بہادری کے ساتھ — میں اس کی موت کے واقعے کو کبھی نہیں بھول سکوں گا! میں جیل سے پھانسی کے میدان تک اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں دیکھی۔

امپی! — بہت خوفناک انسان تھا — ایسے شخص ملکوں میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز! (تیزی سے پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے) DAMN

امپی! ہمیں ایک بہت بڑے اور خطرناک دشمن سے نجات ملی ہے۔

بارول! — آپ کچھ کہیں۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اُس جیسا بہادر انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ موت سے وہ ڈرتا ہی نہیں تھا۔ پھانسی کے تختے کی طرف اس طرح قدم اٹھا رہا تھا جیسے — جیسے موت کی طرف نہیں زندگی کی طرف جا رہا ہے۔ نہ تو اس کی ٹانگوں کو لغزش ہوئی اور نہ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ جیسا تھا ویسے کا ویسا رہا — سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے اُس نے بیٹے کو گلے سے لگایا۔ اور بے خوف و خطر، صاف اور پُرجوش لہجے میں بولا "میری نصیحت اور تمام ہندوستانیوں کو یہی وصیّت ہے کہ ان سفید چمڑی والے ڈاکوؤں کو جلد سے جلد اپنے ملک سے نکال دو"

وارن ہیسٹنگز! (غصّے سے خالی پیگ پرے پھینکتے ہوئے) پاجی!

بارول! یہ کہتے ہوئے جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں سُرخی دوڑ گئی — جیسے بجھی ہوئی آگ یک لخت بھڑک اُٹھے۔ اُسے ہم سے سخت نفرت تھی — وہ ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن تھا — میں چاہتا تھا کہ اُسے جلدی جلدی ختم کر دیا جائے۔ مبادا اس کے الفاظ اس نازک موقعے پر لوگوں میں بغاوت کی آگ لگا دیں۔

وارن ہیسٹنگز! ابھی نہیں — ابھی بیسیوں نند کماروں کی ضرورت ہے

بارول! اُس نے آخری وقت میں بھی کہا تھا — "میں مر نہیں رہا۔ میں مر مر کر جیوں گا — جی جی کر مروں گا" اور اس کے بعد

اس نے بیٹے کو رخصت کر دیا۔ بیٹے کا بُرا حال تھا۔ رنج و غم میں وہ اس قدر نڈھال ہو گیا تھا کہ اُس سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جاتا تھا ۔۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ کئی لوگوں نے اُسے سنبھالا اور اسے لے جانے لگے ۔ مگر نند کمار اُسی طرح کھڑا رہا جس طرح کھڑا تھا اس نے کسی کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ نند کمار چپ چاپ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔۔ اُسے کامل یقین تھا کہ اس کی موت شہادت ہو گی اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُس نے خود اپنی پشت پر ہاتھ رکھ دیئے جب اُس کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تو اُس کے چہرے پر سیاہ کپڑا باندھا جانے لگا ۔ اُس نے سیڑھیوں پر چڑھتے وقت کسی سہارے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس وقت بھی اس کی ٹانگوں میں لغزش نہ ہوئی ۔ اُس وقت میں اپنے اندر ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میں اُس کی بہادری سے متاثر تھا یا کسی مبہم خوف سے۔ میں کہہ نہیں سکتا ۔۔ سُولی کا تختہ ہٹا دینے کے ڈھائی منٹ بعد لاش زمین پر آ پڑی۔ میرے دل میں بڑی خواہش تھی کہ اُس کا مردہ چہرہ دیکھوں مگر میں دیکھ نہ سکا ۔۔ لاش فوراً جلانے کے لئے برہمنوں کے حوالے کر دی گئی ۔۔

لیڈی ہیسٹنگز ! (متاثر ہو کر) BRAVE MAN

وارن ہیسٹنگز ! (بدستور غیر متاثر حالت میں) جل گئی لاش ؟

بارول ! ہاں !

(شور سنائی دیتا ہے)

ایپی ! یہ کیسا شور ہے ؟

بارول ! شاید وہ لوگ ہیں !

(کھڑکی کی طرف جاتا ہے اور نیچے دیکھنے لگتا ہے)

وارن ہیسٹنگز ! کونسے لوگ ؟

بارول ! (واپس آکر) وہ لوگ احتجاج کر رہے ہیں !

ایپی ! (گھبرا کر) زیادہ لوگ ہیں !

وارن ہیسٹنگز ! احتجاج کرنے آ گئے ہیں ۔ پاجی

لیڈی ہیسٹنگز ! (گھبرا کر) وہ کیا کہیں گے ۔۔ وہ کیا کرنے آ گئے ہیں !

وارن ہیسٹنگز ! (مطمئن لہجے میں) کوئی فکر نہ کرو ۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب کچھ ٹھیک ہے ۔ بے فکر ہو کر پیو ۔۔ خوب دل کھول کر عیش کرو۔ ہمیں نکالنے کے لئے ایک نند کمار نہیں ہزاروں نند کماروں کی موت کی ضرورت ہے۔ ہزاروں نند کمار مریں گے۔ جب کہیں جا کر انگریز قوم ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گی ۔ آج ایک نند کمار کے مقابلے میں یہاں ہزاروں موہن پرشاد موجود ہیں ۔۔ اور ہماری کامیابی یہی ہے ۔ کہ ہم موہن پرشادوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جائیں ۔۔ دوستو ! مزے سے پیتے جاؤ ۔ مزے سے پیتے جاؤ

(وارن ہیسٹنگز نیا پیگ اٹھا کر منہ سے لگا لیتا ہے۔ بارول ایپی اور لیڈی ہیسٹنگز اس کی طرف دیکھ رہے ۔۔ نیچے شور برپا ہے)

(پردہ)

انتظاریہ

ابنِ انشا

ممتاز شیریں

مختار صدیقی

حامد عزیز مدنی

منظر سلیم

سلطانہ قمر

عالم سیاہ پوش

غلام ربانی تاباں

سید رضی ترمذی

قتیل شفائی

ہمارے ساتھی

ابنِ انشا:- شاعر، طنز نگار۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد زرعی تحقیقات کے ایک ادارے سے متعلق ہو کر دہلی چلا گیا۔ اور وہاں سے آل انڈیا ریڈیو پہ آ گیا۔ آجکل ریڈیو پاکستان سے متعلق ہے۔ چین اس کا محبوب ترین موضوع ہے۔ چین کی سیاست اور ادب کے معاملے میں اس کا اندازِ نظر خالصتہً معروضی ہوتا ہے کسی مخصوص مدرسۂ فکر سے وابستہ نہیں۔ اپنے آپ کو ہیومنسٹ Humanist کہتا ہے۔ اب تک اس کی مختصر اور رومانی نظمیں چھپی ہیں جو چینی نظموں کی یاد دلاتی رہی ہیں۔ لیکن اب کے اس نے جدید ترین چین کا ایک موضوع لیا ہے۔ شنگھائی جہاں وہ کتنے ہی دن ذہنی طور پر کوچہ گردی کر چکا ہے۔

ممتاز شیریں:- "نیا دور" کی مدیرہ۔ افسانوی ادب کی نہایت کامیاب نقاد۔ انکے تنقیدی مقالات پڑھ کر لوگ چونک چونک اُٹھتے ہیں۔

مختار صدیقی:- پنجاب کا سلجھا ہوا ادیب اور شاعر —— جسے ہزاروں میں گڈمڈ کر دیجئے۔ تو بھی اس کا منفرد لب و لہجہ پکار اُٹھے گا۔ "یہ مختار صدیقی" ہے۔ مختار کا اندازِ سخن اپنا ہے۔ وہ نظم میں کسی کی پیروی نہیں کرتا۔ لیکن غزل میں وہ بھی بعض دوسرے شعراء کی طرح میر کے رنگ میں رنگا دکھائی دیتا ہے۔

حامد عزیز مدنی:- سی۔ پی کا خوش فکر اور بلند نظر شاعر جو آجکل کراچی میں کسی کالج کا پروفیسر ہے۔ اس کی شاعری محض کھوکھلا کھلونا نہیں ہے بلکہ زندہ حقائق سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ اسکی نظموں میں ایک گہرائی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

منظر سلیم:- لکھنؤ کے ترقی پسند فنکاروں میں نمایاں حیثیت رکھنے والا نوجوان شاعر۔ جس کی شاعری جوان امنگوں اور تازہ ولولوں سے عبارت ہے۔ اُسے پُرانے خیالات و روایات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی فکر و نظر نئے نئے موضوعات و اسالیب کی تلاش میں رہتی ہے۔

سلطانہ قمر:- ایک پُراسرار خاتون —— جسے اوائل جوانی کے بعض حادثوں نے دوآبے کی سرزمین سے اُٹھا کر زندگی کے گوشہ ہائے پنہاں میں کچھ اس بے دردی سے گھمایا۔ کہ وہ چکراتی، لڑکھڑاتی جگہ جگہ بھٹکتی پھری۔ اور اب وہ پورے سماج سے انتقام لینے پر تُلی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسا زہریلا تیر بن چکی ہے جو کبھی خالی نہیں جاتا۔ بلکہ اس کا نشانہ کئی کئی پشتوں کے سینے چھیدتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

عالم سیاہ پوش:- غیر شاعرانہ تخلص اور غیر معمولی خیالات کا مالک ہنس مکھ دوست، جو کبھی ہاتھوں کی ریکھائیں دیکھا کرتا تھا۔ اب گردش حالات میں شاعری کا چولا پہن کر زندگی سے سمجھوتہ کرنے لگا ہے۔ ہر چند کہ اس کا موجودہ نام اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حادثے سے رسوا بھی ہو چکا ہے۔ لیکن اسے پھر بھی اپنے غیر شاعرانہ نام سے ویسی ہی محبت ہے جیسی پہلے تھی۔ اسے لاکھ سمجھایئے لیکن وہ اپنا نام بدلنے پر رضامند ہونے کے بجائے آپ سے کھچا کھچا سا رہنے لگے گا —— جانے کیوں؟

غلام ربانی تاباں:- ہندوستان کی قومی حکومت کا عوامی اسیر جسے ترقی پسند ہونے کے جرم میں ہندوستان کی نوکرشاہی نے زندگی کی تمام راحتوں سے محروم کر رکھا ہے۔ اور وہ ان دنوں جیل کی چار دیواری میں اپنی حکومت کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر سے لطف اندوز ہو رہا ہے اس کا آرٹ خلوص اور محبت کی بنیادوں پر قائم ہے۔

رضی ترمذی:- لاہور کے ادبی حلقوں میں ایک خاص شہرت کا مالک۔ جسے فرائڈ کے نظریہ جنسیات کے تحت اپنی نظمیں تخلیق کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ یہ نرم و نازک بدن کا دُبلا پتلا نوجوان آجکل ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے مصروف کار ہے

شنگھائی

ابنِ انشا

شنگھائی جو چین کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور دنیا کی تیسری سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اپنی شبانہ عشرت گاہوں اور کلبوں کے لئے مشہور ہے۔ لیکن ان کلبوں کے دروازوں کے آگے شنگھائی کے فٹ پاتھوں پر ہر سال اوسطاً بتیس ہزار انسان بھوک اور سردی سے جان دے دیتے ہیں۔ شنگھائی میں مزدوروں کو بارہ سے سولہ گھنٹے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اُن کا افلاس اور بد حالی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہڑتال کرنے اور کرانے کی سزا اکثر موت ہوتی ہے۔ شنگھائی میں قدم قدم پر بد ہیئت مائیں زرد اور نحیف و نزار بچوں کو گٹھڑیوں کی صورت میں پیٹھ پر ڈالے اپنے استخوانی ہاتھ پھیلا کر صدا لگا رہی ہوتی ہیں "کم شا مسٹر نو چو چو" بابا اک پیسہ دے جاؤ۔ ماں صدا لگاتی ہے اور پھر پیٹھ پر جکڑا ہوا بچہ اسے دہراتا ہے۔ آگے چلتے تو ہزاروں لوگ گروہ در گروہ دیواروں کے ساتھ دبکے، اپنے سر گھٹنوں پر ٹیکے پیلی پیلی بے جان آنکھیں نکال کر چپ چاپ —— زبان بے زبانی میں بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔ اور اپنی ہتھیلیاں موہوم امید میں آسمان کی جانب اٹھائے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

اس شہر کی بین الاقوامی بستی میں جو غیر ملکیوں کا مرکز ہے۔ ایک باغ کے دروازے پر برسوں یہ بورڈ آویزاں رہا ہے۔

DOGS AND CHINESE NOT ALLOWED

شام کے گہرے سائے کیوں پیغام اُداسی کا لے آئے
درد جو دل میں جاگ اُٹھے پھر دل بہلے کس کے بہلائے
ہوٹل کی چھت پر لیٹا ہوں ، جانے کیا کیا سوچ رہا ہوں
کروٹ کروٹ بات وہی ہے ، نیند کسی پہلو بھی نہ آئے
دیس پرایا ، دوست نہ بیلی ، حال کہوں تو کس سے کہوں میں
کون سمندر چیر کے آئے ، میری لگی کو آکے بجھائے

بائیں بازو کے گرجا کے گھڑیال میں گیارہ بج بھی چکے ہیں
بازاروں کا شور و شغب بھی لمحہ بہ لمحہ تھمتا جائے
دریا کی پہنائی میں اک اسٹیمر کی سیٹی گونجے
کس کو خبر ہے کس منزل کو جاتے ہے اور کس کو بلائے
چاند نے بھی پورب کے جھروکے میں اپنا مکھ دکھلایا ہے
چاند سے باتیں کون کرے جب درد ہی دل میں امڈ آئے .

ہوٹل اب سنسان ہوا جاتا ہے مسافر سونے چلے ہیں
مجھ کو مگر اس بستر کی ایک ایک شکن ڈسنے کو آئے
بین الاقوامی بستی میں چہل پہل اب تک ہو شاید
اور کہیں اس دل کو بھی اپنے درد کا درماں مل ہی جائے
دل کے دیکھ ، مرے بستر کو دھیان میں رکھنا - جو کس نے کہا ،
سیر کا یہ بھی وقت ہے کوئی ، دیکھ کے لڑکا بھی مسکائے

شنگھائی کے پیلے پیلے سر بفلک "تاجر محلوں"[1] سے
بچتا بچاتا کہیں کہیں ساگر کی ہوا کا جھونکا آئے
بین الاقوامی بستی کی عشرت گاہیں جاگ رہی ہیں
نغمے کی اک موج کبھی تھم جائے ، کبھی طوفاں ہو جائے
سینماؤں کے دروازوں سے افرنگی جوڑے نکلے ہیں
ہاتھ کمر میں ڈالے ہوئے اور شانوں پر زلفیں بکھرائے

[1] ۔ بنکوں اور تجارتی اداروں کی اونچی اونچی عمارتیں جو ہر بڑے شہر میں ہوتی ہیں شنگھائی میں بہت زیادہ ہیں -

ایک کا یا بارہ کا عمل ہے
آج کی پکچر لمبی تھی ——

آج بہت پی لی ہے جانی
قدم قدم پہ بہک رہی ہو
ایسے میں گھر کیا جاؤ گی

آؤ بھی مادام آؤ بھی
ایسے میں گھر کیا جاؤ گی
آدھی رات تو بیت چکی

آؤ اور قریب آجاؤ
آدھی رات تو بیت چکی

برگنزا ہوٹل میں چلیں گے
رکشا او چینی کے بچے
رکشالا !

ٹک ٹک دیکھ رہا ہے کیسے
او چینی او مریل پتلے
رکشالا !

رکشا والا مریل پتلا ٹک ٹک کس کو دیکھ رہا ہے
تاجر کو جو مہماں بن کر آئے اور آقا بن جائے
رکشا قلی کو یاد ہیں شاید اب تک وہی پرانی باتیں
کیسے اک پچھم کا بیوپاری کندھے پر بکس اُٹھائے
چین دیس میں آیا تھا اور میٹھی بولی بول رہا تھا
میٹھی بولی جیسے کوئی بات بات میں شہد ملائے

لے چینی اے بھائی چینی
تو ہم سب کا ان داتا
تیرے ودوانوں کے آگے
دُنیا بھر کا سر نیچا
کنفیوشس کے کیا کہنے ہیں
عیسیٰ سے بھی اچھا تھا
ہم تو تیرے شبھ چنتک ہیں
لے چینی افیون تو کھا !

ہم کو تو پیسے کی طلب ہے
اور نہ حکومت کا سودا
ہم تو تیرے بیوپاری ٹھہرے
ہم کو کسی سے کیا لینا
تیرے بنا ساری دنیا میں
چوپٹ اندھیارا ہوتا
اک کوٹھی کی جگہ دلادے
لے چینی افیون تو کھا ،

برگنزا ہوٹل کے اندر لوگوں کا میلہ سا لگا ہے
ساغر کھنکیں کاگ اُڑے بوتل کا اور مستی چھا جائے
بال رُوم کے دُھندلے دُھندلے شیشوں میں سے جھلک رہے ہیں
سینہ بہ سینہ، چہرہ بہ چہرہ، مٹیالے مٹیالے سائے
ایک میز پر ایک اینگلو انڈین بیٹھا ڈینگیں مارے
اک طرف اک بڈھا کھوسٹ بیتے دنوں کی بات سنائے

"اس بستی کا بچّہ بچّہ ہم لوگوں کو سجدہ کرتا تھا
اس بستی میں ہم لوگوں نے لاکھوں کیا، اربوں ہی کمائے
ینگ گارڈن کے دروازے پر یہ بورڈ لگا رہتا تھا
"کوئی بھی چینی، کوئی بھی کتّا باغ کے اندر آنے نہ پائے"
آج مگر اسکولوں کے لڑکے بھی ہمارے منہ آتے ہیں
کوئی مری سب دولت لے لے، بیتے دنوں کو واپس لائے"،

برگنزا ہوٹل کے باہر لوگوں کا میلہ سا لگا ہے
بھک منگوں کے غول کھڑے ہیں۔ ہاتھوں کو کشکول بنائے
ایک طرف پٹڑی کے نیچے ننگی، بھوکی، روگی مائیں
اونگھ رہی ہیں اندھی بہری دیواروں سے ٹیک لگائے
سڑکوں کے ایک ایک موڑ پر ننھّے بچے، بڈھے چینی
چیخ رہے ہیں دانت نکالے، کوئی سخی پیسہ دے جائے،

برگنزا ہوٹل کے باہر شنگھائی کے فٹ پاتھوں پر
آئے برس جاڑے کے دنوں میں بالا اترے، جھکّڑ آئے
کال کے مارے ننگے بھوکے بتیس ہزار انسان ایسے ہیں
مرجائیں چپکے ہی چپکے۔ بھاگ کا لکھا کون مٹائے،
یانکی[1] صاحب شور مچا دیتے ہیں — بُو سے ناک پھٹی جاتی ہے،
کونسل[2] والے چیخ اٹھتے ہیں — اتنی لاشیں کون اٹھائے،

[1] YANKEE امریکی سپاہی [2] میونسپل کونسل

رات بھی، دن بھی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ پہیئے چالیں، رولر گھومیں
شنگھائی کی فیکٹریوں کی ماشینوں کو نیند نہ آئے
ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن، سونے کے سکّے۔ بنک میں جا کر گرتے جائیں
مالک کی ٹھوڑی پہ ہمیشہ ایک نئی تہ چڑھتی جائے
چہرے کی رونق بڑھتی جائے، روز نئی تدبیریں سوجھیں
اب کے برس کچھ چال چلو ایسی کہ منافع اور بڑھ جائے،

فیکٹریوں میں کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ پہیئے چالیں، رولر گھومیں
سولہ گھنٹے کام کرے مزدور اور تھک کر گر بھی جائے۔
ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن سونے کے سکّے بنک کے تھیلے بھرتے جائیں
چھ آنے ہیں، سیٹھ سے پوچھو کیا اِن سے کیا پہنے کھائے
کہیں کہیں پہ دبی دبی فریادوں کا اک مدّھم ریلا
ماشینوں کے شور سے یکدم اُبھرے اور بکھر جائے

ایک آواز:۔ اے ساتھی یہ جالم ڈیوٹی
روز کریں اور چین نہ پائیں
کس سے اپنا حال کہیں ہم
کس کو اپنا درد سنائیں
کھُون پسینے فرق نہ سمجھیں
بھاری بھرکم ملیں چلائیں
پھر بھی ہمیشہ دل میں یہ دُبدھا
کل کیا پہنیں، کل کیا کھائیں
پیٹ پہ پتھر باندھ کے سوئیں؟
فٹ پاتھوں پہ عمر بتائیں؟

دوسری آواز:۔ ایک ہمیں بپتا نہیں ساتھی
ایک ہمیں دکھیارے نہیں ہیں
اور بہت ساتھی ہیں ہمارے
ہم اتنے بیچارے نہیں ہیں
ہم دھرتی کا پوٹا چیریں
کوئلا لوہا بھر بھر لائیں
رکشا کھینچیں، ریشم کاتیں
نہریں کھود دیں، محل بنائیں
ہم کھیتی کو پانی دیویں
ہم کھیتی میں اَن اُپجائیں،

پہلی آواز:۔
ہم کھیتی کو پانی دیویں
ہم کھیتی میں ان اُپجائیں
پھر کیوں اتنے سنکٹ جھیلیں
بھوک سے چھٹکارا نا پائیں
پورب پچھم اُتر دکھن
آگے پیچھے دائیں بائیں
کال کے راچھس چار کوٹ میں
گِدھوں کی بھانتی منڈلائیں،

دوسری آواز:۔ اے ساتھی یہ بات نہ چھیڑو
بات کریں تو جیبھ کٹائیں،

پہلی آواز:۔ ٹُک ٹُک بیٹھے کب تک لیکن
یہ انیائے دیکھے جائیں
یہ جلاّد حکومت والے
ہمرا پہنیں، ہمرا کھائیں
ہمرے ساتھی مُلک بدر ہوں
ہمرے ساتھی جیل میں جائیں
ہمرے نیتا پھانسی لٹکیں
ہمرے نیتا گولی کھائیں

(دونو آوازیں مِل جاتی ہیں۔ پھر بیسیوں۔ پھر سینکڑوں اور پھر ــــ)

کل جو ہوا ہے اب نہیں ہوگا
فیکٹریوں سے نِکلو آؤ
رِکشا موڑ دو، ریلیں چھوڑ دو
بسیں گراجوں میں پہنچاؤ
او دفتر کے بابو نکلو!
پوتھی کو دریا میں بہاؤ
پڑھنا لکھنا کل پر چھوڑو
اسکولوں کے لڑکو آؤ
جنگ کے مجرم جانے نہ پائیں
گھیرا ڈالو، ہاتھ دکھاؤ
[1] کونگ سُونگ کو گولی مارو
چیانگ کو پھانسی پر لٹکاؤ
ماؤ کی فوجیں کتنی دور ہیں
ماؤ کی فوجوں کو بلواؤ
ماؤ کی فوجوں کو بلواؤ

[1] چین کے دو سابق وزیرِ اعظم۔ سونگ میڈم چیانگ کائی شیک کا بھائی ہے۔

(۲)

شنگھائی کے اسٹیشن پہ، بندرگاہ پر بھیڑ لگی ہے
دیکھیں کب اسٹیمر چھوٹے، کب دکھن کو گاڑی جائے
سڑکیں وہی ہیں اور سڑکوں کے موڑ وہی، پر رفتہ رفتہ
اک شنگھائی دم توڑے اور اک شنگھائی اُبھرا آئے
ایک ایک انسان کے دل میں آگ کی لاٹیں جاگ رہی ہیں
ان لاٹوں کو کون دبائے، اس جوالا کو کون بجھائے

ماؤ کی فوجیں شنگھائی کے دروازوں سے دور نہیں ہیں
الٹا طوفاں ننکی کی موجوں کے سہارے بڑھتا آئے
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کوئی دوا بھی کام نہ آئی
سرکش موجیں رُک سکتی ہیں پیسوں کی دیوار بنائے؟
بنکی جا نباز اک کر کے واشنگٹن کو بھاگ رہے ہیں
جان بچی اور لاکھوں پائے، خیر سے بدھو گھر کو آئے

یہ ریلا تو رُک نہ سکے گا، یہ طوفان تو تھم نہ سکے گا
اس دھارے کا زور ہمیشہ بڑھتا جائے، چڑھتا جائے
بھاڑے کی فوجیں تو نہیں ہیں ماؤ کے دہقان گوریلے
ان کی لگن کو کون خریدے، ان کی قیمت کون چکائے
اراکان کے جنگل اس طوفان کے آگے سجدے میں ہیں
اس طوفاں کے زور کے آگے کوہ ہمالہ سیس نوائے

شنگھائی میں، کلکتے میں، لوگوں کو پیغام سُنا دو!
بھوک سے ننگے فٹ پاتھوں پر آج کوئی نہ مرنے پائے
سائیگون میں، کولمبو میں سب کے دل میں جوت جگا دو!
رونے کے دن بیت چلے اب، کوئی نہ دکھیا نیر بہائے
رات جہاں بلوان ہو اب تک، آشاؤں کے دیئے جلا دو!
نئی سحر کی دھندلی ریکھا، اندھیاروں میں ڈوب نہ جائے

ممتاز شیریں

بیاٹریچےؔ

"اُٹھو کھانا کھا لو۔ بھوک لگی ہوگی تمہیں، شام کتنا تھک کر آئے تھے" اس کی بیوی آہستہ آہستہ اُس کا شانہ ہلا رہی تھی۔ وہ سو یا نہ تھا۔ یونہی آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ ایک میٹھے تصوّر نے اس پر غنودگی سی طاری کر دی تھی۔ اور وہ یوں ہی آنکھیں بند کئے، بستر کی نرم گرمی کے آغوش میں اس میٹھے تصوّر کی مدہوشی میں کھو کر لیٹے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی کے اس نرم محبّت بھرے لہجے نے اُسے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ ہاتھ مُنہ دھوتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف بے مقصد دیکھے جا رہا تھا۔ سانولی سی، دُبلی پتلی، لمبی سی عورت، اکاسنی دوپٹہ اس کے شانے سے لٹک رہا تھا۔ اور وہ بڑی پھرتی سے چیزیں لا کر میز پر لگا رہی تھی۔

"اوہو، کتنی چیزیں تیار کر لی ہیں تم نے آج اور انڈے کا حلوہ بھی واہ"

"تمہیں یہ سب چیزیں پسند ہیں نا، اس لئے سوچا آج پکا کے کھلاؤں"!

وہ اسے محبّت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ نرمی نے لے لی، اور اس نے کچھ محجوب سا ہو کر اس نے سر جھکا لیا۔

اس کی بیوی نے پیار سے پوچھا "گرمی لگ رہی ہے تمہیں؟" اور چپکے سے اُٹھ کر کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول کر پھر اس کے پاس آ بیٹھی۔ ہوا اپنے ساتھ سمندر کی ٹھنڈک لے آئی۔ اس ٹھنڈک اور تازگی سے اسے کچھ فرحت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے ہاتھ سے پکائی ہوئی ساری چیزیں بڑے اصرار اور پیار سے اُسے کھلا رہی تھی۔ تیز ہوا میں اس کی سفید شرٹ کے کالر سینے پر پھٹ پھٹا رہے تھے۔ اور سینہ کھُلا تھا۔ اس کی بیوی کی نظریں اس تندرست چوڑے سینے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ ان نظروں کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسکی نظروں سے نظریں ملانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ان نظروں میں غرور تھا، تحسین تھی۔ محبّت تھی۔ اور وہ ان کا جواب صرف شفقت سے دے سکتا تھا محبّت سے نہیں۔ اسے ندامت محسوس ہو رہی تھی، کتنے غرور، کتنی محبّت سے وہ تکے جا رہی ہے۔ اس کا سینہ اس سے بے خبر کہ اس سینے کے نیچے جو دل ہے۔ وہ اب اس کے لئے نہیں دھڑکا کرتا!

کھانا کھانے کے بعد اس کی بیوی نے کُرسیاں دریچے کے قریب کھینچ دیں "یہاں کچھ دیر بیٹھیں۔ بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے"! خوشگوار ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں سے سرشار ہو کر وہ باتیں کئے جا رہی تھی۔ اپنے میکے کی باتیں، اپنی سہیلیوں کی باتیں، ان کی اپنی شادی کی باتیں، لیکن ان ساری باتوں کے دوران میں وہ غائب سا رہا۔ یہ بتانے کے لئے کہ وہ اس کی باتیں توجہ سے سُن رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا کرتا۔ اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ بے کراں سمندر، اور زرد زرد چاند کی مدہم اداس چاندنی، اس کے اندر کا آرٹسٹ جاگ اُٹھا۔ اس پر ایک عجیب کیفیّت چھانے لگی۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کی بیوی کو اس اُداسی اور اضمحلال کا پتہ نہ چل جائے۔ اس نے نرم پیار بھرے لہجے میں کہا:۔

"بہت تھک گئی ہو گی تم آج جا کر سو جاؤ سلمیٰ"!

"ہاں، اور نیند بھی آ رہی ہے" وہ اُٹھ کر خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ چند قدم جا کر وہ رُک گئی۔ اور مُڑ کر پلکوں کی اوٹ سے شوخ نظریں اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔

"تم نہیں آؤ گے کیا؟"

اس نے دیکھا اس کی بیوی کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ وہ اُٹھ کر اس کے

○ بیٹرس: ساٹلی کے شہرہ آفاق شاعر دانتے کی محبوبہ جس کی محبّت میں سرشار ہو کر اس فنکار نے "ڈیوائینا کامیڈیا" لکھی:

پاس جا کھڑا ہوا۔ اور شفقت سے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر بولا "نہیں تم سو جاؤ۔ مجھے اپنی ایک تازہ تصویر پر کام کرنا ہے" پھر اسے مایوس ہوتے دیکھ کر اس نے ہلکے سے اس کی پیشانی چوم لی۔ "تم سو جاؤ سلمیٰ، تھک گئی ہو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ شاید بہت رات گئے تک میں کام کرتا رہوں"۔

وہ کچھ کہے بغیر سر جھکائے چلی گئی۔

اُسے یوں اداس، سر جھکائے جاتا دیکھ کر اسے رنج ہوا۔ اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے یہ کیا ہو گیا ہے مجھے . . . . وہ مجھے کتنا چاہتی ہے۔ میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اور میں . . . . میں اچھا سلوک کر تو رہا ہوں، لیکن کیا وہ میرے پیار میں گرمی کی کمی محسوس نہ کرتی ہوگی، میں بھی کتنا . . . آخر وہ میری جیون ساتھی ہے . . . . . وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے خوابگاہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے دروازے میں رک کر دیکھا۔ اسکی بیوی سوئی نہ تھی۔ بچھونے پر ٹیک لگائے بیٹھی کھوئی کھوئی نگاہوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اُسے خوف نے جکڑ لیا۔ کیا وہ جان گئی ہے؟ وہ اندر چلا گیا

"تم ابھی تک نہیں سوئیں سلمیٰ"۔

جھکی ہوئی نظریں اوپر اُٹھیں "جی نہیں"۔

"تو اب سو جاؤ" وہ پاس بیٹھ کر اس کا بازو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ وہ سو گئی۔ کھڑکی کے شیشوں سے چھن کر آتی ہوئی دودھیا چاندنی میں اس کا چہرہ معصوم اور پرسکون نظر آ رہا تھا کمبل اس کے پاؤں پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے کمبل گردن تک کھینچکر اوڑھا دیا اور باہر نکل آیا۔

تو آج کا دن بھی یونہی سکون سے گذر گیا۔ اس کی زندگی میں سکون تھا، آرام تھا، چاہنے والی بیوی ملی تھی جو اسے ہر طرح کا آرام دیا کرتی تھی۔ وہ خاصا اچھا کما لیتا تھا۔ وہ مفلوک الحال آرٹسٹ نہیں تھا۔ آرٹ اس کے لئے شوقیہ چیز تھی۔ زندگی سکون و اطمینان سے گذر رہی تھی۔ لیکن اسکی روح اس قدر بے چین کیوں تھی؟ کیوں؟ کیوں؟ شاید یہ سکون، یہ ٹھنڈک اسے پسند نہ تھی، جوشیلا حساس نوجوان، اس کی سرشت میں بلا کی حدت اور بیقراری سمائی ہوئی تھی۔ یہ طوفان کی بے قراری چاہتی تھی۔ آگ کی جلا دینے والی تپش چاہتی تھی اور . . . .

وہ خیالوں میں کھویا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ ارے اس کی تازہ تصویر میز پر رکھی تھی۔ کس نے نکالی؟ وہ چونک پڑا۔ کہیں اس کی بیوی تو نہیں۔ اور پھر اچانک اُس کے دل میں وہی خوف جاگ اُٹھا۔ کیا وہ جان گئی ہوگی؟ جان گئی ہوگی کہ یہ تصویر اس کی اپنی محبت کی بے بسی کی تصویر ہے۔ نہیں، وہ کیا جان سکے گی غریب عورت اس کی تصویروں کی روح کو پہچاننا تو الگ وہ اُن کے ظاہر کو بھی نہیں جانچ سکتی پرسوں ایک تصویر بنانے پر اس نے کہا تھا "اچھی ہے لیکن رنگ بہت ہلکا ہے۔ کچھ گاڑھا کر دیا ہوتا۔ اور وہ مسکرا کر چپ ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کے اس دوسرے وجود ــ آرٹسٹ سے بے خبر تھی۔ زندگی کی اس راہ پر وہ اس کی ساتھی نہیں تھی . . . .

لیکن شہناز؟ شہناز! شہناز! اس کے ہونٹوں نے ہلکے سے اس نام کی شیرینی سے سرشار ہو کر کتنی بار دہرایا۔ اس کے ساز ہستی کا ہر تار جھنجھنا اُٹھا۔ اس کے سارے وجود میں آگ لگ گئی۔ اس کی ساری کائنات تڑپ اُٹھی شہناز تو اس کی تصویروں کو اس کی نظروں میں اور بھی حسین بنا کر رکھ دیتی تھی شہناز جس نے اس کی زندگی میں آ کر اس کا چین اجاڑ دیا تھا۔ وہ اچانک اس کی زندگی کے اُفق پر نمودار ہوئی۔ اور دیکھتے دیکھتے اس کے خیالات پر تصورات پر، اس کے آرٹ پر، اسکی ساری کائنات پر چھاتی چلی گئی۔ اس کا آرٹ اب شہناز سے کچھ اس طرح وابستہ ہو گیا تھا۔ کہ شہناز کے بغیر وہ اپنے آرٹ کا تصور ہی نہ کر سکتا تھا شہناز کی یاد اور اس کا تصور اسے وجدان کی بلندیوں پر پہنچا دیتا۔ اور تصویریں بنتی جاتیں، بنتی جاتیں . . . . . اور یہ اس کی تازہ تصویر، اس میں تو اس نے اپنی محبت کی ساری محرومی، بے بسی، بے چینی، تڑپ، اور آگ حلول کر کے رکھ دی تھی . . . . یہ تصویر اس کا شاہکار ہوگی۔ اس نے تصویر رکھ دی . . . . . .

لیکن اس کی زندگی میں آئی کہاں تھی شہناز؟ شہناز تو اس کے لئے صرف اس کے لئے صرف ایک شیریں تخیل تھی، ایک میٹھا تصور، ایک تڑپا دینے والی یاد!

قیامت کی بے بسی تھی۔ کہ وہ اپنے خیالوں کا اظہار بھی نہ کر سکتا تھا۔ خود شہناز کو بھی کچھ بتا نہ سکتا تھا۔ شہناز کی خاطر اس نے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر لیا تھا۔ اور یہ راز اس کے سینے میں انگارہ بن کر دہک رہا تھا . . .

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، اتنی کہ وہ بے چین ہو کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ خنکی بھری ہوا کے تیز اور سرد جھونکے اس کے بازوؤں کو، اس کے چہرے کو، اس کے سینے کو خنکی میں دھو رہے تھے۔ لیکن اس کے سینے کی آگ کو سرد نہ کر سکتے تھے . . . . پورا اور روشن چاند ناریل کے درختوں کی

اوٹ سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ شہناز بھی تو چاند ہے۔ دلکش، خوبصورت لیکن اس کی دسترس سے اتنی ہی دُور، جیسے چکور کی دسترس سے چاند! وہ اب کیا کر رہی ہوگی جب وہ اس کی یاد میں ڈوبا ہوا ہو۔ ممکن ہے وہ آرام سے سو رہی ہو، اس کے شوہر کے بازو اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے۔ اوہ! رقابت کا ایک تیر سا اس کے دل کو چیر گیا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے وہ سنبھل گیا اوہ! میں کیوں اتنا گرا جا رہا ہوں۔ شہناز اس کے شوہر کی ہے۔ جو اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اور ...... شہناز بھی اس سے محبت کرتی ہے ...... مجھے ان دونوں کی محبت سے خوش ہونا چاہیئے۔ ...... رقابت یہ کتنا گرا ہوا جذبہ ہے۔ میری محبت ان سب باتوں سے بلند رہے گی۔

وہ دریچے کے پاس سے ہٹ آیا۔ کمرہ کی دیواروں پر اس کی کئی تصویریں لگی تھیں۔ اس نے اپنی بعد کی تصویروں کو پہلی تصویروں سے الگ رکھا تھا۔ کتنی پھیکی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی پہلی تصویریں ان میں رنگوں کی خوبصورت آمیزش تھی۔ نفاست تھی۔ آرٹسٹ کا خلوص بھی تھا، لیکن ان دوسری تصویروں میں درد تھا۔ حُسن تھا، بلندی تھی، روح تھی! یہ بعد کی تصویریں تھیں۔ جب شہناز اس کے آرٹ کی زندگی میں آئی تھی ......

اگر شہناز واقعی اس کی زندگی میں آسکتی، اگر وہ شہناز کو پا سکتا تو شہناز اس کے لئے صرف ایک لڑکی ہوتی، ایک خوبصورت لڑکی جو اس کی زندگی میں آگئی تھی محض ایک "زمینی" محبوبہ! اب تو وہ اس کے لئے ایک آسمانی دیوی تھی۔ جو اس سے بہت دور کہیں بلندیوں پر نظر آتی تھی۔ کہیں بہت دور بلندیوں پہ ایک سُنہرے سے غبار میں ایک غیر مرئی تشکیل اور ایک خوبصورت چہرہ، خوبصورت گھور کالی آنکھوں میں چمک، خوبصورت بھرے ہوئے ہونٹوں پر ایک میٹھی چمکیلی مسکراہٹ، اور اسے محسوس ہوتا۔ اس نے روشنی کو پالیا ہے۔ اور اس کا وجدان ...... یا پھر اس کی روح میں آگ لگ جاتی ......

اگر اس کی محبت سفلی درجہ پر اُتر آتی۔ تو شاید اس کا آرٹ مر جاتا۔ کم از کم اس میں وہ بلندی اور گہرائی نہ ہوتی۔ ...... ہاں شہناز اس سے دُور ہے۔ ہمیشہ دُور رہے گی۔ اور اس دوری نے اس کی محبت کو پرستش میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس پاکیزہ محبت نے اُسے سونا بنا دیا ہے۔ اور اس پاکیزہ لیکن جلا دینے والی محبت کی یہ پرستش، روح کی یہ آگ اس کے آرٹ کو جلا دے گی۔ اُس کے آرٹ کو بلندی پر پہنچا دے گی ۔۔

× × × × × ×

مختار صدیقی

لبِ ساحل

اور پھر بے مہریٔ اوقات کی باتیں چلیں

ساحلِ سنگیں سے زِچ، بپھری ہوئی موجوں کا زور
چاندنی ڈھلکی تو جیسے ہو گیا یکسر نڈھال
ہلکی ہلکی روشنی میں کھل گئیں تاریکیاں
جھاگ نے واماندہ موجوں کیلئے پھیلائے جال

دیر تک یوں تلخیٔ حالات کی باتیں چلیں

قدرِ قدرت کچھ بھی ہو، انسان کی ہستی نہیں
ہم تو بے حاصل مشقت ہی کریں، کرتے رہیں
بے زباں زنگی غلاموں کے گروہوں کی طرح
نارسا آقاؤں کی خاطر مریں، مرتے رہیں

موجیں تھک کے ہٹی جاتی تھیں ساحل سے پرے
اور سیہ ننگی چٹانیں اپنی سنگینی کے ساتھ
ہانپتے ریلوں کی لائی ریت قدموں میں لئے
پھر بڑھاتی تھیں سمندر کی طرف سایوں کے ہاتھ!

گفتگو کی رو میں پھر دن رات کی باتیں چلیں

یہ مشقت چار دن کی زندگی کی ہے سزا
جس میں ہم چاہے ہنسیں بولیں کہ دکھ سہتے رہیں
دور یہ ہے اتنا بے اقدار، ایسا نارسا
جس میں سب موقع پرستی کے سہارے جی سکیں "

" علم و حکمت کے خزینوں میں کمی کوئی نہیں
کیسے منصوبوں کو مِل سکتے ہیں کیا زریں غلاف
جیسے اس دنیا کے فرسودہ اندھیروں کیلئے
صبح تو لائیں گے نظریات کے یہ نور باف! "

دور تک پھیلے سمندر پہ کوئی ہلکی سی رو
گہرے ساکت پانیوں کو ایسے تھپکاتی رہی
جیسے طوفانوں کا، مد و جزر کا سویا خروش
اپنے جیتے جی تو پھر شاید نہ جاگے گا کبھی!؟

حامد عزیز مدنی

بادِ مخالف

ہر نظر پر میّتِ نظّارگی ہنستی رہی
جادہ و منزل کے بے تعبیر خوابوں کا ہجوم
رسمِ زنداں کو ہوا دیتی رہی خود سرکشی
خام تعزیرات کی دیوارِ چیں کی اوٹ سے
علم و عرفاں کے خنک اصنام سجتے ہی رہے
کھو گئیں تابانیاں خاکسترِ شب میں مگر
مہر و مہ کو خود نہ تھی فرصت افق تابی کی جب
اس چراغِ نیم روشن کی فضائے سوگوار
خیر و شر سے ہر نفس مست دگر یاں تندگی
گولیوں کی سنسناہٹ میں بھی آدم کی کراہ
دور سُونے ریگ زاروں میں بھٹکتے قافلے
اڑ رہی ہے راکھ ویراں بستیوں کی چارسُو
زندگی پھر خوابِ سقراط و مسیح و سراگئی
ایک بے آواز دستک دے رہا ہے انقلاب
آ کہ اے موجِ شرر مدت سے تیرے منتظر
تیری لو سے جل تو سکتی ہیں وہ دستاویزِ خاص
اک نئی ضو بھی ان بجھتے ہوئے چہروں سے دو
ان خداؤں کی صفیں کج ہوتی جاتی ہیں مدام
خستگی اس کی شکست آثار ہے لیکن ابھی
نزع کے عالم میں ہے آدم کا خوابِ زندگی

ہر نفس دیدہ وری پر حرف آتا ہی رہا
نیند سے چنگیز و نادر کو جگاتا ہی رہا
انقلابِ وقت اک تابوت اٹھاتا ہی رہا
اک نہ اک آئینِ نو کرتب دکھاتا ہی رہا
اور بے ستاروں کا غم تسکین پاتا ہی رہا
کچھ نہ کچھ خونِ سحر بھی تو بڑھاتا ہی رہا
میں اندھیرے میں چراغ اپنا جلاتا ہی رہا
کم سے کم سے دل کے دھڑکنے کی خبر لاتی تو ہے
کچھ پیامِ انقلاباتِ دگر لاتی تو ہے
اک صدائے نالۂ خونیں جگر لاتی تو ہے
جادہ پیمائی سرِ راہگذر لاتی تو ہے
اور زمیں تابِ جنوں بام و در لاتی تو ہے
یہ فضا ایک موسمِ دیوانہ گر لاتی تو ہے
صبح کا سا نور یہ موجِ شرر لاتی تو ہے
کتنے بے گلزار ابراہیم ان راہوں میں ہیں
جن کے آسیب اب حکومت کی کمیں گاہوں میں ہیں
کچھ نئے عنوان ان ڈوبی ہوئی آہوں میں ہیں،
ایشیا کے روز و شب جن کے ہوا خواہوں میں ہیں
کتنے سورج زد و رو اس رات کی باہوں میں ہیں
اور تعبیریں ابھی تک کچھ پتہ گمراہوں میں ہیں

ہر طرف افسردہ تعبیروں کے یہ میلے غلاف
تیز تر ہو جا، خدارا اے ہوائے اختلاف

منظر سلیم

انفرادیت پرست

نہیں میں آزاد ہی رہوں گا
تمہارے کہنے سے اپنے بت کو
میں ٹکڑے ٹکڑے نہ کر سکوں گا

مرے خیالات جم گئے ہیں
مرے خیالات چلتے چلتے
ہوا کی لہروں پہ تھم گئے ہیں
ہوا کی لہریں ٹھہر گئی ہیں
ہزاروں دیواریں بن گئی ہیں
ہزاروں دیواریں جن کے نیچے
مری حیات ایک بت کدہ ہے۔

یہ بتکدہ جس کی وسعتوں میں
زمین اور آسماں کی وسعت
بس ایک بت ہے، ذرا سا بت ہے
یہ بت کدہ جس پہ لگ چکی ہے
گذشتہ صدیوں کی ساری دولت
گذشتہ صدیوں کی ساری محنت
یہ بت کدہ جس کی خامشی کی
رہی ہے سارے جہاں کو حسرت
یہ بت کدہ مجھ کو مل گیا ہے
میں وہ پجاری ہوں جس کی فطرت
یہاں کا سب سے عظیم بت ہے

یہ آئینہ لائے ہو دکھانے
مری پر اسرار زندگی کو
مجھے تماشا سمجھ رہے ہو
مجھے سمندر میں آدمی کے
بس ایک قطرہ سمجھ رہے ہو
مجھے اکیلا سمجھ رہے ہو
میں تم سے کہتا ہوں لوٹ جاؤ
تمہارے ہاتھوں میں آئینہ ہے
میں صرف پتھر ہوں، صرف پتھر!
میں نور و ظلمت کو کیا کروں گا
نہیں ہے دامن میں کچھ بھی لیکن
کسی حقیقت کو کیا کروں گا
میں آج بھی سوچنے پہ آؤں
تو سوچنے کے لئے جہاں میں
ہزار ہا الجھنیں ہیں باقی
ہزار ہا خواب دیکھنے ہیں
خلائے تخئیل بے کراں ہیں۔

میں تم سے کچھ مانگتا نہیں ہوں
تمہاری سہمی ہوئی نگاہیں
تمہاری منزل تمہاری راہیں
(میں جم چکا ہوں ٹھہر چکا ہوں)
مجھے نہ دو کچھ، نہ مجھ سے مانگو۔
میری طرف اب نہ مڑ کے دیکھو
تمہاری خاطر میں مر چکا ہوں
میں مر چکا ہوں، میں مر چکا ہوں

سیّد رضی ترمذی

تصادم

سکوتِ بیکراں میں ایک راز کانپتا رہا
سکوتِ بیکراں کہ جیسے تیرگی کی منجمد تہیں سمٹ کے اک چٹان بن گئی ہوں راہ میں
ترے لبوں میں لفظ، ایک لفظ، جم کے رہ گیا
مرے خیال اشک بن کے تیرگی میں ڈھل گئے
سکوتِ بیکراں میں ایک راز کانپتا رہا ——————

مگر بڑھے ہی جا رہا تھا قافلہ
کہاں؟ کدھر؟ یہ آج تک بھی راز ہے
گرفتِ دشت و بام و در سے دور کوئی راہ تھی
حدودِ زندگی کے پار اک پناہ گاہ تھی
جہاں خدا بھی اک سکوتِ بیکراں کا جزو ہے،

شفق کی اک لکیر جیسے تیرگی میں جاگ اُٹھے
مجھے سکوتِ راہ میں ترا خیال آ گیا
نگاہ و دل مچل گئے ——————
چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر فضاؤں میں بکھر گئیں
ہم اُن کے شعلہ ہائے ضو فشاں میں ناچتے رہے
وہ بولتے خیال جو اُبھر رہے تھے تیرے دل کی دھڑکنوں سے، کیا تجھے بھی یاد ہیں؟
وہ رات جب میں تیرگی کی دھجیاں اُڑا کے چیخ اُٹھا تھا — "آ دیکھ لو — یہ زندگی کا راز ہے"

وہ دیکھ خانقاہ کے چراغ ٹمٹما رہے ہیں اُس طرف
جہاں نہ جانے کتنے قافلوں کے راز دفن ہیں،
سکوت ہی سکوت ہے!! ——————

غلام ربانی تاباںؔ

"احساس"

سوچتا ہوں تری محفل سے چلا جاؤں میں
رنگ و نکہت کا گراں بار کچل ڈالے گا
میری حسّاس طبیعت — مری خودداری کو
یہ شبستانِ مسرّت — تری الفت کی قسم
میری آوارہ مزاجی کو نہ راس آئے گا
جس طرح ساز سے گرتی ہوئی نغموں کی پھوار
اور بھی تشنگیٔ شوق بڑھا جاتی ہے
تیری تابندہ جوانی - ترا رخشندہ جمال
اور جذبات کو گمراہ کریں گے اے دوست
زندگی کاکل و رخسار میں کھو جائے گی
نغمہ و نکہت و انوار میں کھو جائے گی
میرا فن میرا تخیّل - مرے نازک افکار
عیش کی سرد فضاؤں میں ٹھٹھر جائیں گے
گیت - تاروں کے، شراروں کے، اچھوتے ارماں
جن کو پہنانا ہے الفاظ کا ملبوس ابھی
تیری آغوش میں گھٹ گھٹ کے وہ مر جائیں گے
ساز ہی ساز ہے محفل تری - آغوش تری
زیست گر سوز نہیں - کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں!!

سوچتا ہوں تری محفل سے چلا جاؤں میں

سلطانہ قمر

سہیلی!

—— سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
تیری نیندیں لٹیں
تیرے سپنے لٹے
جو بھی نغمے لٹے —— تیرے اپنے لٹے
تیرا تن لٹ گیا —— تیرا من لٹ گیا
تو لٹی اور تیرا چلن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
—— سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
اب وہ غنچے کہاں
اب وہ کلیاں کہاں
وہ بہاریں کہاں
رنگ رلیاں کہاں
باغ سونے ہوئے —— رنج دونے ہوئے
آج ایک ایک سرو و سمن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
—— سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
اپنا دل بیچ کر
اپنا گھر بیچ کر
اپنی ہر سانس کو
در بدر بیچ کر
آج اکیلی ہے تو —— اک پہیلی ہے تو
تیرا سب کچھ سرِ انجمن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے
—— سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا —— آئینہ توڑ دے

عالم سیاہ پوش

بھگوان!

نردیّوں کے دین دیالو اَن دیکھے بھگوان
جھونپڑیوں میں سسک سسک کے جنتا تیری مرتی ہے
سدھ بدھ اپنی بسری پھر بھی یاد تمہاری کرتی ہے
دھن والوں کی تنی کمانیں برساتی ہیں بان
نردیوں کے دین دیالو اَن دیکھے بھگوان

خون کی ہوری کھیل رہا ہے تیرا سب سنسار
دیکھ رہا ہے چپکے چپکے تو یہ اتیاچار
پاپ مٹادوں گا میں جگ سے کہاں گیا فرمان
نردیوں کے دین دیالو اَن دیکھے بھگوان

چاروں اور اندھیارا چھایا روپ کہاں ہے تیرا
جگت بسیّا سامنے تیرے اجڑ گیا گھر میرا
کیا کہوں میں تم سوئے پڑے ہو کب سے لمبی تان
نردیّوں کے دین دیالو اَن دیکھے بھگوان

چاقو مار کے گیتا واچے مار چھری قرآن
دیکھ لے حیوانوں سے بدتر ہیں تیرے انسان
خوب بسائی ہے یہ بستی میں تیرے قربان
نردیّوں کے دین دیالو اَن دیکھے بھگوان

ہر ہردے میں آگ لگی ہے ہر کایا شمشان
سہم سہم کر کانپ رہے ہیں سانسوں کے طوفان
بھوک کی ماری دنیا تیرا کرتی ہے اپمان
نردیّوں کے دین دیالو ان دیکھے بھگوان

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
صحیفۂ سلطان ٹیپو سلطان	محمود بنگلوری	۸/-
تاریخ سلطنتِ قرارداد	"	۶/۱۲/-
تاریخ جنوبی ہند	"	۵/-
تاج	"	۴/-
ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں	"	۲/۸/-
حیدر علی	"	۲/-
انقلابات ہیں زمانے کے	"	۲/-
جمال الدین افغانی	میرزا ادیب	۱/۴/-
سیرت الصدیق	حبیب الرحمٰن شروانی	۲/-
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	۳/-/-
عورت کا گناہ	فارغ بخاری	۲/-/-
افسانہ	اعنفلوطی	۲/-/-
رشک و تبسم	خلیل جبران	۳/-/-
ریت اور جھاگ	"	۱/۸/-
ادبی مطالعے	مجلسِ اردو	۳/-/-

تصانیف

خلیل جبران

کتاب	قیمت
ارضی دیوتا	۲/-
پاگل	۱/-
اپنا اپنا دیس	۲/۴
شیطان	۱/۸
ٹوٹے ہوئے پر	۱/۸
پکار	۱/۱۲/-
عجیب	۱/۸/-
دلھن کی سیج	۲/-/-
بنفشہ کا پھول	۲/-/-
آوارہ	۱/۸
پیش رو	۱/-
اس نے کہا	۱/۸
ریت اور جھاگ	۱/۸/-
رشک و تبسم	۳/-

گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف
چاندی کے تار	(مہندر ناتھ)	۲-۱۲-.	شعلۂ ساز	(فراق گورکھپوری)
پتھر کا دل	(سراج الدین احمد نظامی)	۲/۱۲/-	بادۂ مشرق	(ساغر نظامی)
ایک بات	(عصمت چغتائی)	۲/۸/-	تلخیاں	(ساحر لدھیانوی)
درپن	(شکیلہ اختر)	۲/-/-	جھونکے	(عبدالمجید بھٹی)
بھرے بازار میں	(حیات اللہ انصاری)	۳/-/-	پرتو	(جان نثار اختر)
نئے دیوتا	(دیوندر ستیارتھی)	۳/-/-	تاریک سیارہ	(اختر الایمان)
زندگی کا میلہ	(اختر حسین رائے پوری)	زیر طبع	غزلیں	(حفیظ ہوشیار پوری)
ناول			**اجتماعیات**	
جزیرۂ سخنوراں	(غلام عباس)	۱/۴/-	معاشیات کا مطالعہ	(غلام باری)
غزالہ	(ترجنیف)	۱/۴/-	مشین اور مزدور	,,
ٹیڑھی لکیر	(عصمت چغتائی)	۳/۸/-	آزادی کی راہیں	(برٹرینڈ رسل)
فاطمہ کی آپ بیتی	(ایم اسلم)	۳/۲/-	راجہ اور کسان	(لیو نارڈ شف)
ڈربوک	(ابو سعید قریشی)	زیر طبع	صاحب اور مذہب	,,
تہمت	,,	زیر طبع	بابو اور مزدور	,,
ڈرامے			سوشلزم	(اینگلز)
قید حیات	(آپندر ناتھ اشک)	۲/-/-	سرمایہ داری	(عبداللہ ملک)
پاپی	,,	۱/۸/-	جاگیرداری	,,
چرواہے	,,	۲/-/-	آمریت	(اکرام قمر)
تین عورتیں	(سعادت حسن منٹو)	۱/۴/-	پاکستان	(چوہدری افضل حق)
منٹو کے ڈرامے		۳/-/-	انتہا پسند کمیونزم	(لینن)
آؤ	,,	۱/۸/-	احساس کمتری	(شیر محمد اختر)
انسان کی زندگی	(انڈریف)	۱/۸/-	عربوں کی قومی تحریک	(مسعود علی ندوی)
سحر ہونے تک	(ناصر شمسی)	۳/-/-	معیشت زر	(ابن الحسن)
منظومات			گاندھی ازم - نیشنلزم - شوشلزم ایم - این - رائے رائے کے مضامین	,,
آیات و نغمات	(جوش ملیح آبادی)	۵/-/-	سوویت روس کے مزدور	گوپال متل
حرف و حکایت	,,	۴/-/-	سائنس اور دنیا	(ایچ - جی - ویلز)
نقش و نگار	,,	۳/-۸/-	**ادبیات و تنقیدات**	
فکر و نشاط	,,	۲/۸/-		
جنون و حکمت	,,	۴/-/-	ادب کثیف	(حاجی لق لق)
سیف و سبو	,,	۵/-/-	ہندی کے مسلمان شعراء	(عبداللہ بٹ)
لمعات رنگین	(زبیدہ سلطانہ)	۲/-/-	اقبال اور اسکا پیغام	(رفیق خاور)
ماوراء	(ن - م - راشد)	۲/۸/-	اردو ڈرامہ	(عبدالسلام خورشید)
نقش فریادی	(فیض احمد فیض)	۲/-/-	غدار	(ممتاز مفتی)
آہنگ	(اسرارالحق مجاز)	۲/-/-	**انتخابات**	
نغمۂ حرم	(اختر شیرانی)	۲/-/-		
آہنگ بزم	(وقار انبالوی)	-/۱۲/-	نئے زاویے جلد اول	(کرشن چندر)
جلوہ گاہ	(مخمور جالندھری)	۲/-/-	نئے زاویے جلد دوم	,,
ہیولے	(فکر تونسوی)		۱۹۴۷ء کا بہترین ادب	(ادارۂ ادب لطیف)
ھیالی	(قتیل شفائی)	۱/۸/-	۱۹۴۸ء کا بہترین ادب	,,
خوناب	(اختر انصاری)	۱/۸/-	۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں	(حلقۂ ارباب ذوق)
میراجی کے گیت	(میراجی)	-/۱۲/-	۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں	(ادارہ)
فروزاں	(معین احسن جذبی)	۱/۸/-	۱۹۴۳ء کی بہترین نظمیں	(حلقۂ ارباب ذوق)
زہر خند	(یوسف ظفر)	۲/-/-	۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں	(ادارہ)
وسعتیں	(سلام مچھلی شہری)	۱/۸/-	۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں	,,